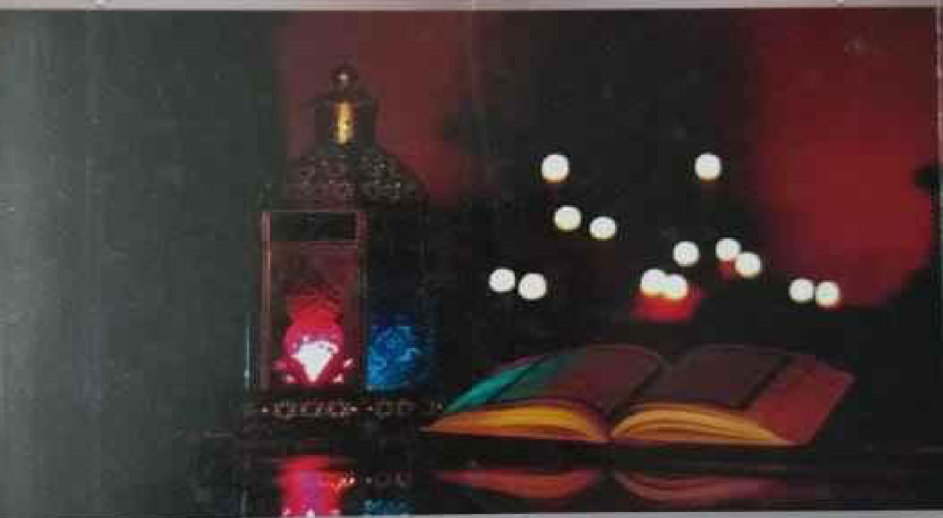


انوار التوضیح لرکعات التراویح

مسنون رکعاتِ تراویح

اور

شبہات کا ازالہ



تالیف

ابو الفوزان کفایت اللہ السنابلی

مکتبہ الفہیم

مئوناتھ بھنجن یوپی

نام کتاب	—	انوار التوضیح لرکعات التراویح (مسنون رکعاتِ تراویح)
مصنف	—	ابو الفوزان کفایت اللہ السنابلی
طابع وناشر	—	مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی
سال اشاعت	—	جنوری ۲۰۱۹ء
تعداد اشاعت	—	گیارہ سو
صفحات	—	400

مکتبہ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

MAKTABA AL-FAHEEM
Raihan Market, 1st Floor, Dhobia Imli Road
Sadar Chowk, Maunath Bhanjan - (U.P.) 275101
Email :faheembooks@gmail.com
WWW.faheembooks.com
Whatsapp No: 9889123129

فہرست

باب 2 رکعاتِ تراویح اور آثارِ صحابہ

3 باب آٹھ رکعاتِ تراویح اور اہلِ علم کا موقف

حصہ دوم: مخالفین کے دلائل کا جائزہ

باب 1 کیا بیس رکعات تراویح قرآن سے ثابت ہے؟

باب 2 بیس رکعات سے متعلق مرفوع روایات کا جائزہ

3 باب بیس رکعات سے متعلق بعض آثارِ صحابہ کا جائزہ

باب 4 بیس رکعات تراویح اور غیر متعلق بحثیں

استدراک



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَىِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾[الحجرات(١/٤٩)]

اے ایمان والے لوگو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ:

" كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا أَمَرَهُمْ، أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ، قَالُوا: إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَيَغْضَبُ حَتَّى يُعْرَفَ الغَضَبُ فِي وَجْهِهِ، ثُمَّ يَقُولُ: إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللَّهِ أَنَا"[صحیح بخاری، رقم(٢٠)]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی کام کا حکم دیتے تو وہ ایسا ہی کام ہوتا جس کے کرنے کی لوگوں میں طاقت ہوتی (اس پر) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ تو آپ جیسے نہیں ہیں (آپ تو معصوم ہیں) اور آپ کی اللہ پاک نے اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف فرما دی ہیں۔ (اس لیے ہمیں اپنے سے کچھ زیادہ عبادت کرنے کا حکم فرمایئے) (یہ سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے حتیٰ کہ خفگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہونے لگی۔ پھر فرمایا کہ بیشک میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اسے جانتا ہوں۔ (پس تم مجھ سے بڑھ کر عبادت نہیں کر سکتے)۔

اللہ کے نبی ﷺ اپنے خطبہ میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے :

''وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ''

''سب سے بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے'' [صحیح مسلم ،رقم(٨٦٧)]

ان نصوص سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ کا طریقہ ہی سب سے بہتر طریقہ ہے اور نبی ﷺ کی امتیوں کے لئے بھی بھلائی اسی میں ہے کہ نبی ﷺ کے اسوہ کو اپنائیں اور تقوی اور عبادت کے جوش میں نبی ﷺ سے آگے نہ بڑھیں ،قیام رمضان میں رکعات کی تعداد میں بھی یہی اصول پیش نظر ہونا چاہیے۔

زیر نظر کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قیام رمضان میں گیارہ رکعات سے زائد پڑھنا اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے ،اس لئے افضل و بہتر یہی ہے کہ نبی ﷺ کی اتباع میں اسی تعداد کو اپنایا جائے ۔

اس موضوع پر بہت ساری کتب لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب الگ امتیازات اور خصوصیات کی مالک ہے جیسا کہ مؤلف نے (١٧ تا ١٩) پر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی کتاب کے مؤلف اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے تمام حضرات کو جزائے خیر دے اور اس کتاب کو ان کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے آمین۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ مؤلف

زیرِ نظر کتاب میں رکعاتِ تراویح کی مسنون تعداد کو ثابت کیا گیا ہے۔ مسنون تعداد کا مطلب وہ تعداد ہے جو اللہ کے نبی ﷺ سے بہ سندِ صحیح ثابت ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ رکعاتِ تراویح کی مسنون تعداد اور رکعاتِ تراویح کی اختیاری تعداد میں فرق ہے۔ مسنون تعداد کا مطلب یہ ہے کہ جو تعداد اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہے، جب کہ اختیاری تعداد کا مطلب ہے کہ وہ تعداد جو بعض امتیوں نے یہ سمجھتے ہوئے اپنے لیے منتخب کی ہے کہ یہ ایک نفل نماز ہے، اس لیے جتنی رکعات چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔

اس فرق کی روشنی میں یاد رکھیں کہ مسنون رکعاتِ تراویح گیارہ رکعات بشمول وتر، یعنی آٹھ رکعات مع وتر ہے اور جو اہلِ علم اختیاری تعداد کے قائل ہیں ان کے یہاں اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ نفل نماز ہے، لہٰذا اپنی استطاعت کے مطابق جو جتنی تعداد چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ چنانچہ بعض نے مسنون تعداد ہی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے ۱۹، ۲۰، ۲۴، ۲۸، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۷ میں سے کسی تعداد کو اختیار کر لیا۔[1]

---

[1] دیکھیں: فتح الباري (۲۵۳/٤)، عمدة القاري (۱۲۷/۱۱)

بعض لوگ مغالطہ دیتے ہوئے عوام سے یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ آٹھ سے زائد رکعات کے قائل ہیں وہ سب ۲۰ کے قائل ہیں، حالانکہ یہ بات غلط ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مسنون تعداد سے زائد کے قائل ہیں ان کے مختلف اقوال ہیں، کیوں کہ وہ کسی متعین تعداد کو لازم سمجھتے ہی نہیں۔

یاد رہے کہ چودہ سو سالہ اسلامی دور میں ہمارے علم کی حد تک کسی بھی ثقہ اور مستند عالم نے اس بات سے اختلاف نہیں کیا کہ مسنون رکعاتِ تراویح کی تعداد آٹھ مع وتر ہی ہے۔ جن لوگوں نے آٹھ سے زائد کی بات کہی ہے، انھوں نے اس اضافے کو جائز تو کہا ہے مگر اسے مسنون یعنی سنتِ رسول ﷺ بالکل نہیں کہا۔

اس سلسلے میں ہم راجح اسی بات کو سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ سے جو تعداد ثابت ہے، یعنی جو مسنون تعداد ہے، اسی کو اختیار کیا جائے اور یہ آٹھ رکعات مع وتر، یعنی بشمول وتر کل گیارہ رکعات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی اسی تعداد پر تھا، جیسا کہ اس کتاب میں اسی بات کو صحیح روایات کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. موضوع سے متعلق تمام مرفوع وموقوف روایات کی جملہ اسانید پر بحث ہے، اس سے قبل اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں مخالفین کی طرف سے جو بعض بے سند روایات پیش کی جاتی تھیں، ان کے جواب میں ہماری طرف سے صرف سند کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب بعض نئی کتابوں کی طباعت کے بعد فریقِ مخالف کی طرف سے پیش کردہ ایسی روایات کی سندیں بھی منظرِ عام پر آگئی ہیں، لہٰذا زیرِ نظر کتاب میں ان کی حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے۔

2. صحیح بخاری وغیرہ میں مروی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر احناف نے

اضطراب کا جو اعتراض کیا ہے اس کا مفصل جواب پہلی بار اس کتاب میں قارئین پڑھیں گے۔

3 رات کی نماز میں گیارہ رکعات سے زائد پڑھنا اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اس سلسلے کی جملہ روایات پر سیر حاصل بحث شاید اس کتاب کے علاوہ کسی اور مقام پر قارئین کو نہ ملے۔

4 عہدِ فاروقی سے متعلق موطا کی روایت پر شذوذ وغیرہ کے جو اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں، ان کے مفصل جوابات بفضلہٖ تعالیٰ اس کتاب میں قارئین پہلی بار ملاحظہ فرمائیں گے۔

5 کسی بھی روایت پر صحت وضعف کا حکم لگانے کے لیے محض اس کی ظاہری سند دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا گیا، بلکہ ہر روایت پر حکم لگانے سے پہلے اس کے تمام طرق واسانید نیز جملہ متابعات وشواہد کو پیشِ نظر رکھنے کی حتی المقدر کوشش کی گئی ہے۔

6 اسانید کی تحقیق اور روایات پر حکم لگانے میں محدثین کے منہج پر چلتے ہوئے وہی طریقہ اپنایا گیا ہے جس کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب ”أنوار البدر في وضع اليدين على الصدر“ (ص: ٤٣۔٦١) میں کی ہے۔

7 تابعی کا قول وعمل کسی کے یہاں بھی حجت و دلیل کی حیثیت نہیں رکھتا، لہٰذا تابعین سے متعلق جملہ روایات پر بحث نہیں کی گئی، تاہم یہ ضرور واضح کیا گیا ہے کہ تابعین میں ایک جماعت نے نمازِ تراویح میں مسنون تعداد، یعنی گیارہ رکعات ہی کو اپنایا ہے اور یہی راجح ہے، جب کہ بعض تابعین نے نفل سمجھ کر کچھ اضافی رکعات بھی پڑھی ہیں، لیکن کسی معین ومخصوص تعداد پر ان کے یہاں کوئی اتفاق نہیں پایا جاتا، بلکہ بعض نے تیس رکعات پڑھی ہیں تو بعض نے چالیس

رکعات پڑھی ہیں، جب کہ بعض نے سینتالیس رکعات بھی پڑھی ہیں۔

8 ایک بریلوی عالم احمد یار خان نعیمی کی ''جاء الحق'' نامی کتاب میں بیس رکعات کو سنت ثابت کرنے کے لیے بعض عجیب وغریب اور مضحکہ خیز استدلالات پیش کیے گئے تھے، اس کتاب میں ان کے تسلی بخش جوابات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

9 حرمین میں بیس رکعات کی نوعیت اور اس کے پسِ منظر پر بھی مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

10 علمائے احناف میں بہت سارے حضرات نے اعتراف کیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے آٹھ رکعات تراویح ہی پڑھی ہیں، اس سلسلے میں ایک کثیر تعداد کے حوالے اصل کتابوں سے پیش کیے گئے ہیں۔

آخر میں گذارش ہے کہ اگر قارئین کسی بھی غلطی پر آگاہ ہوں تو ہمیں ضرور مطلع کریں ہم ان شاء اللہ اس کی اصلاح کریں گے۔

ابو الفوزان کفایت اللہ سنابلی

۳۰ رجب ۱۴۳۹ھ بمطابق ۱۷ اپریل ۲۰۱۸م



حصہ اول

مسنون رکعاتِ تراویح کے دلائل

1 باب

آٹھ رکعاتِ تراویح اور مرفوع احادیث

پہلی حدیث

امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ سَأَلَ عَائِشَةَ رضي الله عنها: كَيْفَ كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي رَمَضَانَ؟ فَقَالَتْ: مَا كَانَ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثًا" [1]

"ابوسلمہ بن عبدالرحمان کہتے ہیں کہ انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟ تو انھوں نے بتلایا کہ رمضان ہو یا کوئی اور مہینا، آپ گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی چار رکعات پڑھتے، تم ان کی حسن وخوبی اور طول کا

[1] صحيح البخاري (۴۵/۳) كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، رقم الحديث (۲۰۱۳)

حال نہ پوچھو۔ پھر چار رکعات پڑھتے، ان کی بھی حسن وخوبی اور طول کا حال نہ پوچھو، آخر میں تین رکعات (وتر) پڑھتے تھے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تراویح کی مسنون رکعات آٹھ ہیں۔

حدیثِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اعتراضات کے جوابات:

حدیثِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر احناف کی طرف سے اب تک جتنے بھی اعتراضات وارد کیے گئے ہیں، ان سب کو مولانا طاہر گیاوی صاحب نے اپنی کتاب "أحسن التنقیح" میں ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ ہم بنیادی طور پر اسی کتاب کو سامنے رکھ کر جواب حاضر کرتے ہیں، تاہم دیگر معترضین کی باتوں کو بھی ہم ساتھ لے کر چلیں گے۔

کمیت اور کیفیت کا فلسفہ:

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جناب گیاوی صاحب نے اس حدیث پر اعتراضات کی شروعات ہی ایک لطیفے سے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"سوال کرنے والے نے خود ہی "کیف کانت صلاة رسول اللہ؟" کہا ہے، یعنی حضور کی نماز کی کیفیت کیا تھی؟ "کم کانت صلاة رسول اللہ؟" نہیں کہا ہے، جس سے کمیت سے متعلق سوال سمجھا جا سکے۔ مقدار اور کمیت کے بارے میں سوال کرنا ہوتا ہے تو عربی زبان میں اس کے لیے "کم" کا لفظ موجود و معروف ہے۔ لفظ "کیف" تو صرف کیفیت و حالت ہی دریافت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے ...الخ۔"[1]

مولانا گیاوی صاحب نے یہ فلسفہ سنجی کر کے نہ صرف یہ کہ حدیث و فقہ سے

[1] أحسن التنقیح (ص: ٢٤٣)

متعلق اپنی وسعتِ معلومات اور تبحر کا تعارف کرا دیا ہے، بلکہ عربی زبان ولغت سے بھی اپنی واقفیت کی نمایش کر دی ہے۔

أولاً: موصوف کی یہ ساری عمارت اس بنیاد پر کھڑی ہے کہ حدیثِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں سائل نے ”کیف“ سے سوال کیا ہے نہ کہ ”کم“ سے!

اس پوری عمارت کو مسمار کرنے کے لیے صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دینا ہی کافی ہے کہ اسی حدیث کے بعض طرق میں یہی سوال ”کم“ کے ساتھ بھی موجود ہے، چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

”أخبرنا عمرو بن علي، قال: حدثنا عبد الرحمن، قال: حدثنا مالك، عن سعيد، عن أبي سلمة، قال: سألت عائشة: كم صلاة رسول الله ﷺ؟ قالت: ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان، ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة، يصلي أربعا، فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي أربعا، فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي ثلاثا“[1]

ثانیاً: اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ حدیث میں صرف ”کیف“ ہی سے سوال وارد ہوا ہے تو مولانا گیاوی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ”کیف“ یہ ”کم“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ امام ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی (المتوفی: ۴۷۴ھ) اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ”وقد تأتي كيف بمعنى كم“[2]

”یعنی ”کیف“ یہ ”کم“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔“

---

[1] السنن الكبرى للنسائي (٢٤٠/١) رقم الحديث (٤١١)

[2] المنتقى شرح الموطأ (١٢٥/١)

بلکہ اسی حدیث کے بعض طرق میں ''کیف'' کی جگہ ''کم'' کا آ جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس حدیث میں ''کیف'' یہ ''کم'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اصل سوال رکعات ہی سے متعلق تھا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اضافی طور پر مزید چیزیں بھی بتلا دیں۔

ثالثاً: اگر فرض کر لیں کہ صرف ''کیف'' ہی سے سوال ہوا تھا، یعنی صرف کیفیت کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو غور طلب بات یہ ہے کہ کیا کیفیت میں تعداد شامل نہیں ہے اور کیا تعداد کیفیت کا حصہ نہیں ہے؟

علامہ محمود خطاب السبکی اس حدیث کی تشریح میں ''کیف'' کے بارے میں فرماتے ہیں: ''ومن لوازمه بيان العدد''[1]

''کیفیت کے لوازم میں سے ہے کہ تعداد بیان کی جائے۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ محمود خطاب السبکی کی پوری عبارت نقل کر دی جائے۔ فرماتے ہیں:

''أي: كيف كانت صفة صلاة رسول الله ﷺ في ليالي رمضان، وكم كان عددها؟ بدليل إجابتها بالعدد، ثم بيان الصفة، ويحتمل أن السؤال عن الصفة فقط كما هو ظاهر لفظ كيف فأجابت ببيانها، ومن لوازمه بيان العدد، ويحتمل أن السؤال عن العدد فقط فتكون كيف بمعنى كم فأجابت ببيانه ثم أتبعته ببيان الصفة''[2]

---

[1] شرح سنن أبي داود (٢٦٩/٧)

[2] شرح سنن أبي داود (٢٦٩/٧)

"یعنی رمضان کی راتوں میں رسول اکرم ﷺ کی نماز کیسی تھی اور کتنی رکعات والی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہلے تعداد ہی کو بیان کیا۔ پھر صفت کو بیان کیا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ سوال صرف صفت کے بارے میں ہوا ہو، جیسا کہ لفظ "کیف" سے ظاہر ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی کا جواب دیا، اور اس کے لوازم میں سے ہے کہ تعداد کو بھی بیان کیا جائے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ سوال صرف تعدادِ رکعات ہی کے بارے میں ہوا ہو تو ایسی صورت میں "کیف" یہ "کم" کے معنی میں ہو گا، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں تعداد بیان کی اور ساتھ ہی صفت بھی بیان کر دی۔"

ہم کہتے ہیں کہ یہ آخری احتمال ہی راجح ہے، کیوں کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسی حدیث کے ایک طریق میں "کیف" کی جگہ "کم" کا لفظ آ گیا ہے اور حدیث کی سب سے بہترین تشریح حدیث ہی سے ہوسکتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے تعداد ہی بیان کی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اصل سوال تعداد ہی کی بارے میں ہوا تھا، باقی کیفیت کا بیان اضافی فائدہ ہے۔

رابعاً: "کیف" اور "کم" کی بحث جانے دیں اور گیاوی صاحب پورے سوال ہی سے آنکھیں بند کر لیں، صرف جواب پر غور کریں کہ اس میں کیا ذکر ہوا ہے؟ جواب میں پوری صراحت کے ساتھ، رمضان و غیر رمضان اور گیارہ کی تعداد موجود ہے، پھر اب "کیف" اور "کم" کی فلسفہ سنجی کی ضرورت ہی کیا ہے؟

حیرت کی بات ہے کہ گیاوی صاحب نے شروع میں تو سارا زور اس بات پر لگا دیا کہ "کیف" کا مطلب کیا ہے، لیکن آگے چل کر خود ہی تحریر فرماتے ہیں:

”اشتباہ یہ ہوا کہ رمضان میں چونکہ آپ ﷺ کا انہاک عبادت میں بڑھ جاتا تھا، اس لیے کہیں ایسا تو نہیں کہ تہجد کی عام دنوں والی رکعت کی تعداد میں آپ رمضان کے اندر اضافہ فرما دیا کرتے تھے۔ یہی بنائے سوال ہے۔“[1]

ملاحظہ فرمائیں! جس قلعے کی تعمیر میں موصوف نا جانے کہاں کی اینٹ اور کہاں کا روڑا چن کر لائے تھے، یہاں پہنچ کر خود ہی اسے زمین بوس کر دیا اور یہ منادی کر دی کہ تعدادِ رکعات ہی کی معلومات لینا بنائے سوال تھا۔ اور ”کیف“ اصل میں ”کم“ ہی کا مطلب لیے ہوئے ہے۔ اب ہمیں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے!!

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو بنیادی اور تفصیلی اعتراضات کیے ہیں، انھیں پانچ قسموں میں بانٹا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

1. حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں سوال و جواب کا تعلق تراویح سے ہونا چاہیے۔
2. یا تراویح اور تہجد دونوں کا ایک ہی نماز ہونا طے ہونا چاہیے۔
3. اس کے خلاف آپ ﷺ کے عمل کا ثبوت نہیں ملنا چاہیے۔
4. گیارہ رکعتوں میں حصر ثابت ہونا چاہیے، یعنی اس سے زیادہ یا کم پڑھنا ثابت نہ ہو۔
5. حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں کوئی فنی عیب نہ ہو، یعنی متناً اضطراب کی وجہ سے یہ ضعیف نہ ہو۔[2]

عرض ہے: پہلا اور دوسرا اعتراض ایک ہے اور وہ ہے تراویح اور تہجد الگ

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٤٧)

[2] ماحصل از أحسن التنقيح (ص: ٢٤١، ٢٤٢)

الگ ہونا۔ تیسرا اور چوتھا اعتراض بھی ایک ہی ہے اور وہ ہے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں مذکور حصر کا غیر ثابت ہونا۔ اس کے بعد پانچواں اعتراض اس کے متن کے ثبوت پر یعنی اضطراب کا اعتراض ہے۔ اس طرح یہ کل پانچ نہیں، بلکہ تین ہی اعتراضات ہیں۔

اسی طرح ایک اور حنفی عالم حافظ ظہور احمد صاحب نے اس حدیث پر کل دس اعتراضات کیے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

1. بیانِ کیفیت میں روایات کا باہمی تعارض۔
2. تراویح اور تہجد میں تفریق۔
3. محدثین کے ابواب بابت حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا۔
4. فقہاء کی نظر میں اسے تہجد سے متعلق بتلانا۔
5. تہجد سے متعلق ثابت کرنے کی ایک اور کوشش۔
6. تعداد میں اختلاف سے متعلق روایات۔
7. اضطراب کا اعتراض۔
8. تعداد میں تطبیق کے بعد گیارہ سے زائد کا دعویٰ۔
9. صحابہ کی طرف منسوب عمل سے معارضہ۔
10. مختلف کیفیات کے حوالے سے الزام کہ اہلِ حدیث کا اس پر عمل نہیں۔[1]

ان دس اعتراضات پر غور کریں تو یہ بھی اصلاً صرف تین اعتراضات ہی بنتے ہیں۔ پہلے، ساتویں اور دسویں اعتراض کا تعلق اضطراب سے ہے۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں اعتراض کا تعلق تہجد اور تراویح میں فرق سے ہے۔ چھٹے اور آٹھویں اعتراض کا تعلق عدمِ حصر سے ہے۔ نواں اعتراض بالکل ہی غیر متعلق ہے، کیوں کہ

[1] ماحصل از رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۱۸۷۔۲۰۸)

اس کا حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کوئی تعلق ہی نہیں اور اس کی بنیاد بھی غلط ہے، کیوں کہ صحابہ سے اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں۔ اس پر الگ سے بحث آگے آ رہی ہے۔

الغرض یہ کل دس اعتراضات بھی بنیادی طور پر تین اعتراضات ہی بنتے ہیں، لہٰذا ہم ان سارے اعتراضات کو تین قسموں میں سمیٹ دیتے ہیں:

اول: حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں اضطراب کا دعویٰ۔

دوم: حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں عدمِ حصر کا دعویٰ۔

سوم: تہجد اور تراویح میں فرق کا فلسفہ۔

حقیقت یہ ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق کوئی بھی اعتراض دیکھیں تو وہ ان تین قسموں میں سے ہی کسی سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے ہم ان تینوں اعتراضات کے مفصل جوابات پیش کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض، اضطراب کا دعویٰ:

یعنی یہ حدیث مضطرب ہے اور مضطرب حدیث ضعیف احادیث کی ایک قسم ہے جو ناقابلِ قبول ہے۔ اس اعتراض کا تفصیلی جواب دینے سے قبل یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری کی حدیث ہے اور صحیح بخاری کی احادیث کی صحت پر اجماع ہے۔

❁ امام ابو اسحاق الاسفرائینی (المتوفی: ۴۱۸ھ) اپنی کتاب "أصول الفقه" میں فرماتے ہیں:

"أهل الصنعة مجمعون على أن الأخبار التي اشتمل عليها الصحيحان، مقطوع بصحة أصولها ومتونها، ولا يحصل الخلاف فيها بحال، وإن حصل فذاك اختلاف في

طرقها و رواتها"[1]

"اہلِ فن کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحیحین میں جو احادیث موجود ہیں، وہ اصول و متون سمیت قطعیت کے ساتھ اللہ کے رسول (ﷺ) سے ثابت ہیں۔ اگر ان میں موجود بعض روایات میں اختلاف ہے تو یہ محض ان احادیث کے طرق اور راویوں کے بارے میں اختلاف ہے۔"

❀ علامہ محمد بن طاہر ابن القیسرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"أجمع المسلمون على قبول ما أخرج في الصحيحين لأبي عبد الله البخاري، ولأبي الحسين مسلم بن الحجاج النيسابوري"[2]

"صحیحین میں امام بخاری و مسلم نے جو احادیث روایت کی ہیں، ان کی قبولیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔"

❀ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ (المتوفی: ۶۴۳ھ) لکھتے ہیں:

"جميع ما حكم مسلم بصحته من هذا الكتاب فهو مقطوع بصحته، والعلم النظري حاصل بصحته في نفس الأمر، وهكذا ما حكم البخاري بصحته في كتابه، و ذلك لأن الأمة تلقت ذلك بالقبول سوى من لا يعتد بخلافه و وفاقه في الإجماع"[3]

---

[1] أصول الفقه للإسفرائيني كما في النكت على مقدمة ابن الصلاح للزركشي (١/٢٨٠) وانظر: فتح المغيث بشرح ألفية الحديث للسخاوي (١/٧٢)

[2] صفوة التصوف لابن القيسراني (ورقة: ٨٧،٨٨) نقلًا عن أحاديث الصحيحين بين الظن واليقين للشيخ الزاهدي.

[3] صيانة صحيح مسلم (ص: ٨٥)

''وہ تمام احادیث کہ جن کو امام مسلم نے اپنی کتاب میں صحیح کہا ہے، ان کی صحت قطعی ہے اور ان سے حقیقت میں علم نظری حاصل ہوتا ہے، اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کا بھی ہے جن کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں صحیح کہا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام امت کے نزدیک ان کتابوں کو ''تلقي بالقبول'' حاصل ہے، سوائے ان افراد کے کہ جن کے اختلاف یا اتفاق سے اس اجماع کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

- امام نووی رحمہ اللہ (المتوفی: ٦٧٦ھ) فرماتے ہیں:

''اتفق العلماء على أن أصح الكتب بعد القرآن العزيز: الصحيحان، البخاري و مسلم، وتلقتهما الأمة بالقبول'' [1]

''علما کا اتفاق ہے کہ قرآن عزیز کے بعد سب سے صحیح کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہے، امت کی طرف سے اسے تلقی بالقبول حاصل ہے۔''

- امام ابن کثیر رحمہ اللہ (المتوفی: ٧٧٤ھ) فرماتے ہیں:

''أجمع العلماء على قبوله وصحة ما فيه، وكذلك سائر أهل الإسلام'' [2]

''صحیح بخاری کی مقبولیت اور اس کی احادیث کی صحت پر علما اور تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔''

- علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ (المتوفی: ٨٠٨ھ) فرماتے ہیں:

''وجاء محمد بن إسماعيل البخاري إمام المحدثين

---

[1] شرح النووي على مسلم (١٤/١)

[2] البداية والنهاية، ط إحياء التراث (٣٠/١١)

في عصره فخرّج أحاديث السّنّة على أبوابها في مسنده الصّحيح بجميع الطرق التي للحجازيين والعراقيّين والشاميّين، واعتمد منها ما أجمعوا عليه دون ما اختلفوا فيه"[1]

"اس کے بعد امام المحدثین محمد بن اسماعیل البخاری اپنے زمانے میں سامنے آئے، انھوں نے اپنی صحیح مسند میں احادیث کو ابواب کی ترتیب پر بیان کیا اور اپنی کتاب میں حجازیوں، عراقیوں اور شامیوں کے ان طرق سے احادیث کو نقل کیا کہ جن پر ان کا اجماع تھا، اور جن طرق میں اختلاف تھا، ان کو نہ لیا۔"

❁ ملا علی القاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

"ثم اتفقت العلماء على تلقي الصحيحين بالقبول، وأنهما أصح الكتب المؤلفة"[2]

"پھر علما کا صحیحین کو قبول کرنے پر اتفاق ہے اور اس بات پر کہ تمام کتابوں میں یہ صحیح ترین کتابیں ہیں۔"

❁ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں:

"أما الصحيحان فقد اتّفق الْمُحدثُون عَلَى أَن جَمِيع مَا فِيهمَا من الْمُتَّصِل الْمَرْفُوع صَحِيح بِالْقطعِ، وأنهما متواتران إِلَى مصنفيهما، وَأَنه كل من يهون أَمرهمَا فَهُوَ

---

[1] تاريخ ابن خلدون (۵۵۹/۱)

[2] مرقاة المفاتيح للملا القاري (۱۸/۱)

مُبْتَدِع مُتبع غير سَبِيل الْمُؤمِنِينَ"[1]

"صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنّفین تک بالتواتر پہنچتی ہیں، جو ان کی عظمت نہ کرے وہ بدعتی ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔"

عصرِ حاضر کے احناف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ مولانا سرفراز صفدر دیوبندی صاحب لکھتے ہیں:

"اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ بخاری اور مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔"[2]

❁ مولوی غلام رسول رضوی بریلوی لکھتے ہیں:

"تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری تمام کتب سے اصح کتاب ہے۔"[3]

صحیحین کی تمام احادیث صحیح ہیں اور اس پر ائمہ محدثین، عام اہلِ علم حتی کہ خود احناف کے بھی بے شمار اقوال موجود ہیں، لیکن گزشتہ صفحات میں صرف وہ اقوال پیش کیے گئے ہیں جن میں صحیحین کی تمام احادیث کو نہ صرف صحیح کہا گیا ہے، بلکہ اس صحت پر امت کا اجماع نقل کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ رکعاتِ تراویح کی بات آتی ہے تو احناف اس روشن حقیقت اور اس کے اعتراف کو پسِ پشت ڈال کر بغیر کسی خوف و جھجک

---

[1] حجة الله البالغة (۲۳۲/۱)، حجۃ اللہ البالغہ مترجم اردو (ص: ۲۵۰)

[2] احسن الکلام (۱/ ۱۸۷)

[3] تفہیم البخاری (۱/ ۵)

کے یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا مضطرب یعنی ضعیف ہے!!

کیا صحیحین کی صحت صرف اسناد کے لحاظ سے ہے؟

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ صحیح بخاری کی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مطلق ضعیف کہنے سے بات نہیں بننے والی، کیوں کہ اس کے خلاف کوئی صحت پر اجماع کا حوالہ دے سکتا ہے، اس لیے موصوف نے لکھا:

''اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کی سند بالکل صحیح ہے اور بخاری و مسلم میں ہونا ہی اس کی سند کی صحت کے لیے بہت بڑی ضمانت ہے، لہٰذا بہ لحاظِ سند یہ روایت بے غبار ہے، لیکن جہاں تک متن اور مضمونِ حدیث کی حیثیت کا تعلق ہے تو اس کی صحت میں محدثین کو سخت کلام ہے۔''[1]

صحت میں محدثین کو سخت کلام ہے، یہ بات تو بالکل غلط ہے، کسی ایک بھی ثقہ محدث نے اس کی صحت پر کلام نہیں کیا جس کی تفصیل آ رہی ہے۔ یہاں موصوف نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ صحیحین میں کسی روایت کا ہونا صرف سنداً صحیح ہونے کی ضمانت ہے، متناً نہیں، حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

صحیحین کی صحت پر اجماع نقل کرنے والے سب سے قدیم جس محدث کا نام ملتا ہے وہ امام ابو اسحاق الاسفرائینی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۱۸ھ) ہیں، ان کے الفاظ پہلے نقل کیے جا چکے ہیں، اس میں انھوں نے پوری صراحت کے ساتھ ''مقطوع بصحة أصولها ومتونها'' کے الفاظ کہے ہیں، یعنی اصول و متون کے ساتھ صحیحین کی احادیث کی صحت قطعی ہے اور اس پر اہلِ فن کا اجماع ہے، بلکہ انھوں نے کچھ اختلاف کی بات کہی ہے تو اسے اسانید اور رواۃ سے متعلق بتلایا ہے اور نفسِ متن کو

[1] العدد الصحیح (ص: ۱۵) نیز دیکھیں: أحسن التنقیح لرکعات التراویح (ص: ۳۳۱)

بے غبار قرار دیا ہے، ان کے الفاظ ہیں:

”وإن حصل فذاك اختلاف في طرقها و رواتها“

”اگر ان میں موجود بعض روایات میں اختلاف ہے تو یہ محض ان احادیث کے طرق اور راویوں کے بارے میں اختلاف ہے۔“

جب کہ طاہر گیاوی صاحب اس کے بالکل برعکس ہی نقشہ کھینچ رہے ہیں۔ صرف اسی ایک حوالے سے طاہر گیاوی صاحب کی مذکورہ تفریق کی قلعی کھل جاتی ہے۔ موصوف کو بھی بخوبی احساس تھا کہ ان کی یہ بات قارئین کو ہضم ہونے والی نہیں ہے، اسی لیے جناب نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے آگے علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ سے یہ نقل کر رکھا ہے کہ سند کا صحیح ہونا متن کے صحیح ہونے کو مستلزم نہیں۔[1]

عرض ہے:

أولاً: علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے مذکورہ بات صحیحین کی کسی حدیث سے متعلق نہیں کہی اور اوپر بتایا جا چکا ہے کہ احادیثِ صحیحین کے متون کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے، اس اجماع کے خلاف علامہ مبارکپوری نے کہیں کوئی بات نہیں کہی۔

ثانیاً: حدیث کی صحت کی شرائط میں جہاں یہ بات ہے کہ سند بے داغ ہونی چاہیے، یعنی تمام روات ثقہ ہونے چاہئیں اور سند متصل ہونی چاہیے، وہیں یہ شرط بھی ہے کہ متن بھی محفوظ ہونا چاہیے۔ اگر متن میں شذوذ ہے تو سند بے عیب ہونے کے باوجود بھی حدیث صحیح نہیں ہو گی۔ اصولِ حدیث کی کتابوں میں یہ بات مسلّم ہے۔

چونکہ بعض متساہل یا محدثین کے عام منہج سے منحرف کچھ لوگ سند کی محض

---

[1] العدد الصحيح (ص: ١٦)

ظاہری حالت ہی دیکھ کر صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں، اس لیے خاص ایسے لوگوں کی تردید میں کہا جاتا ہے کہ صرف سند کے صحیح ہونے سے حدیث صحیح نہیں ہوتی، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معتبر اور مستند محدثین بھی جب کسی حدیث کو صحیح کہتے ہیں تو وہ محض سند کے لحاظ سے صحیح کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ فن اور مستند محدثین کسی حدیث کو محض سند کے لحاظ صحیح کہہ ہی نہیں سکتے، کیوں کہ ان کے یہاں کوئی حدیث درجۂ صحت کو تب تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک کہ اس کا متن بھی محفوظ ثابت نہ ہوجائے، اس لیے محدثین جب کسی حدیث پر صحت کا حکم لگاتے ہیں تو اس کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ اس کا متن محفوظ و ثابت اور قابلِ قبول ہے۔

امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ بلکہ تمام صحاح کے مصنّفین نے اپنی صحاح کی کتابوں پر جو صحت کا حکم لگایا ہے، اس کا یہی مفہوم ہے۔

صحت کا حکم متن پر ہی لگتا ہے:

یہ بات بھی واضح ہے کہ سند کی تحقیق و تفتیش کے پیچھے اصل مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے آنے والی بات یعنی متن کی بابت معلوم ہوسکے کہ وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اصولِ حدیث اور تحقیقِ رجال کی ساری کاوشوں کا ہدف بس اسی بات کا پتا لگانا ہوتا ہے، لہٰذا اہلِ فن جب کسی حدیث پر صحت کا حکم لگاتے ہیں تو سند کے ذریعے آنے والے متن کے بارے میں ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہے۔ حتی کہ تحقیق و تفتیش کے دوران میں کسی حدیث کی ایک سند ضعیف ثابت ہوتی ہے تو محدثین محض اس ایک سند کے ضعف کو دیکھ کر متن کو ضعیف نہیں کہتے، بلکہ اس متن کی دیگر اسانید بھی تلاش کرتے ہیں۔ اگر کسی اور مقام پر اس کی صحیح سندیں مل گئیں تو پھر متن پر ان کا حکم

صحت ہی کا ہوتا ہے، کیوں کہ یہی اصل مقصود ہے۔

بلکہ بسا اوقات ایک حدیث کی ساری سندیں ضعیف ہوتی ہیں، لیکن سندوں کی مجموعی کیفیت ایسی ہوتی ہے جو اشارہ کرتی ہے کہ اس ضعف سے نقل کردہ بات متاثر نہیں ہوسکتی۔ ایسی صورت میں بھی محدثین حدیث پر صحت ہی کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے لیے ”حسن لغیرہ“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

غرض کہ تحقیقِ حدیث کا اصل مقصد متن پر حکم لگانا ہی ہوتا ہے اور جب بھی کوئی مستند محدث کسی حدیث پر صحت کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ فیصلہ بنیادی طور پر متن سے متعلق ہی ہوتا ہے۔

بخاری ومسلم کی احادیث پر جو صحت کا فیصلہ کیا گیا ہے، یہ فیصلہ اصلاً متون ہی سے متعلق ہے، اسی لیے صحیحین کی کسی حدیث کی سند میں کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو اہلِ فن شواہد ومتابعات اور قرائن پر بحث کرتے ہوئے یہی جواب دیتے ہیں کہ اس عیب سے متن کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تلقی بالقبول کا مطلب:

مزید برآں اس بات پر غور کیا جائے کہ صحیحین کی احادیث کی صحت پر اجماع نقل کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تلقی بالقبول کا کیا مطلب ہے؟ کیا محض سند کے ساتھ تلقی بالقبول کی بات کا کوئی مطلب بنتا ہے؟ اگر سند کو متن سے الگ کردیا جائے تو بتلایا جائے کہ جب سند کے ساتھ کوئی بات ہے ہی نہیں، تو قبول کسے کیا جائے گا؟

ظاہر ہے تلقی بالقبول کا مطلب یہی ہے کہ صحیحین میں سندوں کے ساتھ جو

احادیث ہیں، ان احادیث کو امت نے بالاتفاق قبول کیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا متن کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور اس کی صحت پر اجماع ہے۔ اس کے بعد مزید کسی بحث کی ضرورت تو نہیں رہ جاتی، کیوں کہ عصرِ حاضر کے احناف کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ بالاجماع ثابت شدہ کسی بات کا انکار کریں۔ تاہم قارئین کے اطمینانِ قلب کے لیے اس سلسلے میں مخالفین کی پیش کردہ باتوں پر گفتگو کر کے ہم معاملے کو پوری طرح صاف کرنا چاہتے ہیں۔

دعوائے اضطراب میں احناف کے دلائل اور اس کا جائزہ:

عصرِ حاضر کے احناف کا دعویٰ ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا مضطرب ہے، اس دعوے پر ان حضرات کی طرف سے دو باتیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف) اضطراب کی پہلی دلیل، تعدادِ رکعات کے بیان میں اختلاف:

احناف کا کہنا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا حدیث کے علاوہ صحیحین اور دیگر کتبِ احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے الگ الگ تعداد میں رکعات کا ذکر ہے، جو اضطراب کی دلیل ہے۔

جواباً عرض ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں یہ بیان ہرگز نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک ہی عدد کا التزام کرتے تھے، بلکہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، اس لیے اگر کسی دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گیارہ سے کم تعداد بتلائیں تو وہ اس بیان کے مخالف قطعاً نہیں ہے۔

رہی بات یہ کہ بعض روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گیارہ سے زیادہ یعنی تیرہ رکعات بتلائی ہیں تو عرض ہے کہ جن احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تیرہ کی

تعداد بتلائی ہے، اس میں بھی اصل رکعات گیارہ ہی بیان کی ہیں اور دو کے ذریعے کبھی فجر کی اور کبھی عشا کی سنت کو بھی شامل کر کے بیان کر دیا ہے۔ بعض روایات میں تو یہ اضافہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے نہیں، بلکہ بعد کے کسی راوی کی طرف سے ہے اور بعض روایات ثابت ہی نہیں۔ اب ان روایات کی تفصیل ملاحظہ ہو:

فجر کی رکعات شامل کرنے سے متعلق روایت:

امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) نے کہا ہے:

"حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوسٰى، قَالَ: أَخْبَرَنَا حَنْظَلَةُ، عَنِ القَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها، قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، مِنْهَا الوِتْرُ، وَرَكْعَتَا الفَجْرِ"

''عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ وتر اور فجر کی دو سنت رکعتیں اسی میں ہوتیں۔''[1]

عشا کی سنت شامل کرنے سے متعلق روایت:

امام ابو داود رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا أحمد بن صالح، ومحمد بن سلمة المرادي، قالا: حدثنا ابن وهب، عن معاوية بن صالح، عن عبد اللّٰه بن أبي قيس، قال: قلت لعائشة رضي الله عنها: بكم كان رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم يوتر؟ قالت: كان يوتر بأربع وثلاث، وست وثلاث، وثمان وثلاث، وعشر وثلاث، ولم يكن يوتر بأنقص من سبع،

[1] صحيح البخاري (۵۱/۲) رقم الحديث (۱۱۴۰)

ولا بأكثر من ثلاث عشرة‘‘ [1]

’’عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں: میں نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: کبھی چار اور تین، کبھی چھے اور تین، کبھی آٹھ اور تین، اور کبھی دس اور تین۔ کبھی آپ وتر میں سات سے کم اور تیرہ سے زائد رکعتیں نہیں پڑھتے تھے۔‘‘

اس روایت میں پوری صلاۃ اللیل پر وتر کا اطلاق ہوا ہے اور دس اور تین وتر کی تعداد اس اعتبار سے بتلائی گئی ہے کہ اس میں عشا کے بعد کی دو سنت رکعات بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ یہ توجیہ ماننا اس لیے لازم ہے، کیوں کہ ایک طرف بخاری کی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور دوسری طرف ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب تیرہ کی تعداد بتلائی تو اس میں فجر کی سنت کو بھی شامل کر لیا، جیسا کہ گزرا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب گیارہ سے زائد رکعات بتلاتیں تو فرض نماز سے متصل سنت کو شامل کر کے بتلاتی تھیں۔

زیرِ نظر روایت میں بیان کردہ رکعات پر وتر کا اطلاق کیا گیا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ فجر کی سنت اس میں شامل نہیں ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ عشا کی سنت ہی اس میں شامل کی گئی ہے، کیوں کہ اس روایت کے کسی بھی طریق میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عشا کی سنت کو الگ سے بیان کرنے کے بعد تیرہ کی تعداد نہیں بتلائی ہے، لہٰذا یہ مجمل روایت بخاری کی روایت کے معارض ثابت نہیں ہوسکتی۔ معارضہ

---

[1] سنن أبي داود (٢/٤٦) رقم الحديث (١٣٦٢) وإسناده صحيح

ثابت کرنے کے لیے لازم ہوگا کہ کوئی ایسی روایت پیش کی جائے جس میں صراحت ہو کہ عشا اور فجر کی سنت کے علاوہ گیارہ سے زائد تعداد بتلائی گئی ہے۔

یاد رہے کہ تیرہ رکعات والی روایت میں دو رکعت سنت کو شامل ماننا، یہ توجیہ کوئی ہماری طرف سے نئی نہیں، بلکہ کئی ایک محدثین بھی یہ توجیہ پیش کر چکے ہیں۔ مولانا طاہر گیاوی صاحب بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تیرہ رکعت تک جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان میں محدثین کی طرف سے اس قسم کی تاویل وتوجیہ پیش کی گئی ہے کہ دو رکعت عشا کی سنت بھی اس میں شامل کر لی گئی ہے''[1]

بعض شبہات کا ازالہ:

❁ مولانا طاہر گیاوی صاحب لکھتے ہیں:

''مسلم مع نووی (۱/۲۵۴) اور دوسری کتابوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے علاوہ سنتِ فجر، جو تیرہ رکعات پڑھنا منقول ہے، اس کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"كان يصلي ثلاث عشرة ركعة، يصلي ثمان ركعات، ثم يوتر، ثم يصلي ركعتين وهو جالس، فإذا أراد أن يركع قام فركع، ثم يصلي ركعتين بين النداء والإقامة من صلاة الصبح''[2]

یعنی دو رکعتیں وتر کے بعد بیٹھ کر ادا فرمائی جاتی تھیں، لہٰذا عشا کی سنت کو

---

[1] العدد الصحيح (ص: ٢٣، ٢٤)

[2] العدد الصحيح (ص: ٢٦، ٢٧)

ان تیرہ رکعتوں میں شامل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وتر کے بعد بھی عشا کی سنت پڑھنا درست ہے ...الخ۔‘‘

عرض ہے کہ مولانا طاہر گیاوی صاحب نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ ان کی پیش کردہ حدیث میں سنتِ فجر کے علاوہ تیرہ رکعات کا بیان ہے، جب کہ ان کی پیش کردہ حدیث میں سنتِ فجر کے علاوہ صرف گیارہ رکعات ہی کا بیان ہے جنھیں کوئی بھی گن کر دیکھ لے، لہٰذا اس روایت میں سنتِ عشا کو شامل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یاد رہے کہ جس صحیح روایت میں وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعات پڑھنے کا ذکر ہے، اس میں ان دو رکعات سے قبل پڑھی جانے والی رکعات کی تعداد نو سے زائد نہیں ہے۔ دراصل اللہ کے نبی ﷺ نے جس وقت شروع میں کچھ رکعات کم پڑھیں تو اسی وقت وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعات ادا کیں جو شروع میں کم کی گئی نماز کی بدل تھیں۔

امام طحاوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۱) فرماتے ہیں:

”يحتمل أن يكون على صلاته بعد ما بدن، فيكون ذلك على إحدى عشرة، منها تسع فيها الوتر وركعتان بعدهما وهو جالس“[1]

”اس بات کا احتمال ہے کہ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھی جانے والی دو رکعات آپ نے جسیم ہونے کے بعد ادا کی ہوں، اس طرح کل تعداد گیارہ رکعات ہی ہوتی ہیں، جن میں سے نو وتر ہوں گی اور دو اس کے بعد بیٹھ کر پڑھی جانے والی نماز ہوں گی۔“

[1] شرح معاني الآثار، ت النجار (۱/۲۸۳)

یہ بھی ممکن ہے کہ جن روایات میں وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے ان میں اصل رات کی نماز نبی اکرم ﷺ نے گیارہ سے کم ہی پڑھی ہو اور پھر آخر میں بیٹھ کر جو دو رکعت پڑھی، یہ اصل صلاۃ الیل کا حصہ نہ ہو، بلکہ بطور اختتامیہ ادا کیا ہو، جیسے فرض کی اصل نماز کے بعد سنتِ موکدہ بطور اختتامیہ پڑھی جاتی ہے۔

بہرحال یہ کیفیت بتلانے والی روایات میں رکعات کی مجموعی تعداد گیارہ رکعات سے زائد نہیں بتلائی گئی، لہٰذا ان دو رکعات کو اصل صلاۃ اللیل کا حصہ مانیں یا بطور اختتامیہ الگ نماز مانیں، بہرصورت اس سے گیارہ سے زائد رکعات کا اثبات نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ جس روایت میں سنتِ عشا کی شمولیت کی بات کہی جاتی ہے، وہ ابتدائی دو رکعات کے لیے کہی جاتی ہے نہ کہ اختتامی رکعات کے لیے، مولانا طاہر گیاوی صاحب نے نامعلوم کیسے سمجھ لیا کہ اختتامی رکعات کو سنتِ عشا بتلایا جا رہا ہے۔

❀ مولانا طاہر گیاوی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت موجود ہے: كان إذا فاتته الصلاة من الليل من وجع، أو غيره، صلى من النهار ثنتي عشرة ركعة'' [1]

''آنحضرت ﷺ سے کسی تکلیف وغیرہ کی وجہ سے رات کی نماز رہ جاتی تھی تو آپ دن میں بارہ رکعت قضا کے طور پر پڑھا کرتے تھے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''اس سے اظہر من الشمس ہو گیا کہ رات کی بارہ رکعتوں میں ہر وقت سنتِ عشا یا سنتِ فجر شامل نہیں ہوتی تھی۔'' [2]

---

[1] صحيح مسلم (٢٥٦/١)

[2] العدد الصحيح (ص: ٢٧، ٢٨)

طاہر گیاوی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قضا صرف خالص رات والی نماز کی ہوتی تھی جس میں سنتِ عشا یا سنتِ فجر شامل نہیں ہے اور یہاں قضا میں بارہ رکعات کا ذکر ہے، جس سے پتا چلا کہ رات کی خالص نماز بھی گیارہ سے زائد یعنی بارہ رکعات ہے۔

جواباً عرض ہے:

یہ قضا اصل گیارہ رکعات ہی کی ہوتی تھی، لیکن چونکہ یہ قضا دن میں ہوتی تھی اور دن میں وتر نہیں ہے، اس لیے نبی اکرم ﷺ ان گیارہ رکعات میں ایک رکعت مزید شامل کر کے اسے جفت بنا لیتے تھے۔ یہ ایک رکعت دن کی وجہ سے اضافی ہوتی تھی۔ جس کا رات والی نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے، ورنہ طاہر گیاوی صاحب بتلائیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کیا وتر والی رکعت کی قضا نہیں کی؟ یعنی اگر رات والی نماز تیرہ رکعات تھی اور اسی کی قضا کی گئی تو تیرہ کی قضا بارہ سے کیسے ہوسکتی ہے؟

صاف بات ہے کہ رات کی نماز گیارہ رکعات ہی کی تھی اور اللہ کے نبی ﷺ نے مکمل گیارہ رکعات کی قضا کی ہے، لیکن دن کی وجہ سے مزید ایک زائد رکعت شامل کر کے اسے جفت بنا لیا ہے۔

نیز اس کی وضاحت صحیح مسلم کی اس مفصل حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ قضا والی بات کہنے سے قبل رات کی نماز کی تعداد بتلاتے ہوئے کہا:

"... فتلك إحدى عشرة ركعة ..."[1]

''تو (نبی ﷺ کی رات کی نماز میں) یہ کل گیارہ رکعات ہوتی تھیں۔''

یہ کہنے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جب رات میں نبی ﷺ کی

---

[1] صحیح مسلم (۲/ ۵۱۳، رقم الحدیث ۷۴٦)

نماز چھوٹ جاتی تھی، یعنی یہ گیارہ رکعات چھوٹ جاتی تھیں تو آپ ﷺ دن میں ان کی قضا کرتے تو بارہ رکعات پڑھتے۔ یعنی اصلاً گیارہ رکعات ہی کی قضا کرتے اور دن کی وجہ سے ایک زائد رکعت شامل کر کے اسے جفت بنا لیتے۔

بعض اہلِ علم سے یہ بھی منقول ہے کہ قضا والی بارہ رکعات میں رات کے حصے کی نماز آٹھ رکعات ہوتی تھیں اور باقی چار رکعات چاشت کی ہوتی تھیں۔

علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''قیل: ثمان منها صلاة الليل، وأربع صلاة الضحى''[1]

''یہ بھی کہا گیا ہے کہ قضا والی نماز آٹھ رکعات ہوتی تھیں اور چار رکعات چاشت کی ہوتی تھیں۔''

بہرحال طاہر گیاوی صاحب کا اس قضا والی حدیث سے یہ کہنا قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ رات کی نماز میں سنتِ عشا یا سنتِ فجر کے علاوہ بھی گیارہ سے زائد رکعات پڑھتے تھے۔

لطیفہ: قارئین! ایک طرف احناف کا معاملہ تو یہ ہے کہ تراویح سے متعلق حدیثِ عائشہ کی بعض روایات میں سنتِ عشا کی شمولیت نا قابلِ فہم ہے اور دوسری طرف خود کا حال یہ ہے کہ تراویح سے متعلق ایک ایسی حدیث سے استدلال کر ڈالا جو موضوع و من گھڑت تو تھی ہی، ساتھ ہی ان کے مدعا کے بھی خلاف تھی، کیوں کہ اس میں وتر سمیت کل ستائیس رکعات کا ذکر ہے۔[2]

اب یہاں تین وتر نکال دیں تو کل چوبیس رکعات ہوتی ہیں نہ کہ بیس، یعنی

---

[1] مرعاة المفاتيح (٢/٢٦٦)

[2] اسی کتاب کا صفحہ (۳۳۹) دیکھیں۔

چار رکعات مزید رہ جاتی ہیں! اب مسئلہ یہ تھا کہ ان چار کا کیا کریں؟ صورتِ حال ایسی ہے کہ یہاں سنتِ عشا کی بات بھی نہیں چل سکتی، کیوں کہ عشا کی سنت صرف دو رکعت ہے اور کل چار رکعات کی کھپت درکار ہے۔ اس نازک صورتِ حال میں حل یہ نکالا گیا کہ یہ چار رکعات عشا کی فرض رکعات تھیں، جنھیں راوی نے تراویح کی رکعات میں شامل کر کے بیان کر دیا ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے!

کہاں دوسروں کی مستدل روایت میں سنتِ عشا کی شمولیت بھی ناقابلِ ہضم تھی اور کہاں اپنی مستدل روایت میں عشا کی فرض رکعات بھی سما گئیں!!

نوٹ: رات کی نماز میں سنتِ عشا کی شمولیت سے متعلق حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے طاہر گیاوی صاحب کے جو اعتراضات تھے، ان کے جوابات یہاں درج کر دیے گئے ہیں، موصوف نے دیگر صحابہ کی روایات میں سنتِ عشا کی شمولیت پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان کے جوابات ان احادیث کے بیان کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔

حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں بعد کے راوی کی طرف سے سنتِ عشا کو شمار کرنے والی روایت:

امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا عبد الله بن يوسف، قال: أخبرنا مالك، عن هشام ابن عروة، عن أبيه، عن عائشة رضي الله عنها، قالت: كان رسول الله ﷺ يصلي بالليل ثلاث عشرة ركعة، ثم يصلي إذا سمع

النداء بالصبح ركعتين خفيفتين"[1]

''ہم سے عبداللہ بن یوسف تنیسی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں امام مالک رحمہ اللہ نے خبر دی، انھیں ہشام بن عروہ نے، انھیں ان کے والد (عروہ بن زبیر) نے اور انھیں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ پھر جب صبح کی اذان سنتے تو دو ہلکی رکعتیں (سنتِ فجر) پڑھ لیتے۔''

اس حدیث میں تیرہ رکعات کے بعد الگ سے فجر کی دو رکعاتِ سنت کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع کی تیرہ رکعات میں سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس روایت میں سنتِ عشا کا اضافہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہرگز نہیں، بلکہ اس حدیث کے راوی ہشام بن عروہ کی طرف سے ہے، کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ نے یہ حدیث نقل کی ہے اور عروہ کے تمام تلامذہ نے متفقہ طور یہی روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنتِ فجر کو بھی شامل کر کے تیرہ رکعات بیان کی ہیں، مثلاً:

- عروہ کے شاگرد امام زہری۔[2]
- عروہ کے شاگرد عراک بن مالک۔[3]
- عروہ کے شاگرد محمد بن جعفر بن الزبیر۔[4]

ان تمام شاگردوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ کی روایت کردہ حدیث

---

[1] صحيح البخاري (٢/٥٧، رقم الحديث ١١٧٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٣٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٥٩) وإسناده صحيح ، ابن اسحاق صرح بالسماع عند أحمد في مسنده (٦/٢٧٥)

میں یہی بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنتِ فجر کو شامل کر کے تیرہ رکعات کا ذکر کیا ہے، بلکہ ایک روایت میں خود ہشام نے ایسا ہی روایت کیا ہے جس کے الفاظ ہیں:

"يصلي من الليل ثلاث عشرة ركعة بركعتيه بعد الفجر قبل الصبح"[1]

"یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنتِ فجر کے ساتھ رات کی تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔"

اس تفصیل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ نے جو حدیث روایت کی ہے، اس میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنتِ فجر کو ملا کر تیرہ رکعات بیان کیا ہے، لیکن عروہ کے ایک شاگرد ہشام نے بعض دفعہ سنتِ فجر کو الگ سے بیان کر دیا اور سنتِ عشا کو شامل کر کے تیرہ رکعات الگ سے بیان کیا۔

اگر یہ توجیہ نہ مانی جائے تو پھر ہشام کی مذکورہ روایت ایک جماعت کے خلاف، بلکہ خود ان کی ہی دوسری روایت کے خلاف ہونے کے سبب مرجوح ہو گی اور یہی بات علامہ البانی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔[2]

لیکن ہماری نظر میں مناسب توجیہ یہی ہے کہ ہشام کے منفرد بیان کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ انھوں نے اس میں سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے بیان کیا ہے۔

بطور فائدہ عرض ہے کہ عہدِ فاروقی میں گیارہ رکعاتِ تراویح سے متعلق محمد بن یوسف کی روایت میں امام مالک سمیت چھے رواۃ نے گیارہ کی تعداد بیان کی ہے، لیکن صرف محمد بن اسحاق نے تیرہ رکعات بیان کی ہیں۔ محمد بن اسحاق کی اس روایت کے بارے میں علامہ نیموی حنفی نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ انھوں نے سنتِ عشا

---

[1] مسند أحمد الميمنية (٦/٢٧٥) وإسناده صحيح

[2] تمام المنة (ص: ٢٥٠)

کو بھی شمار کر لیا ہے، جیسا کہ آگے اس کا تذکرہ ہو گا۔

ایک ضعیف روایت:

ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۱ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا بكار، قال: ثنا أبو داود، قال: ثنا أبو حرة، عن الحسن، عن سعد بن هشام الأنصاري أنه سأل عائشة رضي الله عنها عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم بالليل، فقالت: كان يصلي العشاء ثم يتجوز بركعتين، وقد أعد سواكه وطهوره فيبعثه الله لما شاء أن يبعثه، فيتسوك، ويتوضأ، ثم يصلي ركعتين، ثم يقوم فيصلي ثمان ركعات يسوي بينهن في القراءة، ثم يوتر بالتاسعة“

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عشا کی نماز پڑھتے، پھر دو ہلکی رکعات پڑھتے اور میں آپ کی مسواک اور وضو کا پانی تیار رکھتی، پھر اللہ کی توفیق سے بیدار ہوتے اور مسواک اور وضو کرتے، پھر کھڑے ہو کر دو رکعات نماز ادا کرتے، پھر کھڑے ہو کر آٹھ رکعات پڑھتے، سب میں مساوی قراءت کرتے، پھر نویں رکعت سے وتر پڑھتے۔“[1]

اس روایت کے متن میں اختلاف ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ اگر شواہد کی روشنی میں اسے تقویت دی جائے اور تطبیق کی گنجایش تسلیم کی جائے تو اس کا یہی متن محفوظ قرار پائے گا۔

اس روایت کے ابتدائی حصے پر غور کریں جس میں صراحت ہے کہ حضرت

---

[1] شرح معاني الآثار، ت النجار (۱/۲۸۰)

عائشہ رضی اللہ عنہا نے عشا کے فوراً بعد دو رکعات کا ذکر کیا جو واضح دلیل ہے کہ یہ سنتِ عشا ہی تھی، اس کے بعد آگے کل گیارہ رکعات کا ذکر ہے، یعنی سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے مجموعی رکعات تیرہ ہوتی ہیں۔

اس طرح یہ روایت صاف دلیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کبھی کبھی سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے رکعات کی تعداد بتلاتی تھیں۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے۔[1] لیکن ہماری نظر میں یہ روایت اس سند سے ضعیف ہے، کیوں کہ اس میں حسن بصری سے روایت کرنے والے واصل بن عبد الرحمان، ابو حرہ ہیں اور یہ ابو حرہ جب حسن بصری سے روایت کرتے تھے تو تدلیس کرتے تھے۔[2]

(ب) اضطراب کی دوسری دلیل، نماز کی کیفیت میں اختلاف:

احناف اضطراب ثابت کرنے کے لیے دوسری بات یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دیگر احادیث میں نماز کی الگ کیفیات مذکور ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ اس سے اضطراب ہرگز ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ صحیح بخاری والی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیفیت کو حصر کے ساتھ بیان نہیں کیا، یعنی یہ ہرگز نہیں کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک ہی کیفیت میں نماز پڑھتے تھے، بلکہ حصر صرف رکعات کی اکثر تعداد میں بیان کیا ہے اور الحمد للہ اس حصر کے خلاف کوئی بات موجود نہیں ہے۔

باقی رہی رکعات کی کم از کم تعداد یا کیفیات میں اختلاف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

---

[1] صلاۃ التراویح (ص: ۱۰۲)

[2] دیکھیں: تقریب التهذیب لابن حجر (رقم: ۷۳۸۵)، معجم المدلسین (ص: ٤٨٨)

نے اس میں حصر بیان نہیں کیا، لہٰذا یہ ساری کیفیات ثابت ہیں اور سب پر عمل کرنا مسنون ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رکعات کی اکثر تعداد میں جو حصر بیان کیا ہے، وہ گیارہ کی تعداد ہے اور یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے۔

یاد رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے:

"أعلم أهل الأرض بوتر رسول الله ﷺ"[1]

"روئے زمین پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ رسول اکرم ﷺ کی نمازِ وتر (رات کی نماز) کے بارے میں کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا۔"

نوٹ: بعض حضرات حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں اضطراب ثابت کرنے کے لیے دیگر صحابہ کی روایات بھی پیش کرتے ہیں جن میں الگ الگ تعداد مروی ہے۔ عرض ہے کہ اس سے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کا اضطراب تب ثابت ہوگا جب اسی حدیث میں رواۃ کا قادح اختلاف ثابت کر دیا جائے، لیکن ایسا بالکل نہیں ہے جیسا کہ تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ علاوہ بریں دیگر صحابہ کی روایات بھی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف نہیں، اس پر مفصل بحث اگلے اعتراض کے جواب میں آ رہی ہے۔

کیا کسی محدث نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مضطرب کہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی بھی ثقہ محدث نے مضطرب نہیں کہا، بلکہ یہ باجماعِ امت صحیح و ثابت ہے، لیکن بعض لوگ غیر متعلق حوالے پیش کر کے عوام کو تشویش میں ڈالتے ہیں، اس لیے ان حوالوں کی حقیقت بھی ہم واضح کرتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم (۲/۵۱۳، ۷۴۶)

امام ابو العباس احمد بن عمر القرطبی رحمہ اللہ (المتوفی: ٦٥٦ھ) فرماتے ہیں:

"وقد أشكلت هذه الأحاديث على كثير من العلماء، حتى إن بعضهم نسبوا حديث عائشة رضي الله عنها في صلاة الليل إلى الاضطراب، وهذا إنما كان يصح لو كان الراوي عنها واحدًا، أو أخبرت عن وقت واحد" [1]

''یہ احادیث بہت سے علما کو باعثِ اشکال لگیں، حتی کہ بعض نے رات کی نماز سے متعلق حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اضطراب پر محمول کیا ہے اور یہ بات تب درست ہوتی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک ہی راوی نے یہ ساری تعداد نقل کی ہوتی، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک ہی وقت سے متعلق یہ الگ الگ باتیں بتلائی ہوتیں۔''

امام ابو العباس قرطبی کا یہی وہ کلام ہے جسے بعد کے کئی اہلِ علم نے نقل کیا ہے، اس کلام میں تین باتیں مدِنظر رکھنی چاہئیں:

1 اس کلام میں اضطراب کا جو الزام ہے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ہی لگایا گیا ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نیچے کسی راوی کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہ کوتاہی نعوذ باللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوئی ہے کہ وہ ٹھیک طرح سے تعداد بیان نہیں کرسکیں۔

ظاہر ہے یہ وہ فنی نقد نہیں ہے جسے اصولِ حدیث میں اضطراب کے نام سے جانا جاتا ہے، کیوں کہ اصولِ حدیث میں اضطراب کی بحث صحابی کے بعد کے رواۃ کے اختلاف کو لے کر ہوتی ہے۔

---

[1] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم (٣٦٧/٢)

2 یہ اضطراب والی جرح امام ابو العباس قرطبی رحمہ اللہ کی اپنی بات نہیں، بلکہ کسی مجہول شخص کی بات ہے جسے امام قرطبی نے محض نقل کیا ہے، اس لیے بعض احناف کا اسے امام قرطبی کی جرح قرار دینا محض غلط بیانی ہے۔ لہٰذا اس مجہول وگم نام شخص کی غیر اصولی اور بے دلیل بات کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔

3 امام ابو العباس قرطبی نے اس مجہول شخص کی بات نقل کر کے اس کی سختی سے تردید کر دی ہے۔ چنانچہ صاف لکھا ہے کہ یہ الزام اس وقت درست ہوتا جب یہ اختلاف بعد کے رواۃ کی طرف سے ہوتا، یعنی فنی اعتبار سے اس کلام کی گنجایش تب ہوتی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نیچے کے رواۃ کی طرف سے اختلاف ہوتا، کیوں کہ اصولِ حدیث میں اسی شکل میں اضطراب کے کلام کی گنجایش ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بھی اس الزام کی گنجایش تب ہوتی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی ایک ہی وقت سے متعلق الگ الگ حالت بیان کی ہوتی، جب کہ ایسا نہیں ہے۔

❀ امام ابو العباس قرطبی کے اسی کلام کو حافظ ابن حجر، علامہ شوکانی اور علامہ امیر یمانی نے بھی نقل کیا تو بعض نادانوں نے ان ناقلین کو بھی قائلینِ اضطراب بنا کر پیش کر دیا۔إنا للہ۔ حالانکہ ان ناقلین میں کوئی بھی اضطراب کا قائل نہیں، بلکہ ہر ایک نے مجہول شخص کی بات کو نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تردید بھی نقل کی ہے۔

تنبیہ: حافظ ظہور احمد الحسینی صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا ارشاد الحق اثری صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں: علامہ قرطبی

فقہ مالکی کے مسلمہ امام ہیں، ان کے کلام کو بلا دلیل رد کرنا بھی بہت بڑی جسارت ہے۔"[1]

عرض ہے کہ اول تو اس قول کا پسِ منظر یہ ہے کہ یہاں امام قرطبی، جو فقہ مالکی کے امام ہیں، انھوں نے امام مالک کا ایک قول نقل کیا ہے، لہٰذا اس نقل کے بارے میں مذکورہ بالا بات کہی گی ہے، یعنی فقہ مالکی کا ایک مسلمہ امام اپنے متبوع امام ہی سے ایک بات نقل کر رہا ہے، لہٰذا اسے بلا دلیل رد کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ تفسیر والے امام قرطبی ہیں جن کا نام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری الخزرجی شمس الدین القرطبی (المتوفی: ۶۷۱) ہے۔ جب کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق جن کے کلام پر بات ہو رہی ہے، وہ صحیح مسلم کے شارح ہیں اور ان کا نام ابو العباس احمد بن ابی حفص عمر بن ابراہیم الحافظ الانصاری القرطبی (المتوفی: ۶۵۶) ہے۔ حافظ ظہور احمد صاحب نے غالبًا جلد بازی میں ان دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے!!

- مولانا طاہر گیاوی صاحب نے امام سیوطی کی طرف اضطراب والی ایک عبارت منسوب کی ہے اور حوالہ امام سیوطی کی کتاب تنویر الحوالک کا دیا ہے۔[2]

عرض ہے کہ تنویر الحوالک کے جتنے نسخوں تک ہماری رسائی ہوسکی، کسی میں بھی یہ عبارت ہمیں نہیں ملی، اسی عبارت کو طاہر گیاوی صاحب نے اپنی ایک دوسری کتاب میں امام سیوطی کی کتاب تنویر الحوالک کی طرف منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ عینی کی عمدۃ القاری کا بھی حوالہ دیا ہے۔[3] یہ عبارت عمدۃ القاری میں اس طرح موجود ہے:

---

[1] توضیح الکلام (۱/۶۵)، رکعاتِ تراویح۔ایک تحقیقی جائزہ (ص:۲۰۳)

[2] أحسن التنقیح (ص: ۳۳۲)

[3] العدد الصحیح (ص: ۱۹)

"وقال ابن عبد البر: وأهل العلم يقولون: إن الاضطراب عنها في الحج والرضاع وصلاة النبي ﷺ بالليل وقصر صلاة المسافر لم يأت ذلك إلا منها، لأن الرواة عنها حفاظ، وكأنها أخبرت بذلك في أوقات متعددة وأحوال مختلفة"[1]

''امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ علم کہتے ہیں کہ حج، رضاعت، رات میں نبی ﷺ کی نماز اور مسافر کی نمازِ قصر سے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث میں جو اضطراب ہے، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی طرف سے ہے، کیوں کہ ان سے نقل کرنے والے رواۃ حفاظ ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے متعدد اوقات اور مختلف حالات کے لحاظ سے الگ الگ طرح کی باتیں نقل کی ہیں۔''

اس حوالے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ عبارت امام سیوطی کی ہر گز نہیں ہے، بلکہ امام ابن عبد البر کی ہے اور امام ابن عبد البر نے بھی بعض نا معلوم لوگوں کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے، بھلا اس کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے!

مزید یہ کہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے یہ بات نقل کر کے آخر میں اس کی تردید کر دی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو الگ الگ اوقات و حالات پر محمول کیا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ امام سیوطی کی طرف اضطراب کی جرح کی نسبت یکسر غلط ہے، بلکہ امام سیوطی کی جس کتاب کی طرف گیاوی صاحب نے اضطراب کی بات

---

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١٨٧/٧)

منسوب کی ہے، امام سیوطی نے تو اپنی اس کتاب میں امام باجی کے حوالے سے اس اضطراب والی بات کی سختی سے تردید کی ہے چنانچہ امام سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی: ۹۱۱ھ) نے امام باجی سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

”وقد ذكر بعض من لم يتأمل أن رواية عائشة رضي الله عنها اضطربت في الحج والرضاع وصلاة النبي صلى الله عليه وسلم بالليل وقصر الصلاة في السفر، قال: وهذا غلط ممن قاله فقد أجمع العلماء على أنها أحفظ الصحابة فكيف بغيرهم، وإنما حمله على هذا قلة معرفته بمعاني الكلام ووجوه التأويل“[1]

”بعض لوگ جو غور وفکر نہیں کر سکے، انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت حج، رضاعت، رات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اور سفر میں قصر کی نماز سے متعلق مضطرب ہے۔ امام باجی فرماتے ہیں: یہ بات غلط ہے، کیوں کہ اہلِ علم کا اجماع ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صحابہ میں سب سے زیادہ حافظہ والی ہیں تو دوسرے لوگوں کے مقابل میں ان کے حفظ کا کیا مقابلہ! جس نے بھی یہ اضطراب والی بات کہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ کلام کے معانی اور جمع وتطبیق کے طریقوں سے بہت کم واقف ہے۔“

ملاحظہ فرمائیں کہ امام سیوطی تو امام باجی کا تعاقب برضا و رغبت نقل کر کے اضطراب کی بات کہنے والوں کی تردید کر رہے ہیں، جب کہ مولانا طاہر گیاوی صاحب

---

[1] تنوير الحوالك شرح موطأ الإمام مالك (١٥٢/١) ط: دار إحياء الكتب العربية بمصر، تنوير الحوالك شرح موطأ الإمام مالك (١٠٨/١) ط: المكتبة التجارية الكبرىٰ مصر، تنوير الحوالك شرح موطأ الإمام مالك (ص: ١٤٢) ط: دار الكتب الإسلامية.

امام سیوطی ہی کی طرف یہ خرافات منسوب کر رہے ہیں۔ سبحان اللہ!

✿ بعض اہلِ علم نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بحث کرتے ہوئے الفاظ کے اختلاف کی طرف اشارہ کیا تو طاہر گیاوی صاحب نے ایسے لوگوں کی طرف بھی اضطراب کی بات منسوب کر دی، حالانکہ محض اختلاف بتلانا اضطراب کا حکم لگانا نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ان اہلِ علم نے اختلاف بتانے کے ساتھ جمع و تطبیق بھی پیش کی ہے اور جمع و تطبیق کا مطلب ہی یہی ہے کہ ان احادیث کی صحت تسلیم کی جا رہی ہے۔

✿ محترم حافظ ظہور احمد حسینوی صاحب کی ایک غفلت کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، آنجناب سے اسی ضمن میں ایک اور چوک یہ ہوئی ہے کہ موصوف نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف بھی اس اضطراب کی بات منسوب کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "واضطرب في هذا الأصل" ''اس اصل (حدیثِ عائشہ) میں اضطراب ہے۔''[1]

ہمارا خیال ہے کہ یہاں بھی حافظ ظہور صاحب نے جلد بازی سے کام لیا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پوری عبارت کو سیاق کے ساتھ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی، ورنہ موصوف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف اس اضطراب والی بات کی نسبت نہ کرتے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پوری عبارت یہ ہے:

"واضطرب قوم في هذا الأصل لما ظنوه من معارضة الحديث الصحيح لما ثبت من سنة الخلفاء الراشدين وعمل المسلمين، والصواب أن ذلك جميعه حسن كما قد نص على ذلك الإمام أحمد، وأنه لا يتوقت في قيام

---

[1] رکعاتِ تراویح۔ ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۰۲)

رمضان عدد"[1]

"کچھ لوگ اس معاملے (تراویح کی معین رکعات اپنانے کے سلسلے میں) میں اضطراب کا شکار ہوئے ہیں، کیوں کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ خلفائے راشدین اور مسلمانوں کے عمل سے جو طریقہ ثابت ہے وہ صحیح حدیث کے خلاف ہے، جب کہ درست بات یہ ہے کہ یہ ساری شکلیں (کسی بھی تعداد کو اپنانا) اچھی ہیں، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے اور یہ کہ رکعاتِ تراویح کی کوئی متعین تعداد نہیں ہے۔"

ملاحظہ فرمائیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اضطراب کی بات کسی حدیث سے متعلق نہیں کہی، بلکہ لوگوں کے طرزِ عمل سے متعلق کہی ہے، نیز پھر آگے اس کی تردید بھی کر دی ہے، لہٰذا یہاں یہ مطلب لینا کہ انھوں نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مضطرب کہا ہے، یہ عبارت فہمی کا نقص ہے جس کی وجہ شاید عجلت بازی ہے۔ محترم حافظ ظہور صاحب سے مودبانہ گذارش ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس عبارت پر دوبارہ نگاہ ڈالیں اور اسے پورے سیاق وسباق کے ساتھ جوڑ کر اطمینان سے پڑھیں اور اپنے سابق فہم کی خود ہی اصلاح فرمائیں۔

فریقِ مخالف سے ایک سوال:

اس بحث کے اخیر میں فریقِ مخالف سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ اگر حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا اس وجہ سے مضطرب ہے کہ اس کی الگ الگ روایات میں مختلف الفاظ ہیں تو پھر اس اضطراب کی زد میں صرف صحیحین کی اس حدیث ہی کو کیوں لایا جاتا ہے کہ جس میں گیارہ رکعات کا ذکر ہے؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ، ت الباز (۱۱۳/۲۳)

اگر واقعی یہ حدیث مضطرب ہے تو پھر اس ضمن میں حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی کوئی روایت بھی حجت نہیں ہونی چاہیے، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اسی ضمن کی ساری احادیث، خواہ عام سنن و معاجم ہی کی کیوں نہ ہوں، انھیں بلا تامل قبول کرلیا جائے اور کوئی صحیحین سے اسی سلسلے کی ایک روایت کا نام لے لے تو فوراً اضطراب کی گولہ باری شروع کر دی جائے! آخر یہ کہاں کا عدل و انصاف ہے؟

دوسرا اعتراض: حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں عدمِ حصر کا دعویٰ:

یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں حصر کا تعلق صرف اکثر رکعات سے ہے اور اس حصر کے خلاف کوئی بھی دلیل موجود نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی جن روایات سے حصر کی نفی کی جا رہی تھی ان کی وضاحت ہو چکی ہے، لیکن بعض حضرات حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصر کے خلاف دیگر صحابہ کی احادیث پیش کرتے ہیں، لہٰذا اب ہم ان احادیث پر گفتگو کریں گے۔

حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما:

امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا سعيد بن أبي مريم، أخبرنا محمد بن جعفر، قال: أخبرني شريك بن عبد الله بن أبي نمر، عن كريب، عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: بت عند خالتي ميمونة، فتحدث رسول الله ﷺ مع أهله ساعة، ثم رقد، فلما كان ثلث الليل الآخر، قعد فنظر إلى السماء، فقال: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [آل عمران: ١٩٠]، ثم قام فتوضأ واستن فصلى إحدى عشرة

ركعة، ثم أذن بلال، فصلى ركعتين ثم خرج فصلى الصبح"[1]

''ہم سے سعید بن ابی مریم نے بیان کیا، کہا ہم کو محمد بن جعفر نے خبر دی، کہا کہ مجھے شریک بن عبداللہ بن ابی نمر نے خبر دی، انھیں کریب نے اور انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ میں ایک رات اپنی خالہ (ام المومنین) میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رہ گیا۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی (میمونہ رضی اللہ عنہا) کے ساتھ تھوڑی دیر تک بات چیت کی، پھر سو گئے۔ جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ گیا تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف نظر کی اور یہ آیت تلاوت کی: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ [آل عمران: ١٩٠] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن و رات کے مختلف ہونے میں عقلمندوں کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسواک کی، پھر گیارہ رکعتیں پڑھیں۔ جب بلال رضی اللہ عنہ نے (فجر کی) اذان دی تو آپ نے دو رکعت (فجر کی سنت) پڑھی اور باہر مسجد میں تشریف لائے اور فجر کی نماز پڑھائی۔''

اس حدیث کو بغور پڑھیں اور دیکھیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس واقعہ میں پوری صراحت کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی تعداد گیارہ رکعات بتلائی ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہی تعداد بتلائی، لیکن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی واقعہ دوسری احادیث میں منقول ہے اور اس میں رکعات کی تعداد تیرہ بتلائی گئی ہے۔

[1] صحيح البخاري (٤١/٦، رقم: ٤٥٦٩)

چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا عبد الله بن مسلمة، عن مالك بن أنس، عن مخرمة بن سليمان، عن كريب، أن ابن عباس أخبره: أنه بات عند ميمونة، وهي خالته، فاضطجعت في عرض وسادة، واضطجع رسول الله ﷺ وأهله في طولها، فنام حتى انتصف الليل ـأو قريبا منه- فاستيقظ يمسح النوم عن وجهه، ثم قرأ عشر آيات من آل عمران، ثم قام رسول الله ﷺ إلى شن معلقة، فتوضأ فأحسن الوضوء، ثم قام يصلي، فصنعت مثله، فقمت إلى جنبه، فوضع يده اليمنى على رأسي وأخذ بأذني يفتلها، ثم صلى ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم أوتر، ثم اضطجع حتى جاءه المؤذن، فقام، فصلى ركعتين، ثم خرج، فصلى الصبح“[1]

”ہم سے عبداللہ بن مسلمہ نے بیان کیا، ان سے امام مالک نے بیان کیا، ان سے مخرمہ بن سلیمان نے بیان کیا، ان سے کریب نے اور انھیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ آپ ایک رات اپنی خالہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے یہاں سوئے (آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ) میں تکیہ کے عرض میں لیٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کی بیوی لمبائی میں لیٹیں۔ آپ ﷺ سو گئے جب آدھی رات گزر گئی یا اس کے لگ بھگ تو آپ ﷺ

---

[1] صحيح البخاري (٢/٢٤، رقم: ٩٩٢)

بیدار ہوئے اور نیند کے اثر کو چہرہ مبارک پر ہاتھ پھیر کر آپ ﷺ نے دور کیا۔ اس کے بعد آل عمران کی دس آیتیں پڑھیں۔ پھر ایک پرانی مشک پانی کی بھری ہوئی لٹک رہی تھی، آپ ﷺ اس کے پاس گئے اور اچھی طرح وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ پیار سے اپنا داہنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر اور میرا کان پکڑ کر اسے ملنے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت (سب بارہ رکعتیں) پھر ایک رکعت وتر پڑھ کر آپ ﷺ لیٹ گئے، یہاں تک کہ موذن اطلاع دینے آیا تو آپ ﷺ نے پھر کھڑے ہو کر دو رکعت سنت نماز پڑھی۔ پھر باہر تشریف لائے اور صبح کی نماز پڑھائی۔''

ملاحظہ فرمائیں! دونوں احادیث کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد کریب نے ہی بیان کیا ہے اور دونوں میں رات گزارنے کا واقعہ ہے۔ اس حدیث کے تمام طرق کو جمع کرنے کے بعد بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والحاصل أن قصة مبيت ابن عباس يغلب على الظن عدم تعددها"[1]

''حاصل بحث یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے رات گزارنے کے واقعہ سے متعلق غالب ظن یہی ہے کہ ایک ہی دفعہ کا واقعہ ہے۔''

لہٰذا جب یہ ایک ہی واقعہ ہے تو ایک ساتھ گیارہ رکعات یا تیرہ رکعات

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٢/٤٨٤)

دونوں کی تعداد صحیح نہیں ہوسکتی، اس لیے تطبیق دینا لازم ہے اور تطبیق کی صرف یہی صورت ہے کہ تیرہ رکعات والی حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس میں سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے بیان کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خوب بحث و تحقیق کے بعد بالآخر یہی رائے دی ہے:

"والمحقق من عدد صلاته في تلك الليلة إحدى عشرة، وأما رواية ثلاث عشرة فيحتمل أن يكون منها سنة العشاء"[1]

''اور محقق بات یہی ہے کہ اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعداد گیارہ رکعات ہی تھی اور جس روایت میں تیرہ رکعات کا بیان ہے اس میں احتمال ہے کہ سنتِ عشا کو بھی شامل کر کے بیان کیا گیا ہے۔''[1]

بلکہ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان رکعات میں سنتِ عشا کو بھی شامل کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا آدم، قال: حدثنا شعبة، قال: حدثنا الحكم، قال: سمعت سعيد بن جبير، عن ابن عباس، قال: بت في بيت خالتي ميمونة بنت الحارث زوج النبي ﷺ، وكان النبي ﷺ عندها في ليلتها، فصلى النبي ﷺ العشاء، ثم جاء إلى منزله، فصلى أربع ركعات، ثم نام، ثم قام، ثم قال: نام الغليم أو كلمة تشبهها، ثم قام، فقمت عن يساره،

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٢/٤٨٤)

فجعلني عن يمينه، فصلى خمس ركعات، ثم صلى ركعتين، ثم نام، حتى سمعت غطيطه أو خطيطه، ثم خرج إلى الصلاة"[1]

''ہم سے آدم نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم کو شعبہ نے خبر دی، ان کو حکم نے کہا کہ میں نے سعید بن جبیر سے سنا، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ ایک رات میں نے اپنی خالہ میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا زوجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گزاری اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اس دن) ان کی رات میں ان ہی کے گھر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز مسجد میں پڑھی، پھر گھر تشریف لائے اور چار رکعات (نماز نفل) پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے، پھر اٹھے اور فرمایا کہ (ابھی تک یہ) لڑکا سو رہا ہے یا اسی جیسا لفظ فرمایا۔ پھر آپ (نماز پڑھنے) کھڑے ہو گئے اور میں (بھی وضو کر کے) آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دائیں جانب (کھڑا) کر لیا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعت پڑھیں۔ پھر دو پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے۔ یہاں تک کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خراٹے کی آواز سنی، پھر آپ کھڑے ہو کر نماز کے لیے (باہر) تشریف لے آئے۔''

اس روایت میں غور کریں کہ عشا کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچتے ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما چار رکعات پڑھنا بیان کر رہے ہیں، جو صاف دلیل ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی بیان کردہ تعداد میں سنتِ عشا کو بھی شامل کیا ہے۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ بخاری کی اس روایت میں کل چار اور پھر پانچ یعنی کل نو

[1] صحيح البخاري (٣٤/١، رقم: ١١٧)

رکعات کا ذکر ہے اور اس نو میں بھی شروع کی دو رکعات سنت تھیں، تو اصل قیام کی کل تعداد صرف سات ہوتی ہے!

تو عرض ہے کہ اس روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد سعید بن جبیر نے یا ان سے نیچے کسی راوی نے صرف ابتدا کی چار رکعات بشمول سنتِ عشا بیان کی ہے اور پھر آخر میں خاص وتر کی پانچ رکعات بیان کردی ہے اور اختصار کرتے ہوئے بیچ کی چار رکعات کا ذکر نہیں کیا جس کی دلیل یہ ہے کہ خود سعید بن جبیر ہی نے دوسری روایت میں درمیان کی چار رکعات بھی بیان کر دی ہیں، چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی:۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرني محمد بن علي بن ميمون قال: نا القعنبي قال: ثنا عبد العزيز وهو ابن محمد الدراوردي عن عبد المجيد عن يحيى بن عباد عن سعيد بن جبير أن ابن عباس حدثه: أن عباس بن عبد المطلب بعثه في حاجة له إلى رسول الله ﷺ وكانت ميمونة ابنة الحارث خالة ابن عباس فدخل عليها فوجد رسول الله ﷺ في المسجد. قال ابن عباس: فاضطجعت في حجرتها وجعلت أحصي كم يصلي رسول الله ﷺ فجاء وأنا مضطجع في الحجرة بعد أن ذهب الليل فقال: أرقد الوليد؟ قال: فتناول ملحفة على ميمونة فارتدى ببعضها وعليها بعض ثم قام فصلى ركعتين ركعتين حتى صلى ثماني ركعات ثم أوتر بخمس ... الخ" [1]

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (١/٤٢٤، رقم: ١٣٤٢) وإسناده صحيح

''سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انھیں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ عباس رضی اللہ عنہ نے انھیں ایک ضرورت کے تحت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے پاس آئے، لیکن اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پھر میں ان کے کمرے میں لیٹ گیا اور ارادہ کیا کہ میں گنوں گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعات پڑھتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تشریف لائے اور میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیا بچہ سو گیا ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ لحاف میں سو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے، پھر دو دو رکعات یعنی چار رکعات پڑھیں، یہاں تک کہ کل آٹھ رکعات ہو گئیں (یعنی گھر آتے ہی پہلے جو چار پڑھ چکے تھے ان کے ساتھ یہ کل آٹھ رکعات ہوئیں)، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعات وتر پڑھیں .....الخ۔''

اس روایت پر غور کریں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر ہی کی روایت میں پانچ رکعات وتر سے قبل آٹھ رکعات کا بیان ہے، یعنی مذکورہ بالا روایت میں درمیان کی جن چار رکعات کا ذکر نہیں تھا، اس کا ذکر اس روایت میں آ گیا ہے، جو دلیل ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف ابتدا کی چار رکعات اور آخر کی پانچ رکعاتِ وتر کا ذکر ہے، اور درمیان کی مزید چار رکعات کا ذکر نہیں ہے۔

جہاں تک اس آخری روایت (سنن النسائي الكبریٰ: ١٣٤٢) کے سیاق کی بات ہے تو اس سیاق میں بھی پہلی روایت (صحيح البخاري: ١١٧) کے سیاق کی کوئی صریح مخالفت نہیں ہے، کیوں کہ اس آخری روایت کی توجیہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے گھر آتے ہی عشا کے بعد فوراً ان چار رکعات کا تفصیلاً ذکر نہیں ہے جس کا بیان اوپر کی حدیث میں ہے، لیکن رات میں اٹھنے کے بعد چار رکعات کا ذکر ہے اور پھر مجموعی تعداد آٹھ بتا دی گئی جس کا مطلب یہ نکلا کہ اس سے قبل کی چار رکعات کو شامل کر کے کل آٹھ رکعات کی تعداد بتائی گئی اور اس کے بعد پانچ رکعت وتر کا بیان ہوا۔

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اوپر والی حدیث یعنی سعید بن جبیر کی صحیح بخاری والی حدیث میں چار رکعت ادا کرنے کے بعد نبی ﷺ نے یہ پوچھا: ''نام الغلیم؟''، یعنی کیا یہ بچہ سو گیا؟ جب کہ اس دوسری روایت یعنی سنن نسائی والی روایت میں بھی یہ سوال ان الفاظ میں ہے: ''أرقد الولید؟'' کیا بچہ سو گیا؟ لیکن اس سوال سے پہلے نبی ﷺ کے سونے اور چار رکعت نماز پڑھنے کا ذکر نہیں ہے جس کا مطلب یہ نکلا کہ اس روایت میں شروع کی چار رکعات کا تفصیلاً ذکر نہیں ہے، لیکن درمیان کی چار رکعات ذکر کرتے وقت شروع کی چار رکعات بھی شمار کی گئی ہیں۔

الغرض ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی دونوں روایات کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی روایت میں بعض دفعہ عشا کے بعد کی سنت کو بھی شمار کیا ہے، اس لیے کل تیرہ رکعات کی تعداد بتلائی ہے اور جس روایت میں عشا کی سنت کو شمار نہیں کیا اس میں کل گیارہ رکعات کی تعداد بتلائی ہے، اس طرح نہ صرف یہ کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے، بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی طرح اصل صلاۃ اللیل کی کل گیارہ تعداد ہی بیان کی ہے۔

رہی بات یہ کہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کریب کی جو دوسری روایت ہے جس میں تیرہ رکعات کا ذکر ہے، اس کا سیاق کہتا ہے کہ ساری رکعتیں آپ ﷺ

نے آدھی رات کے بعد ایک ساتھ ادا کی تھیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری رکعات آدھی رات کے بعد پڑھی گئی ہیں اور آدھی رات کے بعد پڑھی جانے والی رکعات میں سنتِ عشا کی شمولیت بعید ہے۔

تو عرض ہے کہ یہ سیاق اس دلالت پر صریح نہیں ہے جب کہ دوسری طرف ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح بخاری ہی سے اوپر درج کی جا چکی ہے، جس میں پوری صراحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عشا کے بعد گھر آتے ہی چار رکعات پڑھ کر سو گئے تھے اور جب دوبارہ بیدار ہوئے تو باقی ماندہ رکعات ہی پڑھی تھیں۔

لہٰذا اس صریح روایت کے ہوتے ہوئے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کریب والی مجمل روایت کا یہی مفہوم طے ہوگا کہ اس میں اختصار کرتے ہوئے اجمالاً ایک ساتھ ہی ساری رکعات کا ذکر کر دیا گیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

”فيمكن أن يحمل قوله: صلى ركعتين، ثم ركعتين. أي قبل أن ينام، ويكون منها سنة العشاء، وقوله: ثم ركعتين إلخ أي بعد أن قام“[1]

”ممکن ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلے جو دو دو رکعت (چار رکعات) بیان کیا ہے، اسے سونے سے قبل کے وقت پر محمول کیا جائے جس میں سنتِ عشا کا بھی بیان ہے، اور آگے جو دو دو رکعت کا بیان ہے (بقیہ نو رکعات تو) اسے سونے کے بعد کے وقت پر محمول کیا جائے۔“

یعنی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ وقت میں یہ رکعات پڑھی تھیں، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں ایک روایت میں ایک ساتھ آخر میں بیان کر دیا ہے۔

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٢/٤٨٤)

اس توجیہ سے الحمد للہ یہ اشکال جڑ سے ختم ہو جاتا ہے کہ آدھی رات کے بعد پڑھی جانی والی رکعات میں سنتِ عشا کیسے شامل کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ ابتدائی چار رکعات آدھی رات سے قبل ہی پڑھی گئی تھیں، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں ساری رکعات کو ایک ساتھ مجملاً بیان کر دیا ہے۔

تاہم اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آدھی رات کے بعد ہی سنتِ عشا پڑھی تھی تو بھی اس میں کوئی اشکال نہیں، کیوں کہ صحیحین ہی کی حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کے بعد کی سنت رکعات عصر کے بعد پڑھی ہیں۔[1]

لہٰذا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے بعد کی سنت عصر کے بعد ادا کر سکتے ہیں تو عشا کے بعد کی سنت آدھی رات کے بعد کیوں نہیں پڑھ سکتے؟

اس تفصیل سے بعض حضرات مثلا طاہر گیاوی صاحب (العدد الصحیح، ص: ۲۵) کے اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی کہ آدھی رات کے بعد سنتِ عشا کیسے پڑھی جا سکتی ہے۔

حدیث زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ:

امام مسلم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا قتيبة بن سعيد، عن مالك بن أنس، عن عبد الله ابن أبي بكر، عن أبيه، أن عبد الله بن قيس بن مخرمة، أخبره عن زيد بن خالد الجهني، أنه قال: لأرمقن صلاة رسول الله ﷺ الليلة، فصلى ركعتين خفيفتين، ثم صلى ركعتين طويلتين طويلتين طويلتين، ثم صلى ركعتين،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٤)

وهما دون اللتين قبلهما، ثم صلى ركعتين، وهما دون اللتين قبلهما، ثم صلى ركعتين، وهما دون اللتين قبلهما، ثم صلى ركعتين وهما دون اللتين قبلهما، ثم أوتر، فذلك ثلاث عشرة ركعة"[1]

''زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا کہ میں آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز دیکھوں گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعات ہلکی پڑھیں، پھر دو رکعات پڑھیں اور لمبی سے لمبی اور لمبی سے لمبی، پھر دو رکعات جو ان سے کم تھیں پھر دو اور کہ وہ ان سے بھی کم تھیں، پھر دو اور کہ وہ ان سے بھی کم تھیں، پھر دو اور کہ وہ ان سے بھی کم تھیں، پھر وتر پڑھا (ایک رکعت) یہ سب تیرہ رکعات ہوئیں۔''

اس حدیث میں یہ صراحت نہیں کہ یہ تیرہ رکعات سنتِ عشا کے علاوہ تھیں، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف سے بیان کردہ گیارہ رکعات کے حصر کے خلاف یہ مجمل روایت بھی دلیل نہیں بن سکتی، بلکہ جمع و تطبیق کی راہ اپناتے ہوئے یہ ماننا لازم ہے کہ اس حدیث کی بیان کردہ رکعات میں ابتدائی دو رکعات سنتِ عشا کی رکعات تھیں۔

بالخصوص جب کہ ابتدائی دو رکعات کو خفیف بتلایا گیا ہے اور بقیہ دیگر رکعات سے الگ کیفیت میں بیان کیا گیا ہے، جب کہ رات کی اصل نماز کی تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام طویل ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خفیف رکعات رات کی اصل نماز کا حصہ نہیں، بلکہ عشا کی سنت ہی تھیں۔

---

[1] صحيح مسلم (٥٣١/٢، رقم: ٧٦٥)

تنبیہ: موطا بروایت یحییٰ میں یہی حدیث ہے اور اس میں ابتدائی دو رکعات کو بھی طویل بتلایا گیا ہے اور بعض حضرات نے اسے اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ یہ سنتِ عشا نہیں ہوسکتی، حالانکہ یہ بقول ابن عبدالبر "خطأ واضح"، یعنی واضح غلطی ہے۔[1]

کیوں کہ صرف یحییٰ کی روایت میں ایسا ہے اور باقی موطا کی تمام روایات میں ابتدائی رکعات کو خفیف ہی بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ موطا کے شارحین و محققین نے وضاحت کر دی ہے، چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

"هكذا قال يحيى في الحديث: فقام رسول الله ﷺ فصلى ركعتين طويلتين طويلتين، ولم يتابعه على هذا أحد من رواة الموطأ عن مالك"[2]

"یحییٰ نے حدیث میں ایسے ہی بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور دو طویل رکعات پڑھیں، جب کہ امام مالک سے موطا کے کسی بھی راوی نے یحییٰ کی اس پر متابعت نہیں کی ہے۔"

مزید یہ کہ ماقبل میں جو مسلم کی حدیث پیش کی گئی ہے وہ امام مالک ہی کی سند سے ہے اور اس میں ابتدائی دو رکعت کو خفیف بیان کیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں قطعی دلیل ہیں کہ موطا بروایت یحییٰ میں واضح غلطی ہے۔ افسوس ہے کہ ایک واضح غلطی کو بھی دلیل بنانے سے لوگ ذرا بھی نہیں ہچکچاتے!

❁ مولانا طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] التمهيد لابن عبد البر (٢٨٨/١٧)

[2] التمهيد لابن عبد البر (٢٨٧/١٧) نیز دیکھیں: موطأ مالك ت الأعظمي (١٦٨/٢) حاشيه.

”عشا کی سنت تو آنحضرت ﷺ حجرے میں ادا فرماتے تھے، جہاں ازواجِ مطہرات بھی ہوتی تھیں اور راوی زید بن خالد ہیں جو غیرمحرم ہیں تو کیا حجرہ میں سنتِ عشا پڑھتے ہوئے زید بن خالد دیکھ رہے تھے اور آپ کی ازواجِ مطہرات زید بن خالد جہنی سے پردہ نہ فرمایا کرتی تھیں؟“[1]

عرض ہے کہ موصوف کا یہ اعتراض اس وقت درست ہوتا جب اس حدیث میں یہ ہوتا کہ نبی ﷺ نے رات کی نماز مسجد میں پڑھی تھی اور مسجد ہی کا مشاہدہ زید بن خالد نے نقل کیا ہے، لیکن اس حدیث کے مطابق نبی ﷺ نے یہ نماز مکمل طور پر اپنے گھر ہی میں ادا فرمائی تھی اور زید بن خالد نے نبی ﷺ کے گھر ہی کا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ اس کی وضاحت خود اسی حدیث کے کئی طرق میں موجود ہے، چنانچہ سنن ابوداود کے الفاظ ہیں:

”لأرمقن صلاة رسول الله ﷺ الليلة، قال: فتوسدت عتبته أو فسطاطه...“[2]

”زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آج رات میں رسول اللہ ﷺ کی نماز ضرور دیکھ کر رہوں گا، چنانچہ میں نے آپ کی چوکھٹ یا دروازے پر ٹیک لگا لی .....۔“

ملاحظہ فرمائیں! صحابی خود صراحت کر رہے ہیں کہ نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت دیکھنے کے لیے وہ نبی ﷺ کے گھر کی چوکھٹ پر ٹیک لگا کر لیٹ گئے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جو حال بیان کیا ہے وہ گھر کے اندر کا حال تھا نہ کہ مسجد

[1] العدد الصحیح (ص: ٢٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٦٦) وإسناده صحيح.

کا۔ اس لیے طاہر گیاوی صاحب جو اعتراض سنتِ عشا پر پیش فرما رہے ہیں، درحقیقت وہ اعتراض ساری نمازوں پر وارد ہوتا ہے۔

اب رہا یہ اشکال کہ زید بن خالد رضی اللہ عنہ تو غیرمحرم تھے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اندر کیوں نگاہ ڈالی تو اہلِ علم نے اس کے بھی جوابات دیے ہیں، مثلاً: ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ ابو داود کی روایت جس میں ٹیک لگانے کا ذکر ہے، اس کے لیے "عتبة" یا "فسطاط" کا لفظ ہے اور یہ راوی کا شک ہے۔ راجح یہ ہے کہ "فسطاط" ہی کا لفظ صحیح ہے اور یہ لفظ خیمہ سے بنے گھر پر صادق آتا ہے جو سفر وغیرہ میں عارضی طور پر بنتا ہے، لہٰذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ سفر کا واقعہ تھا۔

مولانا خلیل احمد سہارنپوری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ولعل هذه القصة وقعت في السفر"[1]

"لگتا ہے کہ یہ واقعہ سفر کا ہے۔"

علامہ محمود خطاب السبکی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"ولعل هذا هو الصواب وكان النبي ﷺ في سفر وكان ذلك بإذنه"[2]

"یہی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی حالت میں تھے اور زید بن خالد نے ایسا آپ کی اجازت سے کیا تھا۔"

ملاحظہ فرمائیں! مولانا طاہر گیاوی صاحب نے جو اشکال سنتِ عشا کے مشاہدہ پر کیا ہے، اس حدیث کے شارحین وہی اشکال پوری نماز کے مشاہدے پر محسوس کر

---

(1) بذل المجهود (١٤٢/٧)

(2) شرح سنن أبي داود (٢٩٩/٧)

رہے ہیں اور جواب یہ دے رہے ہیں کہ یہ سفر کا واقعہ تھا اور زید بن خالد نے نبی ﷺ سے اجازت لے کر ایسا کیا تھا۔

بہرحال اس اشکال کو جس طرح چاہیں رفع کریں، بہرصورت سنتِ عشا سے متعلق اشکال بھی رفع ہو جائے گا، کیوں کہ حدیث کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ساری نمازیں گھر (حجرہ یا خیمہ) کے اندر پڑھی گئی تھیں اور اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ نبی ﷺ نے اصل نماز گھر کے باہر پڑھی تھی تو پھر اس بات سے کیا چیز مانع ہے کہ نبی ﷺ نے عشا کی سنت کو بھی گھر سے باہر پڑھا ہو؟

بعض روایات میں یہ آنا کہ نبی ﷺ عشا کی سنت گھر میں پڑھتے تھے، اس سے عام معمول کا ثبوت تو ملتا ہے، لیکن اس سے یہ لازمی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نبی ﷺ نے کبھی عشا کی سنت گھر سے باہر پڑھی ہی نہیں، بلکہ اگلی سطور میں آنے والی حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ نبی ﷺ نے گھر کے باہر سنتِ عشا پڑھی ہے۔

حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ:

امام محمد بن نصر بن الحجاج المروزی (المتوفی: ۲۹۴ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا إسحاق، أخبرنا يزيد بن هارون، أخبرني يحيى ابن سعيد، عن شرحبيل بن سعد، أنه سمع جابر بن عبد الله يحدث قال: أقبلنا مع رسول الله ﷺ من الحديبية حتى إذا كنا بالسقيا، قام رسول الله ﷺ إلى جنبه، فصلى العتمة، ثم صلى ثلاث عشرة سجدة“[1]

---

[1] مختصر قيام الليل (ص: ۱۲۲) والحديث حسن

”جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ سے لوٹے، یہاں تک کہ جب سقیا پہنچے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ کھڑے ہوئے اور عشا کی نماز پڑھی، پھر تیرہ رکعات پڑھیں۔“

یہی حدیث مسند احمد میں ہے جس کے الفاظ ہیں:

”فصلى العتمة -وجابر فيما ذكر إلى جنبه- ثم صلى بعدها ثلاث عشرة سجدة“[1]

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز پڑھی، جابر رضی اللہ عنہ آپ کے بازو میں تھے، پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ رکعات پڑھیں۔“

اس حدیث میں بھی تیرہ رکعات کا ذکر ہے، لیکن اس میں سنتِ عشا کی شمولیت اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز پڑھی اور پھر اس کے بعد تیرہ رکعات پڑھیں۔ ظاہر ہے کہ ان تیرہ رکعات میں ابتدائی دو رکعات سنتِ عشا کی تھیں۔

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔[2] امام ابن خزیمہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔[3] اس کی سند میں شرحبیل بن سعد ہیں جن پر حافظے کے لحاظ سے جرح ہے، لیکن فی نفسہٖ سچے ہے۔[4]

مزید یہ کہ یہاں ان سے یحیٰی بن سعید القطان روایت کر رہے ہیں جو مزید اطمینان کا باعث ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث صحیح

---

[1] مسند أحمد ط الميمنية (٣/٣٨٠) والحديث حسن

[2] صحيح ابن حبان (احسان) رقم (٢٦٢٨)

[3] صحيح ابن خزيمة (١١٦٥)

[4] تقريب التهذيب لابن حجر (٢٧٦٤)

ابن خزیمہ میں ایک دوسری صحیح سند سے بھی مروی ہے جس کے الفاظ ہیں:

”فتقدم رسول الله ﷺ يصلي، وصلينا معه، فصلى ثلاث عشرة ركعة بالوتر“ [1]

”تو اللہ کے رسول ﷺ آگے بڑھے اور نماز پڑھنے لگنے۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ نمازِ (عشا) پڑھ لی، پھر اللہ کے نبی ﷺ نے وتر سمیت تیرہ رکعات پڑھیں۔“

اس سند کے ساتھ مل کر یہ حدیث حسن ہو جاتی ہے، والحمد للہ۔

اس حدیث سے نہ صرف یہ پتا چلا کہ اس میں عشا کی سنت بھی شامل ہے، بلکہ اوپر کی احادیث میں جو یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ان میں بھی عشا کی سنت کو شامل کیا گیا ہے، اس کی بھی پرزور تائید ہوتی ہے۔

❁ مولانا طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں:

”کیا مولوی علی احمد یا کوئی دوسرے غیر مقلد صاحب کسی صحیح روایت سے اس بات کا ثبوت فراہم کر سکتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کبھی تہجد کے ساتھ ملا کر عشا کی سنت پڑھی ہے۔“ [2]

عرض ہے:

أولاً: اس بات کا ثبوت تو خود وہی روایات ہیں جن میں فجر کی سنت کے علاوہ تیرہ رکعات کا ذکر ہے، کیوں کہ اسی قسم کی بعض روایات کے دیگر طرق میں گیارہ کی تعداد نقل ہوئی ہے جو صاف دلیل ہے کہ تیرہ رکعات میں عشا کی دو سنت

---

(1) صحيح ابن خزيمة (١٥٣٦) وإسناده حسن

(2) العدد الصحيح (ص: ٢٥، ٢٦)

شامل کی گئی ہے۔

ثانیاً: اس کے علاوہ صحیح بخاری (رقم: ۱۱۷) میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ایک صریح دلیل موجود ہے جو ماقبل میں گزر چکی ہے۔

ثالثاً: موخر الذکر جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پوری طرح صراحت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی سنت کو رات کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھا۔

گیارہ اور تیرہ رکعات والی روایات کے مابین تطبیق کی ایک اور صورت:

ہمارے نزدیک راجح اور اقرب الی الصواب بات یہی ہے کہ گیارہ اور تیرہ رکعات سے متعلق جملہ روایات میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ تیرہ والی روایات میں یا تو سنتِ عشا یا سنتِ فجر کی دو رکعات بھی شمار کی گئی ہیں۔ یہ تطبیق اس لیے زیادہ وزنی ہے کیوں کہ بعض روایات میں صراحتاً یا اشارۃً اس کا ذکر موجود ہے۔

لیکن بعض اہلِ علم نے ایک اور تطبیق دی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کی اصل نماز شروع کرنے سے قبل افتتاحیہ کے طور پر دو ہلکی رکعات پڑھتے تھے۔ یہ دو رکعات اصل صلاۃ اللیل کا حصہ نہ ہوتی تھیں، اس لیے بعض روایات میں ان کا شمار نہ کرتے ہوئے گیارہ رکعات کا بیان ہے اور بعض روایات میں انھیں بھی شمار کر لیا گیا ہے، اس لیے کل تعداد تیرہ رکعات بتلائی گئی ہے۔

اگر یہ توجیہ مان لی جائے تو بھی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حصر برقرار رہتا ہے، کیوں کہ دریں صورت بطور افتتاحیہ دو رکعات کی حیثیت علاحدہ نماز کی ہو گی جیسے فرائض میں اصل فرض رکعات سے قبل بطور افتتاحیہ کچھ رکعات پڑھی جاتی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بابت ایک توجیہ تو وہی ذکر کی جسے ہم نے راجح قرار دیا ہے، یعنی تیرہ رکعات والی حدیث میں سنتِ عشا کو بھی شامل

کرلیا گیا ہے، لیکن اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسری توجیہ یہی پیش کی ہے کہ یہ صرف افتتاحی دو رکعات تھیں اور اسی کو راجح قرار دیا ہے۔[1]

ایک اہم نکتہ:

محدثین نے گیارہ اور تیرہ رکعات کے مابین جمع وتطبیق کی صورت اپنائی ہے جو ان محدثین کی طرف سے اشارہ ہے کہ یہ حضرات صلاۃ الیل کی اکثر تعداد گیارہ ہی مانتے ہیں، ورنہ اگر ان محدثین کے یہاں اکثر تعداد تیرہ ہوتی تو گیارہ کے ساتھ جمع وتطبیق کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے۔

ایک ضعیف روایت (حدیث امِ سلمہ رضی اللہ عنہا):

امام ترمذی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا هناد قال: حدثنا أبو معاوية، عن الأعمش، عن عمرو ابن مرة، عن يحيى بن الجزار، عن أم سلمة، قالت: كان النبي ﷺ يوتر بثلاث عشرة، فلما كبر وضعف أوتر بسبع“[2]

”ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی اکرم ﷺ وتر تیرہ رکعات پڑھتے تھے، لیکن جب آپ عمر رسیدہ اور کمزور ہوگئے تو سات رکعات پڑھنے لگے۔“

اس کی سند ضعیف ہے۔ سلیمان الاعمش نے یہاں عن سے روایت کیا ہے اور یہ تیسرے درجے کے مدلس ہیں۔[3]

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (۲۱/۳)

[2] سنن الترمذي ت شاكر (۳۱۹/۲، رقم: ۴۵۷) وإسناده ضعيف

[3] دیکھیں: النكت على كتاب ابن الصلاح لابن حجر (۶٤۰/۲) اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ”یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ“ (ص: ۳۹۳۔۳۹۵)

اس ضعف کے ساتھ عمرو بن مرہ اضطراب کا بھی شکار ہوئے ہیں، چنانچہ یہاں انھوں نے یہ روایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی ہے، جب کہ کبھی انھوں نے یہی روایت ام الدرداء رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بیان کی ہے۔[1]

اس کی سند بھی اعمش کے عنعنہ کے سبب ضعیف ہے۔ مزید یہ کہ عمارہ بن عمیر نے ان کی مخالفت کی ہے اور اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بیان کیا ہے۔[2]

امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"خالفه عمارة بن عمير فرواه عن يحيى بن الجزار عن عائشة"[3]

"عمارہ بن عمیر نے عمرو بن مرہ کی مخالفت کی ہے اور اس حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بیان کیا ہے۔"

اس روایت میں تیرہ رکعات کی بات نہیں ہے، تاہم یہ روایت بھی اعمش کے عنعنہ کے سبب ضعیف ہی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث اس طرح بیان کی ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرني إبراهيم بن يعقوب قال حدثنا عثمان وهو ابن عمر قال أنبأ إسرائيل عن أبي إسحاق عن أبي سلمة عن أم سلمة قالت: كان رسول الله ﷺ يصلي من الليل ثلاث عشرة ركعة، ثماني ركعات، ويوتر بثلاث، ويركع ركعتي الفجر"[4]

---

[1] دیکھیں: شرح معاني الآثار، ت النجار (۲۹۱/۱)

[2] سنن النسائي (۲۳۸/۳)

[3] سنن النسائي (۲۳۷/۳)

[4] سنن النسائي الكبرىٰ (۱۶۰/۱، رقم: ۳۹٤)

''ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ رات میں تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ آٹھ رکعات پڑھتے، پھر تین رکعات وتر پڑھتے اور اس کے بعد فجر کی دو رکعات پڑھتے۔''

اس روایت میں یہ صراحت آ گئی ہے کہ امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فجر کی دو رکعات کو شمار کرنے کے ساتھ مجموعی تعداد تیرہ رکعات بتلائی ہے۔

اس کی سند بھی ابو اسحاق السبیعی کے عنعنہ کے سبب ضعیف ہے، لیکن بعینہٖ اسی بات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی بیان کیا ہے۔[1]

اس لیے اگر اس شاہد کے سبب اس حدیث کی تصحیح کی جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فجر کی دو رکعات شامل کرتے ہوئے رات کی رکعات کی مجموعی تعداد تیرہ رکعات بتلائی ہے۔

ایک ضعیف اور منکر روایت (حدیثِ علی رضی اللہ عنہ):

امام عبد اللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۰ھ) فرماتے ہیں:

"حدثني العباس بن الوليد، حدثنا أبو عوانة، عن أبي إسحاق، عن عاصم بن ضمرة، قال: سئل علي رضي الله عنه عن صلاة رسول الله ﷺ، قال: كان يصلي من الليل ست عشرة ركعة"[2]

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم ﷺ کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: آپ ﷺ رات میں سولہ رکعات پڑھتے تھے۔''

---

[1] صحيح البخاري (٥١/٢، رقم: ١١٤٠)

[2] زوائد على مسند أحمد ط الميمنية (١٤٥/١) وإسناده ضعيف ومتنه منكر

عرض ہے کہ اس روایت کے مرکزی راوی ابواسحاق السبیعی ہیں اور ان سے مروی اس حدیث میں رکعات کے سلسلے میں شدید اضطراب ہے، مثلاً: مذکورہ روایت میں انھوں نے رات کی سولہ رکعات بتلائی ہے، جب کہ بعض روایت میں ”يصلي من النهار ست عشرة ركعة“ یعنی دن کی سولہ رکعات کا ذکر کیا ہے۔[1]

بعض روایت میں ”يصلي من الليل التطوع ثماني ركعات، وبالنهار ثنتي عشرة ركعة“ یعنی رات میں آٹھ رکعات اور دن میں بارہ رکعات پڑھنے کا ذکر ہے۔[2]

اس کے علاوہ اضطراب کی اور بھی شکلیں ہیں، لیکن یہاں ان پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہ ساری روایت مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ ضعیف بھی ہیں، کیوں کہ ان سب میں ابواسحاق السبیعی نے ”عن“ سے روایت کیا ہے اور یہ تیسرے طبقے کے مدلس ہیں۔[3]

البتہ اس سلسلے کی ایک حدیث میں ابو اسحاق السبیعی نے سماع کی صراحت کر دی ہے، لہٰذا صرف یہی روایت صحیح ہے اور اس میں یہ رکعات رات کے بجائے دن کی بتلائی گئی ہیں، چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن أبي إسحاق، قال: سمعت عاصم بن ضمرة، يقول: سألنا عليا رضي الله عنه عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم من النهار، فقال: إنكم لا تطيقون ذلك. قلنا: من أطاق منا ذلك؟ قال: إذا كانت الشمس من

---

[1] مسند أحمد ط الميمنية (١/١٤٦)

[2] مسند أبي يعلىٰ الموصلي (٤٩٥)

[3] طبقات المدلسين لابن حجر ت القريوتي (ص:٤٢)

هاهنا كهيئتها من هاهنا عند العصر صلى ركعتين، وإذا كانت الشمس من هاهنا كهيئتها من هاهنا عند الظهر صلى أربعا، ويصلي قبل الظهر أربعا وبعدها ركعتين، وقبل العصر أربعا، ويفصل بين كل ركعتين بالتسليم على الملائكة المقربين والنبيين ومن تبعهم من المؤمنين والمسلمين"[1]

"عاصم بن ضمرہ کہتے ہیں کہ ہم نے علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن کی نماز کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس پر ہم نے کہا: ہم میں سے کون اس کی طاقت رکھتا ہے؟ تو انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سورج اس طرف (مشرق کی طرف) اس طرح ہو جاتا جیسے عصر کے وقت اس طرف (مغرب کی طرف) ہوتا ہے تو دو رکعتیں پڑھتے، پھر جب سورج اس طرف (مشرق میں) اس طرح ہو جاتا جیسے اس طرف (مغرب میں) ظہر کے وقت ہوتا ہے تو چار رکعات پڑھتے، اور چار رکعات ظہر سے پہلے پڑھتے، پھر دو رکعت اس کے بعد، پھر عصر سے پہلے چار رکعات پڑھتے، ہر دو رکعت کے درمیان مقرب فرشتوں اور انبیا و رسل پر اور مومنوں اور مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے ان پر سلام پھیر کر فصل کرتے۔"

ملاحظہ فرمائیں! اس حدیث میں ابواسحاق السبیعی نے سماع کی صراحت کر

[1] مسند أحمد ط الميمنية (١/١٦٠، رقم: ١٣٧٥) وإسناده صحيح، وانظر: سنن الترمذي (٥٩٨) وفيه من رواية شعبة عن أبي إسحاق.

دی ہے اور اس میں رات کی نہیں، بلکہ دن کی رکعات کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس سلسلے کی یہی حدیث صحیح و محفوظ ہے اور باقی روایات منکر وضعیف و باہم مضطرب ہیں۔

مولانا طاہر گیاوی صاحب ابواسحاق کی معنعن اور منکر وضعیف روایت پیش کرنے کے بعد اس کے رجال کی ثقاہت پر اچھی خاصی تفصیل پیش کر کے فرماتے ہیں:

”سند کے تمام راویوں کی توثیق نقل کی جا چکی ہے جس کے بعد روایت کی صحت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں رہ جاتی۔“[1]

عرض ہے کہ اس کے رجال کی ثقاہت پر کوئی اعتراض ہے ہی نہیں، اس لیے اس کے اثبات پر توانائی صرف کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اصل وجۂ ضعف ابواسحاق کا عنعنہ اور نکارت ہے جس کے ازالے میں موصوف نے ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

اور دو رنگی کی انتہا تو دیکھیے کہ اس روایت کے متن میں شدید اضطراب ہے، پھر بھی اس روایت کے صحیح ہونے کے لیے محض رجال کا ثقہ ہو جانا ہی کافی ہے، صحتِ سند کی بھی ضرورت نہیں اور صحیح بخاری کی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا جس کے نہ صرف رواۃ ثقہ ہیں، بلکہ سند بھی متصل و صحیح ہے اور متن بھی بے داغ ہے، وہاں یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ سند کے صحیح ہونے سے متن کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ سبحان اللہ!

ایک مرسل روایت:

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۱۱ھ) فرماتے ہیں:

”عن معمر، عن ابن طاووس، عن أبيه قال: كان النبي ﷺ يصلي سبع عشرة ركعة من الليل“[2]

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ۳۱۳)

[2] مصنف عبد الرزاق، ت الأعظمي (۳/۳۸، رقم: ٤٧١٠)

''طاؤس (تابعی) فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ رات میں سترہ رکعات پڑھتے تھے۔''

یہ روایت مرسل ہے، کیوں کہ طاؤس تابعی ہیں اور اللہ کے نبی ﷺ سے بغیر واسطہ ذکر کیے روایت کر رہے ہیں۔ لہٰذا مرسل ہونے کے سبب یہ روایت ضعیف ہے اور ضعیف ہونے کے ساتھ ہی ساری صحیح روایات کے خلاف بھی ہے، کیوں کہ کسی بھی صحیح روایت میں رات کی مجموعی تعداد سترہ نہیں بتلائی گئی۔

مولانا طاہر گیاوی صاحب اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اگرچہ یہ روایت مرسل ہے، لیکن چونکہ اس کی تائید صحیح اور متصل روایت سے ہو جاتی ہے، اس لیے اصولِ حدیث کی روشنی میں یہ بھی قابلِ احتجاج ہو جاتی ہے۔''[1]

عرض ہے کہ اس کے بعد موصوف نے ماقبل والی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ضعیف و منکر روایت پیش کی ہے جس کا حشر قارئین اوپر دیکھ چکے ہیں۔

تیسرا اعتراض: تہجد اور تراویح میں فرق کا فلسفہ:

حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ اکثریتی تعداد کے حصر میں بالکل صریح ہے۔ عصرِ حاضر کے احناف کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے، اس لیے ان حضرات نے ایک نیا فلسفہ تراشا اور چودہ سو سال کے بعد ایک نیا دعویٰ کیا کہ تہجد اور تراویح یہ دو الگ الگ نمازیں ہیں۔

عرض ہے کہ اول تو تراویح اور تہجد دونوں ایک ہی نماز ہے، یعنی صلاۃ اللیل رات کی نماز ہے، ان دونوں میں فرق حالات کے لحاظ سے ہے۔ یعنی رات کی نماز

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٣٠٩)

عام دنوں میں پڑھی جائے تو اسے تہجد کہتے ہیں اور رمضان میں اسی کا نام نمازِ تراویح ہے۔ حالات کے لحاظ سے اس کی صفات میں بھی تبدیلی ہوتی ہے، یعنی رمضان میں یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، لیکن عام دنوں میں جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی جاتی، لیکن بعض حالات میں صفات کی تبدیلی اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔

مثال کے طور پر ظہر کی فرض نماز عام حالات میں چار رکعات پڑھی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی سفر میں ہو تو اس کے لیے قصر ہے، یعنی وہ صرف دو رکعات پڑھتا ہے۔ ظاہر ہے حالتِ سفر میں اس نماز کی صفت الگ ہوتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کوئی الگ نماز ہے، بلکہ یہ وہی ظہر کی نماز ہے جو حضر میں چار رکعات پڑھی جاتی ہے، لیکن سفر میں اس کی کیفیت بدل گئی ہے۔ تقریباً یہی مثال رات کی نماز کی ہے۔ عام دنوں میں یہ فرداً فرداً پڑھی جاتی ہے، لیکن رمضان میں یہ جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے، لیکن حالات کے لحاظ سے صفت کی یہ تبدیلی اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ الگ الگ نمازیں ہیں۔

ایک دنیاوی مثال سے سمجھیں کہ بعض علاقوں میں سارے ہی انسان گورے ہوتے ہیں، یعنی ان کے اوصاف دوسرے علاقوں کے اوصاف سے مختلف ہوتے ہیں تو کیا اوصاف میں اس اختلاف کے پیشِ نظر ان کے انسان ہونے کی نفی کر دی جائے اور انھیں کسی اور نسل کا حیوان قرار دے دیا جائے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فرض کر لیں کہ یہ الگ الگ نمازیں ہیں تو ایسی صورت میں مذکورہ بالا حدیث کی رو سے دونوں نمازوں کی تعداد یکساں ماننا لازمی ہو گا، کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دونوں کی تعداد یکساں بتلائی ہے، چنانچہ حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو سوال ہوا تھا وہ رمضان کی خاص نماز یعنی تراویح کے سلسلے میں ہوا تھا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تراویح اور تہجد دونوں کی رکعتوں کی تعداد یکساں بتلاتے ہوئے جواب دیا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اس حدیث میں تراویح کی تعداد کا ذکر نہیں تو یہ لازم آئے گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سائل کے اصل سوال کا جواب ہی نہیں دیا، کیوں کہ اصل سوال تو تراویح ہی کے بارے میں ہوا تھا، لہٰذا یہ ماننا ضروری ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اصل سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ ایک زائد بات بھی بتلا دی، یعنی تراویح کی رکعات بتلانے کے ساتھ ساتھ تہجد کی رکعات بھی بتلا دیں۔

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سوال تہجد ہی کے بارے میں تھا اور دلیل یہی دی ہے کہ جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رمضان اور غیر رمضان دونوں کی بات کہی ہے۔فرماتے ہیں:

> ”تہجد کی نماز جو رمضان اور غیر رمضان دونوں زمانوں میں عام ہے، جواب میں اس عموم کا صراحتاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر بھی فرمایا ہے ...الخ۔“[1]

عرض ہے کہ گیاوی صاحب سوال کو بھول گئے کہ اس میں رمضان و غیر رمضان کی صراحت نہیں، بلکہ صرف رمضان ہی کی صراحت ہے۔جو صاف دلیل ہے کہ سوال خاص رمضان کی نماز یعنی تراویح کے بارے میں ہوا تھا، لیکن چونکہ یہ نماز اور دیگر زمانوں میں تہجد کی نماز ایک ہی ہے، اس لیے جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دونوں کی تعداد یکساں بتلائی ہے۔

---

[1] احسن التنقیح (ص: ٢٤٨)

بالفرض مان بھی لیں کہ سوال صرف تہجد کے بارے میں تھا تو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں جو تفصیل کا اسلوب اپنایا ہے، اس کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ تراویح کی بابت بھی وضاحت کر دیتیں، لیکن تفصیلی جواب دینے کے باوجود بھی تراویح سے متعلق الگ سے ایک حرف بھی نہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رمضان میں تہجد اور تراویح کو ایک ہی مانتی ہیں۔

تہجد اور تراویح کے ایک ہونے سے متعلق دس دلائل

پہلی دلیل:

صحیح بخاری کی پیش کردہ حدیث میں سائل نے رمضان کی نماز، یعنی تراویح کے بارے میں سوال کیا تھا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تراویح اور تہجد دونوں کو ایک ہی نماز مان کر دونوں کے بارے میں ایک ہی جواب دیا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے۔اس پر طاہر گیاوی صاحب کے اعتراض کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔

دوسری دلیل:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھنا ثابت نہیں ہے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تراویح اور تہجد کے ایک ہی نماز ہونے کی دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وإنَّما يثبُتُ تغايُرُ النَّوْعَيْن إذا ثَبَت عن النبيِّ ﷺ أنه صلى التهجُّدَ مع إقامَتِهِ بالتراويحِ“[1]

---

[1] فيض الباري شرح صحيح البخاري (٤/٢٣)

”دونوں نمازوں کا الگ الگ نماز ہونا اس وقت ثابت ہوگا جب اس بات کا ثبوت مل جائے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے تراویح پڑھنے کے ساتھ ساتھ تہجد بھی پڑھی ہے۔“

علامہ کشمیری نے جو بات کہی ہے وہی بات اہلِ حدیث حضرات بھی کہتے ہیں، جس پر طاہر گیاوی صاحب نے ایک دلچسپ اعتراض کیا ہے، فرماتے ہیں:

”مذکورہ استدلال پڑھنے کے بعد بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اسی انداز میں ان سے بھی ایک بات دریافت کرنی چاہیے، کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے تراویح کے علاوہ نمازِ عشا بھی ادا فرمائی تھی .... الخ۔“[1]

گیاوی صاحب سے گذارش ہے کہ اہلِ حدیث حضرات کے سامنے اس بے ساختگی کے اظہار کے بجائے علامہ کشمیری کے تلامذہ پر ماتم کیجیے کہ یہ بدنصیب فہم و فراست میں کس درجہ مفلس تھے کہ اپنے استاذ کی اس بے تکی بات پر معترض ہونے کے بجائے اسے علمی خزانہ سمجھ کر حوالۂ تحریر کر دیا۔

بہرحال ہماری طرف سے جواباً گذارش ہے:

أولا: اس طرح کی بے ساختگی کے اظہار سے قبل کتبِ احادیث کی ورق گردانی بھی کر لیجیے، کیوں کہ ایک نہیں بلکہ کئی احادیث میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ نے عشا کی نماز پڑھنے کے بعد تراویح کی مذکورہ بالا نماز پڑھی تھی۔ مسند احمد کی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کا بیان ہے:

"فخرج إليه رسول الله ﷺ بعد أن صلى العشاء الآخرة،

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٦٠)

قالت: فاجتمع إليه من في المسجد، فصلى بهم رسول الله ﷺ ليلا طويلا"[1]

''عشا کی نماز پڑھنے کے بعد جو لوگ مسجد میں تھے، سب آپ ﷺ کے ساتھ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے انھیں دیر رات تک نماز پڑھائی۔''

ثانیاً: بالفرض اگر حدیث میں اس کی صراحت نہ بھی ہوتی تو بھی گیاوی صاحب کی بے ساختگی بے معنی تھی، کیوں کہ نمازِ عشا کا محل الگ ہے اور قیام اللیل کا محل الگ ہے۔ اگر نبی ﷺ نے کسی دن عشا ہی کے محل میں عشا جیسی کوئی نماز پڑھی ہوتی تو اس سوال کی گنجایش تھی کہ اس موقع سے نبی ﷺ نے عشا کی نماز پڑھی یا نہیں پڑھی؟

لیکن آپ ﷺ نے صحابہ کے ساتھ تین رات باجماعت جو خاص نماز پڑھی وہ قیام اللیل کے محل میں پڑھی ہے اور قیام اللیل جیسی نماز پڑھی ہے، فرق صرف بعض کیفیت میں ہے، اس لیے یہاں یہ سوال بالکل بجا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے الگ سے کوئی اور قیام کیا یا نہیں؟

بلکہ آگے تیسری دلیل کے تحت جو روایت آ رہی ہے اس میں تو یہاں تک بیان ہے کہ آخری رات نبی ﷺ نے اتنی دیر تک نماز پڑھائی ہے کہ صحابہ کو ڈر ہوا کہ کہیں انھیں سحری کرنے کا وقت بھی نہ ملے۔ اب گیاوی صاحب بتلائیں کہ اگر اس رات بھی آپ ﷺ نے الگ سے کوئی نماز پڑھی تھی تو اس کے لیے وقت ہی کہاں بچا تھا؟

طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں: جب آپ ﷺ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ تہجد پڑھتے تھے تو اس رات بھی اس معمول پر عمل کیا ہوگا۔عرض ہے کہ آپ ﷺ نے

---

[1] مسند أحمد ط الميمنية (٦/٢٦٧) وإسناده صحيح

صحابہ کے ساتھ جو نماز پڑھی، یہی تو وہ عمل تھا، اس کے علاوہ الگ سے اس عمل کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

طاہر گیاوی صاحب نے غیر متعلق مثالیں دے کر سادہ لوح قارئین کو بہکانے کی کوشش کی ہے۔ ہم بھی ایک مثال عرض کرتے ہیں: فرض کریں کسی شخص کا دائمی معمول ہے کہ وہ شام کا کھانا اپنے گھر میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ تناول کرتا ہے، لیکن کسی شام کسی نے اس کی دعوت کی اور اس دن اس نے دعوت میں جا کر دوسرے لوگوں کے ہمراہ کھانا تناول فرما لیا، تو کیا اس شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنے گھر پر بھی آ کر اپنے سابقہ معمول کے مطابق کھانا کھایا ہوگا؟

تیسری دلیل:

"عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: صُمْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يُصَلِّ بِنَا، حَتَّى بَقِيَ سَبْعٌ مِنَ الشَّهْرِ، فَقَامَ بِنَا حَتَّى ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ، ثُمَّ لَمْ يَقُمْ بِنَا فِي السَّادِسَةِ، وَقَامَ بِنَا فِي الخَامِسَةِ، حَتَّى ذَهَبَ شَطْرُ اللَّيْلِ، فَقُلْنَا لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، لَوْ نَفَّلْتَنَا بَقِيَّةَ لَيْلَتِنَا هَذِهِ؟ فَقَالَ: إِنَّهُ مَنْ قَامَ مَعَ الإِمَامِ حَتَّى يَنْصَرِفَ كُتِبَ لَهُ قِيَامُ لَيْلَةٍ، ثُمَّ لَمْ يُصَلِّ بِنَا حَتَّى بَقِيَ ثَلَاثٌ مِنَ الشَّهْرِ، وَصَلَّى بِنَا فِي الثَّالِثَةِ، وَدَعَا أَهْلَهُ وَنِسَاءَهُ، فَقَامَ بِنَا حَتَّى تَخَوَّفْنَا الفَلَاحَ. قُلْتُ لَهُ: وَمَا الفَلَاحُ، قَالَ: السُّحُورُ. هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ"[1]

"ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزے

---

[1] سنن الترمذي (٣/١٦٠، رقم: ٨٠٦) وإسناده صحيح

رکھے۔ آپ نے تئیسویں رات تک ہمارے ساتھ رات کی نماز نہیں پڑھی۔ پھر تیئسویں رات کو ہمیں لے کر کھڑے ہوئے یہاں تک کہ تہائی رات گزر گئی، پھر چوبیسویں رات کو نماز نہ پڑھائی، لیکن پچیسویں رات کو آدھی رات تک نماز (تراویح) پڑھائی۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہماری آرزو تھی کہ آپ باقی رات بھی ہمارے ساتھ نوافل پڑھتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص امام کے ساتھ اس کے فارغ ہونے تک نماز میں شریک رہا، اس کے لیے پوری رات کا قیام لکھ دیا گیا۔ پھر نبی ﷺ نے ستائیسویں رات تک نماز نہ پڑھائی۔ ستائیسویں رات کو پھر کھڑے ہوئے اور ہمارے ساتھ اپنے گھر والوں اور عورتوں کو بھی بلایا، اور قیام کیا، یہاں تک کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ ''فلاح'' کا وقت نہ نکل جائے۔ راوی کہتے ہیں میں نے ابو ذر سے پوچھا: ''فلاح'' کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: سحری۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے تیسرے دن تراویح کو اتنی دیر تک پڑھا تھا کہ صحابہ کو ڈر تھا کہ کہیں سحری کا موقع ہی نہ ملے۔ ظاہر ہے کہ جب سحری کا وقت نہ ملنے کا خوف تھا تو تہجد کا وقت ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اگر تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہوتیں تو اللہ کے نبی ﷺ تراویح میں اتنی تاخیر نہ کرتے کہ سحری کا وقت بھی مشکل سے ملے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ نہ کہتے کہ ہمیں یہ ڈر ہوا کہ کہیں سحری کا وقت نہ ملے، بلکہ یوں کہتے کہ ہمیں یہ ڈر ہوا کہ کہیں تہجد ہی کا وقت نہ ملے۔

مزید برآں یہ حدیث اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس رات تراویح کے بعد تہجد کے لیے کوئی موقع تھا ہی نہیں اور آپ ﷺ نے اس رات تہجد نہیں پڑھی۔ اگر تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہوتیں تو آپ ﷺ اس رات بھی تہجد خود پڑھتے اور صحابہ کو بھی اس کا موقع دیتے۔

چوتھی دلیل:

"عَنْ قَيْسِ بْنِ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: لَا وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ" [1]

"قیس بن طلق بن علی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔"

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے تراویح کے ساتھ وتر بھی پڑھے تھے، جیسا کہ آگے حدیث آ رہی ہے اور وتر کی نماز تہجد کے ساتھ ہی پڑھی جاتی ہے۔

اگر تراویح اور تہجد الگ الگ مانیں تو یہ لازم آئے گا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے دو بار وتر پڑھے ہیں اور یہ ناممکن ہے، کیوں کہ مذکورہ بالا حدیث میں خود اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں۔

پانچویں دلیل:

جابر رضی اللہ عنہ کی صحیح اور صریح حدیث آگے آ رہی ہے جس میں مذکور ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے تراویح آٹھ رکعات اور تین وتر ہی پڑھے ہیں، اور رکعات کی یہی تعداد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مذکورہ بالا حدیث میں بھی بیان کی ہے جو اس بات کی

[1] سنن الترمذی، ت شاکر (٢/٣٣٣) رقم (٤٧٠) وإسناده صحيح

دلیل ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے۔

چھٹی دلیل:

اللہ کے نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب تراویح کی نماز جماعت سے پڑھائی تھی تو تین دن پڑھانے کے بعد آپ نے جماعت سے تراویح پڑھانا چھوڑ دیا تھا اور ابن حبان کی روایت کے مطابق اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا:

«كرهتُ أن يكتب عليكم الوتر»[1]

''میں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ تم پر وتر فرض کر دیا جائے۔''

اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے تراویح کی نماز ہی کو وتر کہا ہے اور وتر یہ تہجد کی نماز ہی کے ساتھ ہے۔ یہ بھی اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے۔

ساتویں دلیل:

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ تراویح اور تہجد کو ایک ہی نماز سمجھتے تھے، اسی وجہ سے وہ جماعت کے ساتھ تراویح نہیں پڑھتے تھے، کیوں کہ عام طور سے لوگ اسے رات کے ابتدائی حصے میں پڑھتے تھے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ رات کے اخیر حصے میں پڑھنا اسے بہتر سمجھتے تھے، اس لیے آپ جماعت سے تراویح نہ پڑھ کر بعد میں رات کے اخیر حصے میں تنہا پڑھتے تھے اور اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے تھے:

"والتي ينامون عنها أفضل من التي يقومون، يريد آخر الليل، وكان الناس يقومون أوله"[2]

---

[1] صحيح ابن خزيمة (١٣٨/٢)

[2] صحيح البخاري (٤٥/٣، رقم: ٢٠١٠)

”(رات کا) وہ حصہ جس میں یہ لوگ سو جاتے ہیں، اس حصے سے بہتر اور افضل ہے جس میں یہ نماز پڑھتے ہیں۔ آپ کی مراد رات کے آخری حصے (کی فضیلت) سے تھی، کیوں کہ لوگ یہ نماز رات کے شروع ہی میں پڑھ لیتے تھے۔“

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تراویح اور تہجد کو ایک ہی نماز سمجھتے تھے۔ اگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نظر میں تراویح اور تہجد دو الگ الگ نمازیں ہوتیں تو آپ تراویح بھی مسجد میں لوگوں کے ساتھ پڑھتے اور رات کے آخری حصے میں تہجد بھی پڑھتے۔ نیز آپ تراویح کی نماز کو رات کے آخری حصے میں پڑھنے کو افضل نہ بتلاتے، بلکہ اس فضیلت کو تہجد ہی کی نماز کے لیے خاص سمجھتے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”يؤيده فِعل عُمرَ رضي الله عنه فإنَّه كان يصلِّي التراويحَ فيُ بيته في آخِرِ الليل، مع أنه كان أَمَرَهم أن يؤدُّوهَا بالجماعةِ فيُ المسجد، ومع ذلك لم يكن يدخُل فيها، وذلك لأنه كان يَعْلم أَنَّ عملَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم كان بأدائها في آخِرِ الليل، ثُمَّ نَبَّهَهُم عليه، قال: إنَّ الصلاةَ التي تقومون بها في أول الليل مفضولةٌ عمَّا لو كُنتم تقيمونَها في آخِرِ اللَّيل، فجعلَ الصلاةَ واحدةً“[1]

”تراویح اور تہجد کے ایک ہونے کی تائید عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فعل سے بھی ہوتی ہے، کیوں کہ آپ اپنے گھر میں رات کے اخیر میں تراویح پڑھتے

---

[1] فيض الباري شرح صحيح البخاري (٢٤/٤)

تھے، جب کہ آپ نے لوگوں کو مسجد میں جماعت سے پڑھنے کا حکم دیا تھا، اس کے باوجود بھی آپ ان کے ساتھ شامل نہ ہوتے تھے اور ایسا اس وجہ سے تھا، کیوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس نماز کو رات کے آخری حصے میں پڑھتے تھے۔ پھر آپ نے لوگوں کو اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا: جس نماز (تراویح) کو تم لوگ رات کے ابتدائی حصے میں پڑھتے ہوئے، وہ فضیلت میں کمتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اگر تم اسے رات کے آخری حصے میں پڑھو۔ چنانچہ یہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تراویح اور تہجد کو ایک ہی نماز قرار دیا ہے۔''

آٹھویں دلیل:

محدثین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو رمضان کے قیام یعنی تراویح اور تہجد دونوں طرح کے عناوین اور ابواب کے تحت ذکر کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین کی نظر میں تراویح اور تہجد ایک ہی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث میں تراویح اور تہجد ہی کی رکعات کا ذکر ہے۔ چنانچہ ملاحظہ کریں:

- امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ''کتاب صلاۃ التراویح'' میں اس حدیث کو درج کیا ہے اور اس پر ''فضل من قام رمضان'' یعنی تراویح پڑھنے کی فضیلت کا باب قائم کیا ہے۔[1]
- امام شمس الدین الکرمانی (المتوفی: ۷۸۶ھ) صحیح بخاری کی شرح میں اس باب کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: صحيح البخاري كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، رقم الحديث (٢٠١٣)

"(باب فضل من قام رمضان) اتفقوا على أن المراد بقيامه صلاة التراويح"[1]

"(قیامِ رمضان کی فضیلت کا بیان) اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد تراویح ہے۔"

- **امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو** "باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان" **یعنی رمضان میں تراویح کی رکعات کی تعداد کے بیان میں ذکر کیا ہے۔**[2]
- **امام ابوحنیفہ کے شاگرد محمد بن الحسن نے موطا محمد میں** "باب قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل" **یعنی رمضان میں تراویح پڑھنے اور اس کی فضیلت کے بیان کے تحت اسے ذکر کیا ہے۔**[3]
- **علامہ عبدالحی لکھنوی حنفی نے موطا محمد کے اس باب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:**

"قوله: قيام شهر رمضان، ويسمى التراويح"[4]

"یعنی ماہِ رمضان کے قیام کا نام تراویح ہے۔"

احناف کہتے ہیں کہ بعض محدثین نے اس حدیث کو "كتاب التهجد" **میں ذکر کیا ہے۔ عرض ہے کہ اس میں پریشان ہونے کی بات کیا ہے؟ جب تراویح اور تہجد**

---

1. الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري (۱۵۲/۹)
2. **دیکھیں**: سنن البيهقي، كتاب الصلاة، جماع أبواب صلاة التطوع، وقيام شهر رمضان، باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان، رقم الحديث (٤٢٨٥)
3. **دیکھیں**: موطأ محمد بن الحسن الشيباني: أبواب الصلاة، باب قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل، رقم الحديث (۲۳۹)
4. التعليق المُمَجَّد للكنوي (۳۵۱/۱)

دونوں ایک ہی نماز ہیں تو اس حدیث کا ذکر تراویح کے بیان میں بھی ہوگا اور تہجد کے بیان میں بھی ہوگا۔ چنانچہ محدثین نے اگر تہجد کے بیان میں اسے ذکر کیا ہے تو تراویح کے بیان میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر حوالے دیے گئے ہیں۔

مولانا طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں:

''اگر حدیثِ عائشہ کا تذکرہ قیامِ رمضان کے تحت کیا گیا ہے تو اس سے یہ استدلال کرنا درست نہیں ہے کہ مصنف کے خیال میں لازماً اس روایت کا تراویح ہی سے تعلق ہے، اس لیے کہ تہجد کی نماز بھی رمضان میں پڑھی جاتی ہے اور اس بنیاد پر قیامِ رمضان کے تحت اس کا ذکر بھی غیر مناسب نہیں ہے۔''[1]

عرض ہے کہ جن محدثین نے قیامِ رمضان کے تحت اس حدیث کا ذکر کیا ہے، ان محدثین نے قیامِ رمضان سے تہجد نہیں، بلکہ تراویح ہی مراد لی ہے، بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے تو صراحتاً تراویح ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

امام بیہقی نے قیامِ رمضان کا جو باب قائم کیا ہے اس کے تحت بیس رکعات والی ضعیف روایات بھی درج کی ہیں، جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ انھوں نے قیامِ رمضان سے تراویح ہی مراد لیا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ نے قیامِ رمضان کے تحت وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت تراویح پڑھائی تھی۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے قیامِ رمضان بول کر تہجد نہیں، بلکہ تراویح ہی کو مراد لیا ہے، بلکہ حنفی عالم علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح تراویح سے کی ہے، کما مضی۔ اس لیے طاہر گیاوی

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٥٠)

صاحب کی تاویل کسی کام کی نہیں ہے۔

نویں دلیل:

اللہ کے نبی ﷺ کے حوالے سے ایک موضوع اورمن گھڑت روایت نقل کی جاتی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے بیس رکعات تراویح پڑھی۔ اس حدیث کو مردود ثابت کرتے ہوئے بہت سارے محدثین و اہلِ علم نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف قرار دیا ہے، مثلاً:

- امام بوصیری رحمہ اللہ۔ (اتحاف الخيرة المهرة للبوصيري: ٣٨٤/٢)
- حافظ ابن حجر رحمہ اللہ۔ (فتح الباري لابن حجر: ٢٥٤/٤)
- امام زیلعی الحنفی رحمہ اللہ۔ (نصب الراية للزيلعي: ١٥٣/٢)
- امام سیوطی رحمہ اللہ۔ (الحاوي للفتاوى: ٤١٤/١)
- علامہ عینی الحنفی رحمہ اللہ۔ (عمدة القاري: ١٨٢/١١)
- امام ابن الہمام الحنفی۔ (فتح القدير للكمال ابن الهمام: ٤٦٧/١)
- ابو الطیب محمد بن عبد القادر سندی حنفی۔ (شرح الترمذي: ٤٢٣/١)[1]

محدثین و اہلِ علم کی جانب سے بیس رکعات تراویح والی روایت کے خلاف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا پیش کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث تراویح سے متعلق ہے اور تراویح وتہجد دونوں ایک ہی نماز ہے۔

دسویں دلیل:

جو تراویح پڑھ لے، اہلِ علم نے اسے تہجد پڑھنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیری حنفی لکھتے ہیں:

---

[1] ان تمام اہلِ علم کے اقوال آگے آرہے ہیں۔

"ثُمَّ إنَّ محمدَ بن نَصْر وَضَعَ عدَّة تراجِمَ في قيام الليل، وكتب أنَّ بعض السَّلَف ذهبوا إلى مَنْع التهجُّد لِمَن صلَّى التروايح"[1]

"نیز محمد بن نصر نے قیام اللیل کے بارے میں کئی ابواب قائم کیے ہیں اور لکھا ہے کہ بعض سلف نے اس شخص کو تہجد پڑھنے سے منع کیا ہے جس نے تراویح پڑھ لی ہے۔"

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں ایک ہی نماز ہے۔

ان دلائل سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں ایک ہی نماز ہے۔ تراویح اور تہجد کے الگ الگ ہونے کا نظریہ دراصل صحیح بخاری کی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر عمل کرنے سے بچنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ متقدمین میں سے کسی ایک بھی عالم نے یہ نہیں کہا ہے کہ تراویح اور تہجد الگ الگ نماز ہے۔ احناف میں علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی صاف طور پر اعلان کیا ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں ایک ہی نماز ہے، بلکہ حنفی لوگ تراویح اور تہجد کے الگ الگ ہونے کے لیے جتنے بھی دلائل دیتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ تراویح اور تہجد کی الگ الگ صفات گناتے اور اسی کو دلیل بناتے ہیں کہ یہ الگ الگ نمازیں ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری حنفی اس بے بنیاد دلیل کا رد کرتے ہوئے اور تراویح و تہجد کو ایک ہی ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال عامَّة العلماء: إنَّ التراويحَ وصلاةَ الليل نوعان

---

[1] فيض الباري شرح صحيح البخاري (٢٤/٤)

مختلفان، والمختار عندي أنهما واحدٌ وإن اختلفت صفتاهما، كعدم المواظبة على التراويح، وأدائها بالجماعة، وأدائها في أول اللَّيل تارةً، وإيصالها إلى السَّحَر أُخرى، بخلاف التهجُّد فإنه كان في آخِر الليل ولم تكن فيه الجماعة، وجَعْلُ اختلافِ الصفات دليلا على اختلاف نوعيهما ليس بجيِّدٍ عندي، بل كانت تلك صلاةً واحدةً، إذا تقدَّمت سُمِّيت باسم التراويح، وإذا تأخَّرت سُمِّيت باسم التهجُّد، ولا بِدْعَ في تسميتها باسمين عند تغايُرِ الوَصْفَين، فإنَّه لا حَجْر في التغاير الاسمي إذا اجتمعت عليه الأُمةُ، وإنَّما يثبُتُ تغايُرُ النَّوْعَيْن إذا ثَبَت عن النبيِّ ﷺ أنه صلى التهجُّدَ مع إقامَتِهِ بالتراوِيحِ"[1]

''عام طور سے (ہمارے حنفی) علما نے کہا ہے کہ تراویح اور تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ دونوں ایک ہی نماز ہیں اگرچہ ان دونوں کی صفات الگ الگ ہیں۔مثلاً تراویح کی مواظبت ہوتی ہے، اسے جماعت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اسے رات کے ابتدائی حصے میں پڑھا جاتا ہے اور کبھی کبھی سحری تک پڑھا جاتا ہے۔لیکن اس کے برخلاف تہجد کو رات کے آخری حصے میں پڑھا جاتا ہے اور اس میں جماعت نہیں ہوتی ہے۔ صفات کے الگ الگ ہونے کو ان دونوں نمازوں کے الگ الگ ہونے کی دلیل بنانا میرے نزدیک بہتر نہیں ہے، بلکہ تراویح اور تہجد یہ

[1] فيض الباري على صحيح البخاري (٥٦٧/٢)

دونوں ایک ہی نماز ہیں۔ جب اسے پہلے پڑھا جاتا ہے تو اسے تراویح کا نام دیا جاتا ہے اور جب اسے تاخیر سے پڑھا جاتا ہے تو اسے تہجد کا نام دیا جاتا ہے۔ صفات کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے اسے دو نام سے موسوم کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، کیوں کہ اوصاف کے مختلف ہونے کے باعث مختلف نام رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ جب امت کا اتفاق ہو جائے تو نام کے اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ یہ دو الگ الگ نمازیں اس وقت ثابت ہوتیں جب اللہ کے نبی ﷺ سے یہ ثابت ہوتیں کہ آپ نے تراویح پڑھنے کے ساتھ ساتھ تہجد بھی پڑھی ہے۔''

اس عبارت میں علامہ انور شاہ کشمیری نے یہ بات واضح کردی ہے کہ محض صفات کے الگ الگ ہونے سے نوعیت کی علاحدگی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ نیز گذشتہ سطور میں ہم بھی واضح کر چکے ہیں کہ ظہر کی نماز حضر میں چار رکعات فرض ہے، لیکن سفر میں قصر کرتے ہوئے صرف دو رکعات فرض ہے۔ اب دیکھیے ان دونوں کی صفات میں کتنا فرق ہو گیا۔

لیکن صفات کی اس تبدیلی کو ہم اس بات کی دلیل نہیں بنا سکتے کہ حضر کی ظہر اور سفر کی ظہر یہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔

الغرض بعض حالات میں اگر کسی نماز کی صفات بدل گئیں تو محض بعض حالات میں بدلی ہوئی صفات کی بنا پر اسے الگ نماز نہیں کہا جا سکتا۔

تنبیہ: یاد رہے کہ اس حدیث میں جو یہ ذکر ہے:

"يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسَئلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسَئلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ"

”آپ ﷺ پہلی چار رکعت پڑھتے، تم ان کی حسن وخوبی اور طول کا حال نہ پوچھو، پھر چار رکعت پڑھتے، ان کی بھی حسن وخوبی اور طول کا حال نہ پوچھو۔“

تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ چار چار رکعات ایک سلام سے پڑھتے تھے، کیوں کہ یہاں چار رکعات کے بعد سلام پھیرنے کی صراحت نہیں ہے، لہٰذا یہاں مطلب صرف یہ ہے کہ چار رکعات پڑھ کر ٹھہرتے تھے اور سلام ہر دو رکعت پر ہی پھیرتے تھے، جیسا کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی نے دوسری حدیث میں صراحت کر دی ہے جو آگے آ رہی ہے۔

تہجد اور تراویح کی نماز میں فرق کے حنفی دلائل اور ان کا جائزہ

تہجد اور تراویح کی نماز کو الگ الگ ثابت کرنے کے لیے سب سے زیادہ زور طاہر گیاوی صاحب نے لگایا ہے اور بزعم خویش کل پانچ دلائل اس کے حق میں دیے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے تمام دلائل کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

پہلی دلیل: تہجد کی قضا اور تراویح کی عدمِ قضا:

مولانا طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں:

”تراویح اور تہجد دونوں کے علاحدہ علاحدہ دو نماز ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دونوں نمازوں کے احکام بھی جدا ہیں، مثلاً: تراویح کی نماز اگر کوئی شخص وقت پر ادا نہ کر سکا تو دن کے وقت اس کی قضا نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اس کی قضا ثابت نہیں ہے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔“[1]

اس کے بعد طاہر گیاوی صاحب نے اپنی فقہ حنفی کی کتاب ردمختار کی عبارت

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٣٥)

پیش کی ہے اور خواہ مخواہ ایک حنفی موقف کو اہلِ حدیث پر بھی مسلط کر دیا کہ اہلِ حدیث کا بھی یہی ماننا ہے کہ تراویح کی قضا نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ اہلِ حدیث کیا، خود احناف میں بھی بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ کسی کی تراویح چھوٹ گئی تو وہ بعد میں تنہا اس کی قضا کر سکتا ہے، چنانچہ موصوف نے جہاں سے نقل کیا ہے وہیں یہ بھی مذکور ہے:

”قيل: يقضيها وحده ما لم يدخل وقت تراويح أخرى، وقيل: ما لم يمض الشهر“[1]

”یہ بھی کہا گیا ہے کہ تنہا قضا کر سکتا ہے جب تک کہ دوسری تراویح کا وقت نہ آ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تک ماہِ رمضان ختم نہ ہو جائے۔“

یعنی خود احناف ہی اس بات پر متفق نہیں ہیں اور مولانا گیاوی صاحب بلا تامل اسے اہلِ حدیث کی طرف منسوب کر رہے ہیں، بہر حال موصوف نے مذکورہ بات کہنے کے بعد تہجد کے قضا کی دلیل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث پیش کی ہے جو ماقبل میں گزر چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز چھوٹ جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن میں بارہ رکعات پڑھتے تھے۔

طاہر گیاوی صاحب کے اس مفروضے کا جواب اس قدر آسان ہے کہ خود طاہر گیاوی صاحب کو بھی اس کا احساس ہے، اس لیے موصوف اہلِ حدیث کی طرف سے خود ہی جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اگر اسی روایت کو دلیل بنا کر کوئی غیر مقلد صاحب یہ شگوفہ چھوڑیں کہ جب ہمارے نزدیک تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی نماز ہے تو تہجد کی قضا کے ثابت ہو جانے کے بعد تراویح کی قضا کا جواز بھی از خود ثابت ہو گیا

[1] رد المحتار على الدر المختار (٤٥/٢) وانظر الموسوعة الفقهية الكويتية (١٤٩/٢٧)

تو عرض یہ ہے کہ اس روایت سے جس تہجد یا تراویح کی قضا ثابت ہو گی وہ بارہ رکعت ہے اور آپ کے نزدیک آٹھ رکعت سے زیادہ تراویح یا تہجد آنحضرت ﷺ سے ثابت ہی نہیں ہے۔''[1]

عرض ہے کہ طاہر گیاوی صاحب نے جواب تو ہماری طرف سے خود ہی دے دیا اس لیے ہمیں جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ موصوف نے جو جواب الجواب پیش کیا ہے اس کا جائزہ بھی ہم پیش کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ وہی بات ہے جسے ماقبل میں بھی ہم ان کی دوسری کتاب سے نقل کر چکے ہیں اور وہاں جو جواب دیا گیا ہے وہی جواب یہاں بھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قضا اصل گیارہ رکعات ہی کی ہوتی تھی، لیکن چونکہ یہ قضا دن میں ہوتی تھی اور دن میں وتر نہیں ہے، اس لیے نبی اکرم ﷺ اس گیارہ رکعات میں ایک رکعت مزید شامل کر کے اسے جفت بنا لیتے تھے تو یہ ایک رکعت دن کی وجہ سے اضافی ہوتی تھی، اس کا رات والی نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[2]

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ قضا والی نماز کی بھی اصلاً تعداد وہی ہے جو تراویح کی نماز کی ہے تو یہ دلیل طاہر گیاوی صاحب ہی پر الٹ کر اس بات کی دلیل بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نماز ہیں۔

طاہر گیاوی صاحب نے اپنی اس دلیل کو سب سے مضبوط دلیل کہا تھا، حالانکہ اندر سے اس کی کمزوری پر انھیں اس قدر یقین تھا کہ خود ہی اہلِ حدیث کی طرف سے اس کا جواب بھی دے ڈالا، بہرحال موصوف کے دعوے کے مطابق یہ سب سے بڑی دلیل تھی جس کی حقیقت بیان کی جا چکی ہے۔

---

[1] ایضاً۔

[2] مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب کا صفحہ (۴۲-۴۵) دیکھیں۔

دوسری دلیل: بیانِ فرضیت کی تعبیر سے تفریق پر استدلال:

طاہر گیاوی صاحب کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ تہجد کی نماز شروع میں فرض تھی، بعد میں اس کی فرضیت منسوخ ہوگئی تھی، لہٰذا رمضان والی جس نماز کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرض ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا وہ کوئی الگ نماز ہونی چاہیے، ورنہ نبی ﷺ یہ نہ فرماتے کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہوجائے، بلکہ یہ فرماتے کہ کہیں یہ نماز دوبارہ تم پر فرض نہ ہوجائے۔

گیاوی صاحب کے الفاظ ہیں:

''آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خشيت أن تفرض عليكم صلاة الليل'' یعنی مجھے صلاۃ اللیل کے تم پر فرض ہوجانے کا ڈر تھا۔ تو اگر یہ صلاۃ اللیل وہی نمازِ تہجد ہی تھی جس کی فرضیت ایک مرتبہ منسوخ ہو چکی تھی تو آپ کو یوں فرمانا چاہیے تھا: ''خشيت أن تعاد عليكم صلاة الليل فريضة'' مجھے ڈر تھا کہ تم پر صلاۃ اللیل دوبارہ فرض کر دی جائے گی۔''[1]

جواباً عرض ہے:

أولاً: محض اس تعبیر پر تفریق کی عمارت کھڑی کرنا انتہائی نامعقول بات ہے، کیوں کہ اس تعبیر میں اصل مقصود کے بیان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اس لیے کہ اصل مقصود اس نماز کی فرضیت کو بتلانا ہے نہ کہ اس نماز کی ابتدا سے لے کر اب تک کی روداد بتلانا مقصود ہے، لہٰذا فرضیت بتلانے کے لیے اس بات کی قطعی حاجت نہیں ہے کہ سابقہ فرضیت کا بھی حوالہ دیا جائے، لہٰذا یہ تعبیر گیاوی صاحب کی تفریق کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی۔

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٥٦)

البتہ اس نماز کی سابقہ فرضیت اس بات کی دلیل بن سکتی ہے کہ بعد میں جس نماز یعنی تراویح سے متعلق فرضیت کا اندیشہ نبی ﷺ کو لاحق ہوا، وہ وہی نماز تھی جو پہلے فرض ہو چکی تھی اور یہ چیز من جملہ ان اسباب میں سے تھی جن کی بنا پر اللہ کے نبی ﷺ نے نمازِ تراویح کی فرضیت کا اندیشہ محسوس کیا۔ یوں یہ دلیل بھی خود ظاہر گیاوی صاحب پر اُلٹ گئی اور اسی نے ثبوت فراہم کر دیا کہ یہ دونوں ایک ہی نماز ہیں۔

ثانیاً: بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ ایک ہی نماز کی دوبارہ فرضیت کا اندیشہ ظاہر کرنے کے لیے لازم تھا کہ محض فرضیت کی بات کہنے کے بجائے، اعادہ فرضیت کی بات کہی جاتی، تو بھی اس مہمل گوئی کے لیے ضروری ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نمازِ تراویح کی جس نوعیت سے متعلق فرضیت کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، پہلی فرضیت بھی عین اسی نوعیت کی رہی ہو، جب کہ روایات کے سیاق میں اس کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

یاد رہے کہ صلاۃ الیل کی پہلی فرضیت میں نہ تو ایک جماعت کے ساتھ یہ فرض تھی اور نہ ہی اس کے لیے مسجد میں حاضر ہونا فرض تھا، بلکہ محض اس کو ادا کرنا فرض تھا، خواہ وہ کہیں بھی ادا کی جائے، لیکن تراویح کے بارے میں جس فرضیت کا اندیشہ تھا وہ یہ تھا کہ کہیں مسجد میں ایک ہی جماعت کے ساتھ اس کو ادا کرنا فرض نہ کر دیا جائے۔

اسی لیے اللہ کے نبی ﷺ نے جو چیز ترک کی تھی، وہ صرف مسجد میں اس نماز کو ایک ہی جماعت کے ساتھ ادا کرنا تھا، لیکن فرداً یا متفرق جماعت کے ساتھ مسجد یا مسجد کے باہر اس کو ادا کرنے سے اللہ کے نبی ﷺ نے ممانعت نہیں فرمائی، بلکہ خود بھی یہ نماز سابقہ طرز پر پڑھتے رہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ان کے سابقہ عمل پر باقی رکھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بار نبی اکرم ﷺ کو ایک خاص کیفیت (مسجد

میں ایک ہی جماعت کے ساتھ ادا کرنے) میں اس کی فرضیت کا اندیشہ تھا، نہ کہ مطلقاً اس کی فرضیت کا اندیشہ تھا، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ سرے سے یہ نماز ہی پڑھنا بند کر دیتے یا صحابہ کو ادا کرنے سے مطلقاً روک دیتے، لیکن نبی ﷺ نے ایک خاص کیفیت (مسجد میں ایک ہی جماعت کے ساتھ ادا کرنے) کو ترک کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے باز رکھا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خاص اسی کیفیت کے فرض ہونے کا نبی اکرم ﷺ کو اندیشہ تھا، لہٰذا جب پہلی فرضیت الگ کیفیت کی تھی اور دوبارہ جس فرضیت کا اندیشہ تھا اس کی کیفیت الگ تھی تو سابقہ فرضیت کے اعادے کی تعبیر کو لازم قرار دینا انتہائی فضول، اور بے محل بات ہے۔

واضح رہے کہ ایک شبہے کے جوابات میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جس جواب کو سب سے قوی قرار دیا ہے وہ یہ ہے:

"يحتمل أن يكون المخوف افتراض قيام الليل بمعنى جعل التهجد في المسجد جماعة شرطا في صحة التنفل بالليل"[1]

"اس بات کا احتمال ہے کہ نبی ﷺ نے قیام اللیل کی جس فرضیت کا اندیشہ محسوس کیا تھا، وہ اس معنی میں تھا کہ قیام اللیل کی صحت کے لیے یہ شرط نہ لگا دی جائے کہ اسے مسجد ہی میں جماعت کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس عبارت میں بھی یہ بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو مطلق فرضیت کا اندیشہ نہیں تھا، بلکہ ایک خاص کیفیت میں اس نماز کے فرض ہونے کا

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (١٤/٣)

اندیشہ تھا۔ بلکہ خود طاہر گیاوی صاحب نے اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے:

''دوسری تمام روایتوں میں وتر کی فرضیت کے خوف کے بجائے نمازِ تراویح باجماعت کی فرضیت کے خوف کا ذکر موجود ہے۔''[1]

ملاحظہ فرمائیں کہ گیاوی صاحب نے خود اعلان کر دیا کہ ''نمازِ تراویح باجماعت کی فرضیت کے خوف کا ذکر موجود ہے۔'' لہٰذا جب آپ ﷺ الگ کیفیت میں اس کی فرضیت کا خوف محسوس کر رہے تھے تو اعادۂ فرضیت کی تعبیر بے معنی ہے، اس تفصیل سے مولانا طاہر گیاوی صاحب کی دوسری دلیل بھی کسی کام کی نہیں رہ جاتی۔

تیسری دلیل: ایک ضعیف روایت سے استدلال:

مولانا طاہر گیاوی صاحب ''تیسری دلیل'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

''تراویح اور تہجد میں مغایرت کی ایک تیسری دلیل یہ ہے کہ تہجد کی نماز تو آنخضرت ﷺ اور صحابہ کرام ہمیشہ ہی پڑھا کرتے تھے، پھر جن تین راتوں کی نماز کو آنخضرت ﷺ نے پڑھایا تھا، اگر یہ وہی نمازِ تہجد ہوتی تو یہ نہ کوئی نئی نماز تھی اور نہ کوئی نیا حادثہ ہی تھا کہ واقعہ کو صحابہ کرام اس طرح نقل فرماتے۔''[2]

عرض ہے کہ یہ نماز تو یقیناً وہی تھی، لیکن ان تین دنوں میں اس کو ادا کرنے کی کیفیت الگ تھی۔ یہی کیفیت والی بات نئی تھی اور یہی نیا حادثہ تھا اس لیے صحابہ کرام نے اسے اس طرح نقل کیا۔

یاد رہے کہ اہلِ حدیث حضرات کا قطعاً یہ دعویٰ نہیں کہ تراویح اور تہجد کی

---

[1] أحسن التنقیح (ص: ۲۱۵)

[2] احسن التنقیح (ص: ۲۵۷)

کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اہلِ حدیث دونوں کی کیفیت میں فرق مانتے ہیں، لیکن دونوں نمازوں کو اصلاً ایک ہی نماز تسلیم کرتے ہیں، مثلاً: جس طرح اہلِ حدیث ظہر کی حضر والی نماز اور ظہر کی قصر والی نماز میں فرق مانتے ہیں، لیکن دونوں کو ایک ہی مانتے ہیں۔

گیاوی صاحب آگے اہلِ حدیث عالم کی کتاب سے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

"خشيت أن يفرض عليكم قيام هذا الشهر"[1] "مجھے ڈر ہوا کہ اس مہینے کا قیام تم پر فرض نہ کر دیا جائے۔" اس طریقِ تعبیر سے یہ چیز اظہر من الشّمس ہے کہ یہ نماز خاص اسی مہینے کی نماز تھی جس کی فرضیت کا آپ کو اندیشہ تھا۔ اگر یہ نماز سال کے دوسرے مہینے میں بھی پڑھی جانے والی نماز ہوتی تو اس کو اس مہینے کی نماز کے نام سے یاد کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ "قيام هذا الشهر"تو وہی نماز ہوگی جس کو اس مہینے سے خصوصی تعلق ہو.... الخ۔"[2]

عرض ہے:

أولاً: یہ روایت ضعیف ہے، اس کی پوری سند اس طرح ہے:

"حدثنا يزيد، أخبرنا سفيان، يعني ابن حسين، عن الزهري، عن عروة، عن عائشة"[3]

---

[1] رکعاتِ تراویح کی صحیح تعداد (ص:۲۲)

[2] احسن التنقيح (ص: ۲۵۷)

[3] مسند أحمد ط الميمنية (۱۸۲/۶)

اس سند میں سفیان بن حسین، زہری سے روایت کر رہے ہیں اور سفیان بن حسین جب زہری سے روایت کرتے ہیں تو ان کی روایت ضعیف ہوتی ہے، جیسا کہ متعدد ائمۂ فن نے صراحت کی ہے، مثلاً:

- امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"ثقة في غير حديث الزهري"[1]

"یہ زہری کی حدیث کے علاوہ دیگر احادیث میں ثقہ ہے۔"

- امام ابن عدی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۶۵ھ) فرماتے ہیں:

"وهو في غير الزهري صالح الحديث كما قال ابن معين، ومن الزهري يروي عنه أشياء خالف فيها الناس من باب المتون ومن الأسانيد"[2]

"یہ زہری کے علاوہ دیگر رواۃ سے روایت کرنے میں صالح ہے، جیسا کہ ابن معین نے کہا ہے۔ یہ زہری سے ایسی روایات نقل کرتا ہے جن کے متون اور اسانید میں وہ دیگر رواۃ کی مخالفت کرتا ہے۔"

اس روایت کو بھی سفیان نے زہری ہی سے سنا ہے اور مذکورہ الفاظ نقل کرنے میں اس نے دیگر رواۃ کی مخالفت کی ہے، کیوں کہ اس واقعہ کے کسی بھی راوی نے مذکورہ بالا الفاظ نقل نہیں کیے، لہٰذا اس روایت کے ضعیف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا۔

ثانیاً: اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو یہ روایت تراویح اور تہجد کے فرق ہونے پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کے برعکس تراویح اور تہجد کے ایک ہونے پر

---

[1] الثقات لابن حبان، ط العثمانية (٤٠٤/٦)

[2] الكامل لابن عدي، ت عادل وعلي (٤٧٧/٤)

دلالت کرتی ہے، کیوں کہ اس حدیث میں "قیام هذا الشهر" یعنی اس ماہ کی نماز کہا گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ نماز ہر ماہ میں ہوتی ہے، جبھی تو رمضان میں اس کے لیے اس ماہ کی نماز کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ جیسے کہا جائے کہ اس ماہ کا چاند، تو اس کا صاف مطلب ہے کہ ہر ماہ میں چاند ہوتا ہے، ورنہ کسی ایک ماہ کے ساتھ اسے مقید کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد طاہر گیاوی صاحب نے علامہ ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی ایک تحریر پیش کر کے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی تراویح اور تہجد کی نماز کو الگ الگ نماز سمجھتے تھے، حالانکہ موصوف کی نقل کردہ پوری تحریر میں تراویح اور تہجد کی الگ الگ کیفیت بتلائی گئی ہے، لیکن انھیں دو الگ نماز نہیں کہا گیا۔ اور کیفیت کے الگ الگ ہونے سے نماز کا الگ الگ ہونا لازم نہیں آتا جیسا کہ علامہ انور شاہ کشمیری کی زبانی اس کی وضاحت ہو چکی ہے، اور مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

چوتھی دلیل: صحابہ و تابعین کی طرف غلط انتساب:

مولانا طاہر گیاوی صاحب فرماتے ہیں:

"تہجد اور تراویح کے دو مستقل نماز ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام سے متعلق قرائن اور علما کی تصریحات سے یہ بھی ثابت ہے کہ لوگ تراویح کے ساتھ تہجد بھی الگ سے پڑھا کرتے تھے۔"[1]

عرض ہے کہ تراویح کے ساتھ تہجد پڑھنا ایک واقعہ ہوگا اور واقعہ کا ثبوت قرائن یا علما کی تصریحات سے نہیں، بلکہ صحیح روایت سے ہوتا ہے۔ مولانا گیاوی صاحب کو چاہیے کہ اپنے اس دعوے پر کوئی صحیح روایت پیش کریں۔ آگے گیاوی صاحب نے

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٦٤)

تابعین کے حوالے سے دو روایات بھی پیش کی ہیں، آیئے انھیں بھی دیکھ لیتے ہیں۔

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

1 ”حدثنا أبو الأحوص، عن مغيرة، عن إبراهيم، قال: كان المتهجدون يصلون في جانب المسجد، والإمام يصلي بالناس في شهر رمضان“[1]

2 ”حدثنا أبو خالد الأحمر، عن الأعمش، عن إبراهيم، قال: كان الإمام يصلي بالناس في المسجد، والمتهجدون يصلون في نواحي المسجد لأنفسهم“[2]

مذکورہ بالا دونوں روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے بعض لوگوں کا عمل نقل کیا ہے کہ وہ بوقتِ جماعتِ تراویح، مسجد کے گوشے میں تہجد پڑھتے تھے۔

عرض ہے کہ اول تو اس میں یہ صراحت نہیں کہ یہ عمل صحابہ کا تھا۔ دوسرے اس میں یہ صراحت ہے کہ یہ تہجد پڑھنے والے جماعت کے ساتھ تراویح نہیں پڑھتے تھے، کیوں کہ عین جماعت ہی کے وقت یہ تراویح پڑھ رہے ہوتے تھے اور خود طاہر گیاوی صاحب یہ اعتراف کرتے ہوئے بڑے دردناک لہجے میں فرماتے ہیں:

”ان روایتوں سے یہ ثابت تو نہ ہو سکا کہ ایک ہی شخص نے تراویح اور تہجد دونوں پڑھی تھی، مگر اتنا ضرور ثابت ہوا کہ تراویح اور تہجد دونوں کو الگ الگ دو نماز اس وقت بھی لوگ سمجھتے تھے۔“[3]

عرض ہے کہ الگ الگ نام ان نمازوں کی الگ الگ کیفیت کی بنا پر ہے نہ کہ

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة، ت الشثري (١٦٤/٥)

[2] مصنف ابن أبي شيبة، ت الشثري (١٦٥/٥) دیکھیں: أحسن التنقيح (ص: ٢٤٦)

[3] أحسن التنقيح (ص: ٢٦٥)

ان دونوں کے مستقل الگ نماز ہونے کے سبب، یعنی یہ نماز ایک ہی ہے۔ اگر اسے جماعت کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا نام تراویح ہوگا اور فرداً پڑھا جائے تو اس کا نام تہجد ہوگا۔

اس طرح یہ آثار تو الٹا اس بات پر دلیل ہیں کہ یہ حضرات تراویح اور تہجد دونوں کو ایک ہی سمجھتے تھے، اسی لیے تراویح پڑھنے والے تہجد نہیں پڑھتے تھے اور تہجد پڑھنے والے تراویح نہیں پڑھتے تھے۔

تابعین کے مذکورہ بالا غیر متعلق آثار پیش کرنے کے بعد آگے گیاوی صاحب نے صحابیِ رسول سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک اثر امام مروزی کی کتاب سے بے سند نقل کیا ہے۔[1]

عرض ہے کہ اس کی سند مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ چنانچہ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا عباد، عن سعيد، عن قتادة، عن أنس قال: لا بأس به، إنما يرجعون إلى خير يرجونه ويبرؤون من شر يخافونه"[2]

"انس رضی اللہ عنہ نے (تعقیب) کے بارے میں کہا: اس میں حرج نہیں، لوگ خیر کی امید سے واپس آتے ہیں اور شر کے خوف سے اس سے بچتے ہیں۔"

اس کی سند میں قتادہ ہیں جو مشہور مدلس ہیں اور روایت عن سے ہے، لہٰذا یہ سند ضعیف ہے، مزید یہ کہ اس سے اصل تہجد نہیں، بلکہ عام نفلی نماز مراد ہے جو خارج از بحث ہے۔

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٦٥)

[2] مصنف ابن أبي شيبة، ت الشثري (١٦٦/٥)

پانچویں دلیل: تراویح کے بعد نوافل پڑھنے سے استدلال:

پانچویں دلیل کے طور مولانا طاہر گیاوی صاحب نے جو کچھ رقم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ بعض اہلِ علم نے اس پر بحث کی ہے کہ تراویح ادا کرنے کے بعد نفل پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ قدیم دور ہی سے تراویح اور تہجد میں فرق کا نظریہ موجود ہے۔[1]

جواباً عرض ہے کہ اس بحث میں بھی بعد میں ادا کی جانے والی نماز کا تعلق یا تو عام نوافل سے ہے جو خارج از بحث ہے یا اصل صلاۃ اللیل ہی سے ہے۔ صرف کیفیت بدل جانے سے اسے الگ الگ نام سے موسوم کیا گیا ہے، مثلاً اسی ضمن میں موصوف نے فقہ حنبلی سے ایک اقتباس نقل کیا ہے:

"ثم التراويح وهي عشرون ركعة يقوم بها في رمضان في جماعة ويوتر بعدها في الجماعة فإن كان تهجد جعل الوتر بعده"[2]

"تراویح بیس رکعت ہے جسے رمضان میں جماعت کے ساتھ پڑھے گا اور آخر میں وتر پڑھے گا، لیکن اگر تراویح کے بعد اسے تہجد پڑھنا ہو تو وہ وتر تہجد کے بعد پڑھے گا۔"

اس میں جس باجماعت نماز کو تراویح کہا گیا ہے اور اس کے بعد جس نماز کو تہجد کہا گیا ہے، یہ دونوں ایک ہی نماز ہیں، بس جماعت کی کیفیت کے سبب اسے تراویح سے موسوم کیا ہے اور جماعت کے بعد فرداً پڑھنے کے سبب اسے تہجد سے

---

[1] ماحصل از أحسن التنقيح (ص: ٢٧٠)

[2] أحسن التنقيح (ص: ٢٧٠)

موسوم کر دیا ہے۔

یعنی یہ کیفیت کا فرق ہے، نماز کا فرق نہیں۔ یاد رہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تراویح کا کوئی معین عدد نہیں ہے، بلکہ وہ جتنی بھی چاہے پڑھ سکتا ہے، جیسا کہ آگے اس کا حوالہ آرہا ہے۔

یہ وہ پانچ بڑی دلیلیں تھیں جنھیں مولانا طاہر گیاوی صاحب نے بہت نمایاں کر کے پیش کیا تھا، بلکہ باقاعدہ ہر دلیل کو ہیڈنگ لگا کر پیش کیا تھا، گذشتہ صفحات میں ان ساری دلیلوں کا مفصل جواب دیا جا چکا ہے، اس کے علاوہ جابجا موصوف نے کچھ امور کو بھی فرق کی دلیل بنایا ہے، اسی طرح دیگر احناف بھی اس ضمن میں کچھ اور باتیں پیش کرتے ہیں، اب آگے ہم ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

دونوں نمازوں کی کیفیت کے فرق سے استدلال

احناف کی یہی سب سے مشہور دلیل ہے کہ دونوں نمازوں کی کیفیت میں فرق ہے، پھر ان فروق کو گناتے ہوئے ہر فرق کو یہ حضرات الگ الگ دلیل کے طور پر گناتے ہیں، اسی طرح مزعومہ دلائل کی اچھی خاصی قطار لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ ان سارے دلائل کو ایک جملہ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دونوں نمازوں کی کیفیت میں فرق ہے۔ اس لیے یہ بے شمار دلائل نہیں بلکہ ایک ہی دلیل ہے اور وہ ہے دونوں نمازوں کی کیفیت کا الگ الگ ہونا۔

جواباً عرض ہے کہ یہ بات محلِ نزاع ہی نہیں ہے کہ دونوں نمازوں کی کیفیت میں فرق ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کو بھی یہ تسلیم ہے کہ دونوں نمازوں کی کیفیت میں فرق ہے، لیکن کیفیت کا فرق نماز کے فرق کی دلیل نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ماقبل میں

ہو چکی ہے اور تائید میں علامہ انور شاہ کشمیری حنفی کی عبارت بھی نقل کی جا چکی ہے۔

وتر سے قبل سونے سے متعلق سوال سے استدلال:

مولانا طاہر گیاوی صاحب کسی بزرگ کا اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابو سلمہ نے اسی سلسلۂ استفسار میں ام المومنین سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا آنحضرت ﷺ وتر سے پہلے سو جاتے تھے تو ام المومنین نے جواب دیا: میں نے آنحضرت سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں، لیکن دل بیدار رہتا ہے (یعنی سو جاتا ہوں۔ بخاری ومسلم) اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ سوال تہجد ہی کے متعلق تھا، کیوں کہ حضرت رسالتِ مآب ﷺ اور آپ کے صحابہ کا تہجد کے بعد وتر سے پہلے تو محوِ خواب ہونا ثابت ہے، تراویح اور وتر کے درمیان سونا ثابت نہیں ہے۔''[1]

بریکٹ والے الفاظ ہماری طرف سے نہیں، بلکہ اقتباس ہی کا حصہ ہیں اور اس میں حوالہ بخاری ومسلم کا دیا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ بخاری ومسلم میں ہمیں اس سلسلے کی کوئی بھی حدیث نہیں مل سکی جس میں سائل ابو سلمہ نے وتر سے قبل سونے سے متعلق بھی سوال کیا ہو! نا معلوم گیاوی صاحب کے بزرگ مرحوم نے یہ بات کہاں سے اخذ کی ہے اور حوالہ بخاری ومسلم کا دے دیا ہے، پھر اسی پر استدلال کی عمارت کھڑی کر دی ہے!

قارئین بخاری ومسلم سے یہ حدیث نکال کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سائل ابو سلمہ نے وتر سے متعلق ایسا کوئی سوال کیا ہی نہیں، بلکہ انھوں نے صرف صلاۃِ رمضان

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٤٩) نقلًا عن التوضيح عن ركعات التراويح (ص: ٣٢٠)

کے بارے میں پوچھا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں رمضان کے ساتھ ساتھ غیر رمضان کی صلاۃ اللیل کی کیفیت بھی بتلا دی اور آخر میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وتر سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سوال و جواب کا حال بھی سنا دیا۔

اس وضاحت سے موصوف کے استدلال کی پوری عمارت خاک میں مل جاتی ہے، تاہم اگر یہ فرض بھی کر لیں یا بخاری و مسلم کے علاوہ کسی اور روایت میں یہ مل بھی جائے کہ سائل ابوسلمہ نے بعد میں وتر سے متعلق بھی یہ سوال کیا تھا تو یہ دوسرا اور الگ سوال ہوگا، لہٰذا اس دوسرے سوال کے جواب سے پہلے سوال کی نوعیت طے کرنا بالکل لغو اور فضول بات ہوگی۔

اس سلسلے میں مزید شبہات کے ازالے کے لیے اسی کتاب کا صفحہ (۳۹۱۔۳۹۹) ملاحظہ کریں۔



دوسری حدیث

امام مسلم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ بْنُ يَحْيَى، حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي فِيمَا بَيْنَ أَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ -وَهِيَ الَّتِي يَدْعُو النَّاسُ الْعَتَمَةَ- إِلَى الْفَجْرِ، إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ، وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ، فَإِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ، وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ، وَجَاءَهُ الْمُؤَذِّنُ، قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ، ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ، حَتَّى يَأْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْإِقَامَةِ"[1]

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ عشا کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد سے فجر کی نماز کے درمیان تک گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے اور ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے اور ایک رکعت کے ذریعے وتر بنا لیتے، پھر جب موذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو جاتا

---

[1] صحيح مسلم (٥٠٨/١) كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الليل، وعدد ركعات النبي ﷺ في الليل، وأن الوتر ركعة، وأن الركعة صلاة صحيحة، رقم (٧٣٦)

اور فجر ظاہر ہو جاتی اور موذن آپ ﷺ کے پاس آتا تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر ہلکی ہلکی دو رکعات پڑھتے، پھر آپ ﷺ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے، یہاں تک کہ موذن اقامت کہنے کے لیے آتا۔"

اس حدیث میں عموم کے ساتھ یہ بات ہے کہ آپ ﷺ عشا اور فجر کے بیچ صرف گیارہ رکعات مع وتر پڑھتے تھے۔ اس عموم میں رمضان کی تراویح بھی شامل ہے، کیوں کہ تراویح وہی نماز ہے جسے عام دنوں میں تہجد کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں تفصیل گذشتہ حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔



تیسری حدیث

امام ابن خزیمۃ رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۱۱ھ) فرماتے ہیں:

”نا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ بْنِ كُرَيْبٍ، نا مَالِكٌ يَعْنِي ابْنَ إِسْمَاعِيلَ، نا يَعْقُوبُ، ح وَثنا مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ الْعِجْلِيُّ، نا عُبَيْدُ اللّٰهِ يَعْنِي ابْنَ مُوسَى، نا يَعْقُوبُ وهو ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْقُمِّيُّ، عَنْ عِيسَى بْنِ جَارِيَةَ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: صَلَّى بِنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي رَمَضَانَ ثَمَان رَكَعَاتٍ وَالْوِتْرَ، فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْقَابِلَةِ اجْتَمَعْنَا فِي الْمَسْجِدِ وَرَجَوْنَا أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْنَا، فَلَمْ نَزَلْ فِي الْمَسْجِدِ حَتَّى أَصْبَحْنَا، فَدَخَلْنَا عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَقُلْنَا لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! رَجَوْنَا أَنْ تَخْرُجَ إِلَيْنَا فَتُصَلِّيَ بِنَا، فَقَالَ: كَرِهْتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الْوِتْرُ“[1]

”جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعات تراویح اور نمازِ وتر پڑھائی، پھر اگلی بار ہم مسجد میں جمع ہوئے اور یہ امید کی کہ اللہ کے نبی ہمارے پاس (امامت کے لیے) آئیں گے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، پھر اللہ کے نبی ہمارے پاس

---

[1] صحیح ابن خزیمة (۲/۱۳۸، رقم: ۱۰۷۰)

آئے تو ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں امید تھی کہ آپ ہمارے پاس آئیں گے اور امامت کرائیں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے خدشہ ہوا کہ نمازِ وتر تم پر فرض نہ کر دی جائے۔"

یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس کے تمام راوت ثقہ ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

① عیسیٰ بن جاریہ رحمہ اللہ کا تعارف:

جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کرنے والے "عیسیٰ بن جاریہ" ہیں جو ثقہ ہیں۔ ان کی توثیق پر محدثین کے اقوال ملاحظہ ہوں:

- امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں:
  "لا بأس به"[1] "ان میں کوئی حرج کی بات نہیں، یعنی یہ ثقہ ہیں۔"
- امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
  "وثقه أبو زرعة"[2] "ابو زرعہ نے انھیں ثقہ کہا ہے۔"
- حافظ ظہور احمد صاحب فرماتے ہیں:
  "مشہور غیر مقلد مولانا ارشاد الحق اثری لکھتے ہیں: "أرجو أنه لا بأس به يكتب حديثه، يعتبر به" ایسے الفاظ ہیں کہ ان کے حاملین کی روایت قابلِ احتجاج نہیں ہوسکتی۔"[3]

عرض ہے کہ یہ بات صرف "لا بأس به" سے متعلق نہیں کہی گئی، بلکہ ایسے "لا بأس به" سے متعلق کہی گئی ہے جس کے ساتھ آگے "يكتب حديثه، يعتبر به" کے الفاظ بھی صادر کیے گئے ہیں، لہٰذا اس سیاق نے یہاں "لا بأس به" کی وضاحت

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (٦/٢٧٣)

[2] مجمع الزوائد للهيثمي (٢/٨٨)

[3] رکعاتِ تراویح۔ ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۱۸)

کر دی کہ یہاں یہ محض دیانت کے معنی میں ہیں اور ضبط کی گواہی کو شامل نہیں ہے۔

پھر ''لا بأس به'' پر ہی کیا موقوف، اس طرح کے سیاق کے ساتھ کسی راوی کے بارے میں لفظ ''ثقة'' کا بھی استعمال ہو تو یہ لفظ بھی عام اصطلاحی توثیق کے معنی میں نہیں ہو گا اور اس سے وہ راوی قابلِ احتجاج نہیں ہو گا۔ چنانچہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے بعض مقامات پر یہ صراحت کر رکھی ہے کہ ناقدین کبھی کبھی دیانت داری اور سچائی کے لحاظ سے کسی کو ثقہ کہہ دیتے ہیں اور اس سے ناقدین کا مقصد اصطلاحی معنی میں ثقہ کہنا نہیں ہوتا۔ ذیل میں امام ذہبی کی یہ صراحت ملاحظہ ہو۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے ایک راوی خارجہ بن مصعب الخراسانی کی توثیق کی تو امام ذہبی رحمہ اللہ نے یہ وضاحت کی کہ اس توثیق سے مراد یہ ہے کہ اس راوی سے جھوٹ بولنا ثابت نہیں ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

''وَقَالَ الحَاكِمُ: هُوَ فِي نَفْسِهِ ثِقَة، يَعْنِي مَا هُوَ بِمُتَّهَمٍ''[1]

''امام حاکم نے کہا: یہ فی نفسہ ثقہ ہے، (امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں) امام حاکم کی مراد یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے والا نہیں ہے۔''

معلوم ہوا کہ بعض ناقدین کبھی کبھی دیانت داری اور سچائی کے لحاظ سے کسی کو ثقہ کہہ دیتے ہیں، جس سے ناقدین کا مقصد اصطلاحی معنی میں ثقہ کہنا نہیں ہوتا، ٹھیک یہی معاملہ ''لا بأس به'' کا بھی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام ابو زرعہ کی طرف سے ''لا بأس به''، توثیق ہی کے معنی میں ہے، کیوں کہ اس معنی سے پھیرنے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

---

[1] سير أعلام النبلاء (٣٢٧/٧)

”وثقه أبو زرعة“[1] ”ابوزرعہ نے انھیں ثقہ کہا ہے۔“

❀ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۱۱ھ) نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے، جیسا کہ ان کی کتاب صحیح ابن خزیمہ سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ ناقد محدث کی طرف سے کسی راوی کی روایت کی تصحیح یا تحسین اس کی توثیق ہوتی ہے۔[2]

یہاں یہ اعتراض کرنا کہ ابن خزیمہ نے جہاں حدیث نقل کی ہے وہاں خصوصی تصحیح نہیں کی ہے، بالکل غلط ہے، کیوں کہ ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے کتاب کے شروع میں اجتماعی تصحیح کر دی ہے۔[3]

❀ امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) نے انھیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔[4]

نیز امام ابن حبان نے ان کی اسی حدیث کو صحیح بھی کہا ہے۔[5]

یہاں ابن حبان کے تساہل کی بات کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ ابن حبان رحمہ اللہ اس توثیق میں منفرد نہیں، بلکہ دیگر ائمہ سے بھی ان کی معتبر توثیق ثابت ہے۔

❀ امام ابویعلی الخلیلی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۴۶ھ) فرماتے ہیں:

”عِيسَى بْنُ جَارِيَةَ تَابِعِيٌّ ..... وَرَوَى عَنْهُ الْعُلَمَاءُ، مَحَلُّهُ الصِّدْقُ“[6]

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمي (۸۸/۲)

[2] تفصیل کے لیے ہماری کتاب ”یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ“ (ص: ۶۸۹، ۶۹۰) دیکھیں۔

[3] مزید توضیح کے لیے دیکھیں: انوار البدر (ص: ۳۰۷-۳۱۰) نیز دیکھیں: حدیثِ یزید محدثین کی نظر میں (ص: ۵۳-۶۴)

[4] دیکھیں: الثقات لابن حبان، ت العثمانية (۲۱٤/۵)

[5] دیکھیں: صحيح ابن حبان (۱٦۹/٦)

[6] الإرشاد في معرفة علماء الحديث للخليلي (۷۸۵/۲)

''عیسیٰ بن جاریہ تابعی ہیں، ان سے علما نے روایت کیا ہے، یہ سچے ہیں۔''

❀ امام منذری رحمہ اللہ (المتوفی: ۶۵۶ھ) نے ان کی ایک روایت کے بارے میں کہا ہے:

"رواه أبو يعلىٰ بإسناد جيد، وابن حبان في صحيحه"[1]

''اسے ابو یعلیٰ نے جید سند سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔''

❀ امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) نے ان کی اسی روایت کے بارے میں کہا ہے:

"إسناده وسط"[2] ''اس کی سند اوسط درجے کی ہے۔''

❀ امام ہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۰۷ھ) نے ان کی ایک روایت کے بعد کہا:

"رواه أبو يعلىٰ والطبراني في الأوسط بنحوه، وفي الكبير باختصار، ورجال أبي يعلىٰ ثقات"[3]

''اسے ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ''اوسط'' میں اسی جیسا روایت کیا ہے۔ ''کبیر'' میں اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابو یعلیٰ کے رجال ثقہ ہیں۔''

حافظ ظہور احمد صاحب نے اس مناسبت سے بعض اہلِ حدیث و اہلِ علم کے ایسے حوالے دیے ہیں جہاں انھوں نے امام ہیثمی رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے۔[4]

عرض ہے کہ اہلِ علم نے بے شک قوی تر دلائل کی روشنی میں بعض مقامات پر

---

[1] الترغيب والترهيب للمنذري (۱/۲۹۳، رقم: ۱۰۸۱) نیز دیکھیں: الترغيب والترهيب، ط، مكتبة المعارف (ص: ۳۲۸، رقم: ۱۰۴۷)

[2] ميزان الاعتدال للذهبي (۳/۳۱۱)

[3] مجمع الزوائد للهيثمي (۲/۲۱۹)

[4] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۲۱، ۲۲۲)

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ امام ہیثمی رحمہ اللہ سے ہر مسئلے میں اختلاف کیا جائے گا اور ان کی کسی بھی بات پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

اگر اہلِ حدیث نے چند مقامات پر ان سے اختلاف کیا ہے تو بے شمار مقامات ہیں جہاں ان پر اعتماد بھی کیا ہے۔ والحمد لله

اصل مسئلہ دلائل کا ہے، جہاں دلائل سے امام ہیثمی رحمہ اللہ کا قول مرجوح قرار پائے گا وہاں ان کی بات نہ لی جائے گی اور جہاں ان کی کسی بات کے غلط ہونے کی دلیل نہ ملے۔ وہاں ان کی بات قبول کی جائے گی۔ عیسیٰ بن جاریہ سے متعلق ان کی توثیق کے غلط ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس کی تائید موجود ہے، لہٰذا ان کی یہ بات قابلِ تسلیم ہے۔

امام ہیثمی رحمہ اللہ سے متعلق جس طرح کی گفتگو حافظ ظہور صاحب نے کی ہے اسی کو امام بوصیری، امام منذری، حافظ ابن حجر اور بعض دیگر ائمہ کے ساتھ بھی دہرایا ہے اور سب کا جواب یہی ہے جو اوپر عرض کر دیا گیا ہے۔

- امام بوصیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۴۰ھ) نے ان کی ایک روایت کے بارے میں کہا ہے:

  ”هَذَا إِسْنَاد حسن، يَعْقُوب مُخْتَلف فِيهِ وَالْبَاقِيُ ثِقَات“[1]

  ”یہ سند حسن ہے۔ یعقوب مختلف فیہ ہے اور باقی رجال ثقہ ہیں۔“

- حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) نے ان کی ایک روایت کے بارے میں کہا ہے:

  ”رجاله ثقات“[2] ”اس کے رجال ثقہ ہیں۔“

---

[1] مصباح الزجاجة للبوصيري (٤/٢٤٥)

[2] الإصابة لابن حجر (٣/٣٤٩، رقم: ٣٩١٣)

احناف نے بھی اس راوی کو ثقہ مانا ہے، چنانچہ ان کی ایک روایت نقل کر کے نیموی حنفی نے کہا: ''إسناده صحيح'' ''اس کی سند صحیح ہے۔''[1]

بلکہ احناف نے ان کی اس حدیث کو بھی صحیح تسلیم کیا ہے، چنانچہ ملا علی القاری (المتوفی: ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

''فإنه صح عنه أنه صلى بهم ثماني ركعات والوتر''[2]

''کیوں کہ آپ ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کو آٹھ رکعات اور وتر پڑھائے۔''

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۵۳ھ) فرماتے ہیں:

''وفي الصحاح صلاة تراويحه عليه الصلاة والسلام ثماني ركعات''[3]

''اور صحیح حدیث کی کتب میں ہے کہ آپ ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات تھی۔''

جارحین کے اقوال کا جائزہ:

❁ امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

''عيسى بن جارية عنده أحاديث مناكير''[4]

''عیسیٰ بن جاریہ، ان کے پاس منکر احادیث ہیں۔''

ان الفاظ میں عیسیٰ بن جاریہ پر براہِ راست جرح نہیں ہے، کیوں کہ امام ابن معین نے کہا ہے کہ ان کے پاس منکر احادیث ہیں اور کسی کے پاس محض منکر احادیث کا ہونا

---

[1] آثار السنن (٦٦١)

[2] مرقاة المفاتيح للملا القاري (٩٧١/٣)

[3] العرف الشذي للكشميري (٤١٢/١)

[4] تاريخ ابن معين، رواية الدوري (٣٦٩/٤)

اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ راوی منکر الحدیث اور ضعیف ہے۔

امام حاکم، امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵ھ) سے اپنا سوال جواب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فسليمان بن بنت شرحبيل؟ قال: ثقة. قلت: أليس عنده مناكير؟ قال: يحدث بها عن قوم ضعفاء، فأما هو فهو ثقة“[1]

”میں نے پوچھا: سلیمان بن بنت شرحبیل کیسا ہے؟ امام دارقطنی نے جواب دیا: یہ ثقہ ہے۔ میں نے کہا: کیا اس کے پاس مناکیر نہیں ہیں؟ امام دارقطنی نے جواب دیا: ان مناکیر کو یہ ضعیف لوگوں سے روایت کرتا ہے، لیکن یہ خود ثقہ ہے۔“

امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

”ما كل من روى المناكير يضعف“[2]

”ایسا نہیں ہے کہ جس کسی نے بھی منکر احادیث روایت کیں، وہ ضعیف قرار پائے گا۔“

مزید یہ کہ بعض محدثین محض تفرد کے معنی میں بھی نکارت کی جرح کرتے ہیں۔ یعنی منکر کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں راوی کی احادیث ایسی ہیں جن کی متابعت نہیں ملتی اور محض اس چیز سے راوی پر لازمی جرح ثابت نہیں ہوتی ہے۔[3]

ہم عیسیٰ بن جاریہ ہی سے متعلق امام ابن معین رحمہ اللہ کے دیگر اقوال دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن معین رحمہ اللہ نے تفرد کے معنی میں ہی ان کی احادیث کو منکر

---

[1] سؤالات الحاكم للدارقطني (ص: ۲۱۷)

[2] ميزان الاعتدال للذهبي (۱/۱۱۸)

[3] دیکھیں: شفاء العليل بألفاظ وقواعد الجرح والتعديل (ص: ۳۱۰، ۳۱۱)

کہا ہے، چنانچہ ایک دوسرے موقع پر امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا:

"روى عنه يعقوب القمي، لا نعلم أحدا روى عنه غيره، وحديثه ليس بذاك"[1]

''ان سے یعقوب القمی نے روایت کیا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ان کے علاوہ بھی کسی نے ان سے روایت کیا ہے اور ان کی حدیث اعلیٰ درجے کی حدیث نہیں ہے۔''

امام ابن معین رحمہ اللہ کے اس قول سے یہ بات صاف ہوگئی کہ انھوں نے تفرد کے معنی میں ہی ان کی احادیث کو منکر کہا ہے اور اس معنی میں اگر کسی راوی کی احادیث کو منکر کہا جائے تو اس سے راوی کی تضعیف لازم نہیں آتی۔

علاوہ بریں امام ابن معین نے ان کی حدیث کو "ليس بذاك" بھی کہا ہے اور اس صیغہ سے حدیث کی تضعیف نہیں ہوتی، بلکہ اعلیٰ درجے کی صحت کی نفی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک طرف ابن معین رحمہ اللہ کا ان کے پاس منکر احادیث کہنا اور دوسری طرف ان کی حدیث کو "ليس بذاك" کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ امام ابن معین کی نظر میں یہاں منکر سے مراد حدیث کی تضعیف نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کی صحت کی نفی ہے، اسی طرح عیسیٰ بن جاریہ رحمہ اللہ ان کے نزدیک ضعیف نہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ نہیں ہیں۔

نیز امام ابن معین رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں جو یہ کہا ہے:

"ليس بشيء"[2] ''ان کا کوئی مقام نہیں۔''

تو اس سے امام ابن معین رحمہ اللہ کی مراد جرح نہیں، بلکہ ان کا قلیل الحدیث

---

[1] تاريخ ابن معين، رواية الدوري (٣٦٥/٤)

[2] سؤالات ابن الجنيد لابن معين (ص: ٣٠٢)

ہونا ہے، کیوں کہ امام ابن معین رحمہ اللہ قلیل الحدیث کے معنی میں بھی "لیس بشيء" کے الفاظ بولتے ہیں۔[1]

یہاں اس معنی کے لیے قرینہ امام ابن معین رحمہ اللہ کا یہ فرمانا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ یعقوب القمی کے علاوہ کسی اور نے ان سے روایت کیا ہے کما مضی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام ابن معین کی نظر میں یہ قلیل الروایہ تھے اور اسی سبب امام ابن معین رحمہ اللہ نے انھیں "لیس بشيء" کہا ہے۔

❁ امام ابو داود رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

"منکر الحدیث"[2] "یہ منکر الحدیث ہے۔"

عرض ہے کہ امام مزی نے امام ابو داود ہی سے یہ بھی نقل کیا ہے:

"وَقَال في موضع آخر: ما أعرفه، روى مناكير"[3]

"امام ابو داود نے دوسرے مقام پر کہا: میں اسے نہیں جانتا، اس نے منکر روایات نقل کی ہیں۔"

امام ابو داود کے اس دوسرے قول سے واضح ہو گیا کہ امام ابو داود نے اس راوی کو منکر الحدیث صرف اس معنی میں کہا ہے کہ انھوں نے منکر روایات نقل کی ہیں اور صرف اتنی بات سے کسی راوی کی تضعیف ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ کسی راوی کا منکر الحدیث ہونا اور کسی راوی کا منکر روایات بیان کرنا دونوں میں فرق ہے۔

❁ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: التعریف برجال الموطأ (۸۱۲/۱) فتح المغیث (۱۲۳/۲) التنکیل (ص: ٥٤)

[2] تهذيب الكمال للمزي (۵۸۹/۲۲)

[3] تهذيب الكمال للمزي (۵۹۰/۲۲)

"عيسى بن جارية، يروي عنه يعقوب القمي، منكر"[1]

''عیسیٰ بن جاریہ، ان سے یعقوب القمی روایت کرتے ہیں، یہ منکر ہے۔''

عرض ہے کہ امام نسائی رحمہ اللہ تفرد کے معنی میں بھی منکر بول دیتے ہیں اور عیسیٰ بن جاریہ رحمہ اللہ کئی روایات میں منفرد ہیں، اس لیے بہت ممکن ہے کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے تفرد کے معنی میں نکارت کی جرح کی ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فقد أطلق الإمام أحمد والنسائي وغير واحد من النقاد لفظ المنكر على مجرد التفرد"[2]

''امام احمد اور امام نسائی وغیرہ ناقدین نے لفظِ منکر کو محض تفرد کے معنی میں استعمال کیا ہے۔''

واضح رہے کہ امام نسائی سے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس وضاحت کے برعکس کوئی بات نہیں ملتی، لیکن امام احمد رحمہ اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ منفرد حدیث پر تو منکر کا اطلاق کرتے ہیں، لیکن اس کے راوی پر الفاظِ توثیق ہی کا استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی مدلل وضاحت آگے آ رہی ہے، تاہم امام نسائی اور بعض دیگر ائمہ کا یہ منہج مسلم ہے۔ علاوہ بریں امام نسائی رحمہ اللہ متشددین میں سے بھی ہیں، جیسا کہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے کہا ہے۔[3] لہٰذا اس پہلو کو بھی یہاں مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔

علامہ نذیر املوی رحمہ اللہ پر حنفی تعاقب کا جائزہ:

حافظ ظہور احمد صاحب نے ''منکر الحدیث'' کی جرح سے متعلق متعدد حوالے

---

[1] الضعفاء والمتروكون للنسائي (ص: ٧٦)

[2] النكت على كتاب ابن الصلاح لابن حجر (٦٧٤/٢)

[3] دیکھیں: ميزان الاعتدال للذهبي (٤٣٧/١) مقدمة فتح الباري (ص: ٣٨٧)

نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ قادح جرح ہے اور ایسے راوی کی روایت ضعیف ہوتی ہے۔[1]

عرض ہے کہ اس کے اس معنی سے کسی کو انکار نہیں، لیکن یہاں یہ صیغہ اس معنی میں نہیں ہے، جیسا کہ وضاحت کی گئی، لہٰذا اس مقام پر یہ حوالے غیر متعلق ہیں۔

علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ نے یہ بتانے کے لیے کہ منکر الحدیث کا صیغہ بہت سارے مفہوم میں آتا ہے، چند مثالیں پیش کی تھیں، ان کا مقصود یہ تھا کہ جب یہ صیغہ کئی مفہوم میں آتا ہے تو قرائن کے بغیر اسے جرح قادح پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

اس کے جواب میں حافظ ظہور صاحب نے ان مثالوں پر بحث کرتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ان میں سے کسی بھی معنی میں عیسیٰ بن جاریہ پر کی گئی جرح کا تعلق نہیں ہے۔ ذیل میں اس کا تجزیہ پیشِ خدمت ہے:

1. علامہ املوی رحمہ اللہ نے پہلا معنی یہ بتلایا تھا کہ بعض محدثین کسی راوی کو ایک ہی حدیث روایت کرتے ہوئے پاتے ہیں تو اس معنی میں بھی اسے منکر الحدیث بول دیتے ہیں۔ اس پر حافظ ظہور صاحب نے یہ فرمایا کہ عیسیٰ بن جاریہ سے صرف ایک ہی حدیث مروی نہیں، بلکہ کئی اور روایات بھی مروی ہیں۔[2]

عرض ہے کہ ضروری نہیں کہ جن جن ائمہ نے منکر کی بات کہی ہے، ان سب کے پاس بھی اس کی ساری احادیث پہنچ گئی ہوں، ممکن ہے کسی کے پاس اس کی صرف ایک ہی حدیث پہنچی ہو۔

2. علامہ املوی رحمہ اللہ نے دوسرا معنی یہ بیان کیا تھا کہ کوئی ثقہ راوی کسی ضعیف راوی

---

[1] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۱۱)

[2] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۱۲)

سے منکر روایت نقل کرے تو اس وجہ سے اس ثقہ پر بھی یہ صیغہ بول دیا جاتا ہے۔

اس کے جواب میں حافظ ظہور صاحب نے تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب سے عیسیٰ بن جاریہ کے اساتذہ کی فہرست پیش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کے سارے اساتذہ ثقہ ہیں۔[1]

عرض ہے کہ یہ روایتیں ان لوگوں کی نہیں ہیں جنھوں نے منکر کا صیغہ استعمال کیا ہے، ممکن ہے جنھوں نے منکر کا صیغہ استعمال کیا ہے، ان کے پاس اس کی اور روایات بھی رہی ہوں۔

3 علامہ املوی رحمہ اللہ نے تیسرا معنی یہ بیان کیا تھا کہ کسی راوی کی چند روایات کے تعلق سے منکر الحدیث بولتے ہیں نہ کہ اس کی ساری روایات سے متعلق، اور اس بات کو علامہ لکھنوی کی کتاب ''الرفع والتکمیل'' سے نقل کیا تھا جس میں یہ بات امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب میزان کے حوالے سے منقول تھی۔

اس کے جواب میں حافظ ظہور احمد صاحب نے ابوغدہ صاحب کے حاشیے کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ یہ عبارت میزان کے نسخے میں نہیں ہے۔[2] عرض ہے کہ ابوغدہ صاحب نے یہ کہا ہے کہ یہ عبارت میزان کے کسی اور نسخے میں ہوسکتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بعید نہیں، کیوں کہ امام ذہبی نے اسی مفہوم کی بات اپنی کتاب تاریخ الاسلام میں عبداللہ بن معاویۃ الزبیری کے ترجمے میں کہی ہے۔[3] یہ بات تاریخ الاسلام کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔

بہرحال علامہ املوی رحمہ اللہ کا مقصود یہ نہیں تھا کہ متعلقہ بحث میں یہ صیغہ ان

---

[1] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۱۲)

[2] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۱۳)

[3] تاريخ الإسلام، ت بشار (٩٠٢/٤)

معانی میں ہے، بلکہ انھوں نے صرف یہ سمجھایا ہے کہ یہ صیغہ کئی معانی میں آتا ہے، اس لیے قرائن وغیرہ سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک ہی معنی لے کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔

ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ بعض ائمہ کی نظر میں اس صیغے کا ایک مفہوم تفرد بتلانا بھی ہوتا ہے اور قرائن کی روشنی میں یہاں یہی متعین ہے، کیوں کہ واقعتاً اس حدیث کی روایت میں عیسی بن جاریہ منفرد ہیں اور تفرد، فی نفسہٖ عیب نہیں جب تک کہ اس تفرد کے مردود ہونے پر قرائن نہ ہوں اور الحمد للہ اس حدیث میں عیسیٰ بن جاریہ کے تفرد کے رد ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

حافظ ظہور صاحب نے آگے علامہ سندھی کے حوالے سے طویل بحث کرنے کے بعد کہا:

''وہ معنی عیسی بن جاریہ کے بارے میں مراد نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس کو ''منکر الحدیث'' کہنے کے ساتھ ''عندہ مناکیر'' بھی کہا گیا ہے۔''[1]

عرض ہے، ''عندہ مناکیر'' بھی کہا گیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ''منکر الحدیث'' کا مطلب ''عندہ مناکیر'' ہے اور ''عندہ مناکیر'' والا ہر راوی ضعیف نہیں ہوتا۔

امام حاکم، امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵) سے اپنا سوال جواب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فسليمان بن بنت شرحبيل؟ قال: ثقة. قلت: أليس عنده مناكير؟ قال: يحدث بها عن قوم ضعفاء، فأما هو فهو ثقة''[2]

---

[1] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص:۲۱۴)

[2] سؤالات الحاكم للدارقطني (ص: ۲۱۷)

”میں نے پوچھا: سلیمان بن بنت شرحبیل کیسا ہے؟ امام دارقطنی نے جواب دیا: یہ ثقہ ہے۔ میں نے کہا: کیا اس کے پاس مناکیر نہیں ہیں؟ امام دارقطنی نے جواب دیا: ان مناکیر کو یہ ضعیف لوگوں سے روایت کرتا ہے، لیکن یہ خود ثقہ ہے۔“

واضح رہے کہ بعض لوگ امام نسائی سے اس راوی سے متعلق منکر الحدیث اور متروک کی جرح نقل کرتے ہیں، لیکن یہ الفاظ امام نسائی سے ثابت نہیں۔ امام نسائی کی کتاب میں صرف منکر کا لفظ ہے، غالباً بعض اہلِ علم نے اسے منکر الحدیث کے معنی میں سمجھ کر معنوی طور پر منکر الحدیث نقل کر دیا ہے۔ متروک کا لفظ امام نسائی نے اپنی کتاب میں اس سے قبل والے راوی عیسیٰ بن عبد الرحمان کے بارے میں کہا ہے۔[1] بعض لوگوں نے سبقتِ نظر کے سبب اس جرح کو بعد والے راوی عیسیٰ بن جاریہ کے بارے میں سمجھ لیا ہے۔[2]

امام ابن عدی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۶۵ھ) فرماتے ہیں:

”كلها غير محفوظة“[3]

”اس کی مذکورہ بالا تمام احادیث غیر محفوظ ہیں۔“

عرض ہے کہ امام ابن عدی نے یہ تبصرہ کرنے سے قبل عیسیٰ بن جاریہ پر بعض محدثین سے نکارت کی جرح نقل کی ہے جو ثابت نہیں ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امام ابن عدی کی جرح کی بنیاد غیر ثابت اقوال ہیں، لہٰذا امام ابن عدی کی جرح غیر مسموع ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: الضعفاء والمتروكون للنسائي (ص: ٧٦)

[2] دیکھیں ہماری کتاب: انوار البدر فی وضع الیدین علی الصدر (ص: ۴۰۷۔۴۱۹)

[3] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (٦/٤٣٨)

"فيه لين"[1] ''ان میں کمزوری ہے۔''

یہ بہت ہلکی جرح ہے جس سے مطلق تضعیف لازم نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا:

"رجاله ثقات"[2] ''اس کے رجال ثقہ ہیں۔''

نیز ایک دوسرے مقام پر ان کی ایک روایت کو حسن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كما أخرجه أبو يعلىٰ بإسناد حسن من رواية عيسى بن جارية"[3]

''جیسا کہ ابویعلیٰ نے عیسیٰ بن جاریہ کی روایت حسن سند سے نقل کی ہے۔''

حافظ ظہور صاحب لکھتے ہیں:

''حافظ ابن حجر نے "فيه لين" کو الفاظِ جرح و تعدیل کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ (تقریب، ص: ۱)''[4]

عرض ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محولہ مقام پر چھٹے مرتبے میں جس صیغے کو شمار کیا ہے وہ یوں ہے:

"السادسة: من ليس له من الحديث إلا القليل، ولم يثبت فيه ما يترك حديثه من أجله، وإليه الإشارة بلفظ: مقبول، حيث يتابع، وإلا فلين الحديث"[5]

---

[1] تقريب التهذيب لابن حجر (٥٢٨٨)

[2] الإصابة لابن حجر (٣٤٩/٣)

[3] فتح الباري دار المعرفة (٩٨/٢)

[4] رکعاتِ تراویح۔ ایک تحقیقی جائزہ (ص: ٢١٦)

[5] تقريب التهذيب لابن حجر، ت عوامة (ص: ٧٤)

''چھٹا مرتبہ: جس کی بہت کم احادیث ہوں اور اس کے بارے میں ایسی بات ثابت نہ ہو جس کے سبب اس کی حدیث کو ترک کیا جائے تو اس کی طرف مقبول سے اشارہ ہوگا، یعنی جب اس کی متابعت کی جائے ورنہ وہ ''لین الحدیث'' ہوگا۔''

ملاحظہ فرمائیں! یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی ایک خاص اصطلاح ''مقبول'' کی وضاحت کر رہے ہیں اور یہ بتلا رہے ہیں کہ اس نوع کے رواۃ کی جہاں متابعت نہ ملے، وہاں یہ ''لین الحدیث'' ہوگا۔ لیکن عیسیٰ بن جاریہ کو ابن حجر رحمہ اللہ نے نہ تو ''مقبول'' کہا ہے اور نہ ''لین الحدیث'' ہی کہا ہے، بلکہ صرف ''فیہ لین'' کہا ہے جو ان دونوں سے الگ ہے اور صرف معمولی ضعف پر دال ہے جو توثیق کے منافی نہیں، اسی لیے خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرے مقام پر انھیں ثقہ کہا ہے۔

حافظ ظہور صاحب ''لین الحدیث'' اور ''فیہ لین'' کے فرق پر دھیان نہیں دے سکے۔ اس فرق کی وضاحت کے بعد اس ضمن میں ان کی ساری تفصیلات بے معنی ہو جاتی ہیں اور آگے آنجناب نے علامہ املوی رحمہ اللہ کا جو تضاد دکھلانے کی کوشش کی ہے اس کی حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

امام عقیلی نے الضعفاء میں اس راوی کا تذکرہ کیا ہے، لیکن خود کوئی جرح نہیں کی اور محض الضعفاء والی کتاب میں کسی راوی کے تذکرے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ضعفاء کے مولف کی نظر میں یہ راوی ضعیف ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ عیسیٰ بن جاریہ پر کوئی بھی معتبر جرح ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ ثقہ ہیں، کیوں کہ کئی محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، جیسا کہ ماقبل میں تفصیل پیش کی گئی۔

---

[1] دیکھیں ہماری کتاب: یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ (ص: ۶۷۵۔۶۷۷)

یعقوب بن عبداللہ القمی کا تعارف:

عیسیٰ بن جاریہ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے یعقوب بن عبداللہ القمی ہیں، آپ بخاری تعلیقاً اور سنن اربعہ کے ثقہ راوی ہیں۔

- امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

  "ثقة"[1] "یہ ثقہ ہیں۔"

- امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) نے انھیں ثقات میں ذکر کرتے ہوئے کہا: "يعقوب بن عبد الله بن سعد الأشعري القمي ...."[2]

- امام طبرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۶۰ھ) نے ان کی یہی حدیث نقل کر کے کہا:

  "ثقة"[3] "یہ ثقہ ہیں۔"

- امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

  "صدوق"[4] "یہ صدوق ہیں۔"

  نیز ایک دوسری کتاب میں کہا:

  "الإمام، المحدث، المفسر"[5] "آپ امام، محدث اور مفسر ہیں۔"

- امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

  "ضعيف"[6] "یعقوب ضعیف ہیں۔"

---

1. سؤالات ابن الجنيد لابن معين (ص: ٤١١)
2. الثقات لابن حبان، ت العثمانية (٦٤٥/٧)
3. المعجم الصغير للطبراني (٣١٧/١)
4. الكاشف للذهبي (٣٩٤/٢)
5. سير أعلام النبلاء للذهبي (٢٩٩/٨)
6. علل الدارقطني (١١٦/١٣)

عرض ہے کہ ضعیف، غیر مفسر جرح ہے۔ اور امام دارقطنی ہی کے دوسرے قول میں اس کی تفسیر بھی آ گئی ہے، چنانچہ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ليس بالقوي"[1] "یہ بہت زیادہ قوی نہیں ہیں۔"

عرض ہے کہ "ليس بالقوي" کی جرح قادح نہیں ہے اور اس سے راوی کا عام معنی میں ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ ہم نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب "یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ" (ص: ۶۷۷-۶۷۹) میں پیش کی ہے۔

الغرض امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس دوسرے قول سے معلوم ہوا کہ ضعیف کہنے سے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی مراد حافظے میں معمولی کمی بتلانا ہے، نہ کہ عام معنی میں ضعیف بتلانا۔

مالک بن اسماعیل النہدی کا تعارف:

یعقوب سے اس روایت کو کئی ثقہ رواۃ نے نقل کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے یعقوب سے نیچے دو سندیں ذکر کی ہیں اور دونوں صحیح ہیں، بلکہ پہلی سند کے سارے رجال بخاری یا مسلم کے ہیں۔ اس سند میں یعقوب سے اس روایت کو نقل کرنے والے مالک بن اسماعیل النہدی ہیں۔ آپ بخاری و مسلم سمیت کتبِ ستہ کے رجال میں سے ہیں اور بالاتفاق ثقہ ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے آپ کے بارے میں ناقدین کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"ثقة، متقن، صحيح الكتاب، عابد"[2]

---

[1] العلل للدارقطني (٩٢/٣)

[2] تقريب التهذيب لابن حجر (٦٤٢٤)

''آپ ثقہ، متقن، صحیح الکتاب اور عابد ہیں۔''

محمد بن العلاء الہمدانی کا تعارف:

آپ بھی بخاری ومسلم سمیت کتبِ ستہ کے رجال میں سے ہیں اور بالاتفاق ثقہ حافظ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے آپ کے بارے میں ناقدین کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا: ''ثقة حافظ''[1] ''آپ ثقہ اور حافظ ہیں۔''

معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند کے سارے رواۃ ثقہ ہیں۔ والحمد لله

تنبیہ بلیغ: مولانا طاہر گیاوی صاحب اور بعض احناف یہ لکھتے رہتے ہیں کہ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کی سند میں ''محمد بن حمید'' نامی ایک راوی ہے، جو کذاب ہے۔

عرض ہے کہ یہاں ہم نے حدیثِ ابن جاریہ کی جو سند پیش کی ہے اس میں اس راوی کا کوئی نام ونشان ہی نہیں، لہٰذا یہاں اس اعتراض کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے، البتہ احناف بیس رکعات سے متعلق جابر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت ضرور پیش کرتے ہیں جس میں یہ کذاب راوی موجود ہے اور اس کی کوئی دوسری سند موجود ہی نہیں، اس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

لیکن عجوبہ دیکھیے کہ جب یہ کذاب منفرد اور تنہا ہو کر جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے آٹھ سے زائد رکعات بیان کرتا ہے تو اس کذاب پر ایمان لایا جاتا ہے اور جب جابر رضی اللہ عنہ سے یہ آٹھ رکعات بیان کرتا ہے اور دوسری صحیح سند سے جابر رضی اللہ عنہ کی یہی بات ثابت ہوتی ہے تو خواہ مخواہ اس پر جرح کر کے دوسری صحیح سند پر بھی حملہ کیا جاتا ہے۔ الغرض یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اسی لیے درج ذیل علما نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے:

---

[1] تقريب التهذيب لابن حجر (٦٢٠٤)

❁ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۱۱ھ)۔ آپ نے اپنی کتاب صحیح ابن خزیمہ میں اسے نقل کیا ہے، یعنی آپ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

❁ امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ)۔ آپ نے اپنی کتاب صحیح ابن حبان میں اسے نقل کیا ہے، یعنی آپ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[1]

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ)۔ آپ نے فتح الباری (۱۲/۳) میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اور اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ فتح الباری میں کسی حدیث پر آپ کا سکوت آپ کے نزدیک اس حدیث کے صحیح یا حسن ہونے کی دلیل ہے۔[2]

بلکہ احناف نے بھی اسے صحیح کہا ہے ملاحظہ ہو:

❁ ملا علی القاری (المتوفی: ۱۰۱۴ھ)۔ آپ نے کہا:

”فإنه صح عنه أنه صلى بهم ثماني ركعات والوتر“[3]

”کیوں کہ آپ ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کو آٹھ رکعات اور وتر پڑھائیں۔“

❁ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۵۳ھ)۔ آپ نے کہا:

”وفي الصحاح صلاة تراويحه عليه الصلاة والسلام ثماني ركعات“[4]

”اور صحیح حدیث کی کتب میں ہے کہ آپ ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات تھی۔“

---

[1] دیکھیں: صحيح ابن حبان (١٦٩/٦)

[2] دیکھیں: أنوارالبدر في وضع اليدين على الصدر (ص: ٢٢٩)

[3] مرقاة المفاتيح للملا القاري (٩٧١/٣)

[4] العرف الشذي للكشميري (٤١٢/١)

کیا حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ منقطع ہے؟

حافظ ظہور احمد صاحب لکھتے ہیں:

''یہ روایت غیر مقلدین کے بیان کردہ قاعدہ کے موافق منقطع ہے، کیوں کہ اس روایت کو حضرت جابر سے نقل کرنے والے عیسیٰ بن جاریہ ہیں جن کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''من الرابعة'' کہ وہ طبقہ رابعہ کے راوی ہے۔[1] چوتھے طبقے کے متعلق مولانا نذیر احمد رحمانی غیر مقلد لکھتے ہیں:

''اور چوتھا طبقہ وہ ہے جو تابعین کے طبقہ وسطیٰ کے قریب ہے جن کی اکثر روایتیں کبار تابعین سے لی گئی ہیں، صحابہ سے نہیں۔''[2]

سو جب عیسیٰ بن جاریہ چوتھے طبقہ کا راوی ہے اور بقول مولانا رحمانی صاحب اس طبقہ والوں کی احادیث صحابہ کرام سے مروی نہیں، تو پھر جب عیسیٰ بن جاریہ نے بھی اس روایت کو حضرت جابر سے نقل کیا ہے جو صحابیِ رسول ہیں تو غیر مقلدین کے اصول کے مطابق عیسیٰ بن جاریہ کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ روایات منقطع ٹھہری۔''[3]

حافظ ظہور احمد صاحب سے گذارش ہے کہ پہلے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا موقف پڑھ لیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

''الرابعة: طبقة تليها: جُلُّ روايتهم عن كبار التابعين،

---

[1] تقریب (۷٦٩/۱)

[2] أنوار المصابيح (ص: ۲۸۰)

[3] رکعاتِ تراویح، ایک تحقیقی جائزہ (ص: ۲۰۹)

كالزهري وقتادة"[1]

''چوتھا طبقہ: یہ طبقہ وسطیٰ کے تابعین کے قریب کا طبقہ ہے، ان کی اکثر روایات کبار تابعین سے ہیں، جیسے زہری اور قتادہ ہیں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحابہ سے اس طبقے کی روایات کا یکسر انکار نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ ان کی اکثر روایات کبار تابعین سے ہیں، یعنی بعض روایات صحابہ سے بھی ہیں اور یہ تعداد میں بہت کم ہیں۔یہی بات معنوی طور پر علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے، بلکہ یہ بات کہہ کر انھوں نے آگے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اسی کتاب تقریب ہی کا حوالہ دیا ہے۔علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

''اور چوتھا طبقہ وہ ہے جو تابعین کے طبقہ وسطیٰ کے قریب ہے جن کی اکثر روایتیں کبار تابعین سے لی گئی ہیں، صحابہ سے نہیں۔''[2]

یہاں علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ نے اس طبقے کی صحابہ سے مطلقاً روایات کا انکار نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ ان کی اکثر روایات صحابہ سے نہیں ہیں، نہ کہ تمام روایات ہی کبار تابعین سے ہیں اور صحابہ سے کوئی روایت بیان نہیں کرتے۔

یہی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے، جس کا حوالہ آگے علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ نے دے دیا ہے اور ماقبل میں ہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے الفاظ پیش کر کے اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ علامہ نذیر املوی رحمہ اللہ نے اس طبقے کو تابعین کا طبقہ کہا ہے، اس طبقے کو تابعین کا نام دینے کا مطلب ہی یہی ہے کہ صحابہ سے ان کی

---

[1] تقريب التهذيب لابن حجر (ص: ٨١) ت شاغف

[2] تقریب (ص: ٣)

روایات کو ثابت مانا جا رہا ہے، کیوں کہ تابعی اسی کو کہا جاتا ہے جو صحابی سے ملا ہو۔

محترم ظہور احمد صاحب اگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عبارت بغور نہیں دیکھ سکے تو آنجناب کو کم از کم یہ تو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ علامہ املوی رحمہ اللہ نے خود اس چوتھے طبقے کو تابعین کا طبقہ کہا ہے، یعنی علامہ املوی رحمہ اللہ انھیں تابعین کہہ کر صحابہ سے ان کی ملاقات کا اثبات کر رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ چوتھے طبقے کے تابعین نے بھی صحابہ سے روایات بیان کی ہیں اور اس کا انکار کسی نے نہیں کیا، لیکن چونکہ اس طبقے کے لوگوں کی صحابہ سے روایات کم ہیں اور کبار تابعین سے زیادہ ہیں، اس لیے انھیں تابعین کے چوتھے طبقے میں شمار کیا گیا ہے۔

اس طبقے کے تابعین کی جس صحابی سے ملاقات کا ثبوت نہ ملے، اس صحابی سے ان کی روایات منقطع ہوں گی، لیکن جس صحابی سے ان کی ملاقات کا ثبوت ملے، اس صحابی سے ان کی روایات متصل و صحیح ہوں گی۔

یاد رہے کہ عیسی بن جاریہ نے آٹھ رکعاتِ تراویح والی روایت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اور آٹھ رکعات تراویح سے متعلق ہی ایک روایت میں عیسیٰ بن جاریہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے سماع و تحدیث کی صراحت کرتے ہوئے کہا ہے:

"حدثنا جابر بن عبد الله...." [1]

"ہم سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا۔"

لہٰذا یہ روایت متصل ہے اور انقطاع کے اعتراض کی کوئی گنجایش نہیں۔

کیا حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ منکر و مضطرب ہے؟

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے اس حدیث کے آخری الفاظ "كَرِهْتُ أَنْ

[1] مسند أبي يعلىٰ الموصلي (۳/۳۳٦) وإسناده صحيح

يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الْوِتْرُ، ”مجھے خدشہ ہوا کہ نمازِ وتر تم پر فرض نہ کر دی جائے“ کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت منکر و مضطرب ہے۔ ان کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ حدیثِ جابر ہی کے بعض طرق میں ”یکتب علیکم“ کے بعد وتر کا لفظ نہیں ہے اور بعض روایات میں وتر کے بجائے ”صلاۃ اللیل“ کے الفاظ ہیں۔[1]

عرض ہے کہ یہ اختلاف محض لفظی ہے، معنوی طور پر ساری روایات کا مفہوم ایک ہی ہے، چنانچہ بعض روایات میں ”صلاۃ اللیل“ یعنی رات کی نماز کا ذکر ہے اور بعض روایات میں اس کا ذکر نہیں، لیکن مراد یہی ہے۔ جس روایت میں ”وتر“ کا لفظ ہے، اس سے مراد رات کی نماز ہی ہے، کیوں کہ رات کی پوری نماز، یعنی قیام اللیل پر بھی وتر کا اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ احادیث اور اہلِ علم کی تصریحات سے یہ بات عیاں ہے، مثلاً: ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

« صلاة الليل مثنى مثنى، فإذا خشي أحدكم الصبح صلى ركعة واحدة توتر له ما قد صلى »[2]

”رات کی نماز دو دو رکعت ہے، پھر جب کوئی صبح ہو جانے سے ڈرے تو ایک رکعت پڑھ لے، وہ اس کی ساری نماز کو وتر بنا دے گی۔“

اس حدیث میں پوری صلاۃ اللیل پر وتر کا اطلاق ہوا ہے۔ حافظ ابن رجب (المتوفی: ۷۹۵ھ) بخاری کی مذکورہ بالا حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”يدل على أن هذه الركعة الواحدة جعلت مجموع ما صلى قبلها وتراً، فيكون الوتر هو مجموع صلاة الليل الذي يختم

---

[1] ماحصل از أحسن التنقيح (ص: ٢١٥، ٢١٦)

[2] صحيح البخاري (٢/٢٤، رقم: ٩٩٠)

بوتر، وهذا قول إسحاق بن راهويه، واستدل بقول النبي ﷺ: «أوتروا يا أهل القرآن» وإنما أراد صلاة الليل"[1]

"اللہ کے نبی ﷺ کی یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آخری رکعت پہلی تمام رکعات کو وتر بنا دیتی ہے، پس وتر کا مطلب رات کی پوری نماز ہے جو وتر پر ختم ہوتی ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے، انھوں نے اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اس قول: "اے اہلِ قرآن! وتر پڑھو" سے بھی استدلال کیا ہے کہ اس سے مراد رات کی نماز ہے۔"

بلکہ خود مولانا طاہر گیاوی صاحب نے بھی اپنی اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے:

"تہجد کے ساتھ چونکہ وتر پڑھی جاتی ہے، اس لیے دونوں کے مجموعہ پر محدثین کے نزدیک وتر کا اطلاق مجازاً ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث مذکور میں چار اور تین، چھے اور تین، آٹھ اور تین، دس اور تین یعنی تہجد مع الوتر کو شمار کرایا گیا ہے۔"[2]

ملاحظہ فرمائیں! جہاں گیاوی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ رات کی نماز پر وتر کا اطلاق ان کے حق میں مفید ہوگا، وہاں بڑی آسانی سے رات کی پوری نماز لفظ "وتر" میں سما گئی، لیکن حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں یہی لفظِ "وتر" رات کی مجموعی نماز کے لیے مستعمل ہو گیا تو فوراً اضطراب اور نکارت کی تلوار میان سے باہر آ گئی!

کیا حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کسی اصح حدیث کے خلاف ہے؟

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت عون المعبود

[1] فتح الباري لابن رجب (٩/١١٦)

[2] أحسن التنقيح (ص: ٢٤٦)

کے حوالے سے ذکر کی ہے جو امام مروزی کی کتاب میں موجود ہے اور اسے حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے مخالف بتایا ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ روایت مع سند و متن ذکر کرتے ہیں۔ امام محمد بن نصر المروزی (المتوفی: ۲۹۴ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا إسحاق، أخبرنا النضر بن محمد، عن العلاء بن المسيب، عن عمرو بن مرة، عن طلحة بن يزيد الأنصاري، عن حذيفة رضي الله عنه أنه صلى مع النبي صلى الله عليه وسلم ذات ليلة في رمضان، فكان إذا ركع قال: سبحان ربي العظيم، مثل ما كان قائما، وإذا سجد قال: سبحان ربي الأعلى، مثل ذلك، ثم جلس يقول: رب اغفر لي، رب اغفرلي مثل ما كان قائما، ثم سجد، فقال: سبحان ربي الأعلى مثل ما كان قائما، فما صلى إلا أربع ركعات حتى جاء بلال يناديه إلى الغداة"[1]

''حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کی ایک رات نماز ادا کی ... الخ، تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چار رکعات ہی ادا کیں کہ بلال فجر کی اذان دینے کے لیے پہنچ گئے۔''

اس روایت کو مولانا گیاوی صاحب نے صحیح باور کرانے کے بعد اسے حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے خلاف بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''فن کا یہ اصول مسلم ہے کہ قوی الاسناد کے خلاف اس سے کمزور سند والی روایت ساقط سمجھی جاتی ہے۔''[2]

---

[1] مختصر قيام الليل (ص: ۱۸۱)

[2] أحسن التنقيح (ص: ۲۳۸)

عرض ہے:

أولاً: حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں مذکورہ بالا حدیثِ حذیفہ کو قوی الاسناد بتلانا سینہ زوری کے سوا کچھ نہیں، کیوں کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت سند اور متن دونوں لحاظ سے انتہائی کمزور ہے۔ مختلف کتبِ احادیث میں اس کے متن میں جو شدید اضطراب ہے، اس پر گفتگو بہت تفصیل طلب ہے، لیکن چونکہ منقولہ متن بھی حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے منافی نہیں، نیز اس کی سند بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے سردست ہم اسی متن اور اسی کی اس سند پر بات کریں گے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسے نقل کرنے والے طلحہ بن یزید ہیں، جنھوں نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سنی ہی نہیں جیسا کہ اسی روایت کو امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کرنے کے بعد اس پر خاص یہی جرح کی ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"لم يسمعه طلحة بن يزيد من حذيفة"[1]

''اس حدیث کو طلحہ بن یزید نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا ہے۔''

سنن ابی داود وغیرہ میں یہی روایت موجود ہے، جس میں ابو حمزہ یعنی طلحہ بن یزید اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک ''رجل'' کا واسطہ موجود ہے۔[2]

امام نسائی رحمہ اللہ نے دوسرے مقام پر یہ گمان ظاہر کیا ہے:

"وهذا الرجل يشبه أن يكون صلة بن زفر"[3]

''ہوسکتا ہے کہ ''رجل'' (یہ نامعلوم شخص) ''صلة بن زفر'' ہو۔''

---

[1] السنن الكبرىٰ للنسائي (۱۴۸/۲)

[2] سنن أبي داود، ت الأرنؤوط (۱۵۴/۲، رقم ۸۷۴)

[3] السنن الكبرىٰ للنسائي (۱۴۹/۲)

یہی گمان اور بھی بعض اہلِ علم کا ہے، ان اہلِ علم نے ایسا شاید اس لیے کہا ہے کہ اس کے بیشتر طرق میں حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صلۃ بن زفر نے روایت کیا ہے، لیکن یاد رہنا چاہیے کہ حذیفہ سے یہ حدیث نقل کرنے والے تنہا صلۃ بن زفر ہی نہیں ہیں، بلکہ اور بھی بہت سے رواۃ نے حذیفہ سے اسی حدیث کو الفاظ کے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، مزید یہ کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے صلۃ بن زفر کی نقل کردہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، لیکن اس کے الفاظ اس سے مختلف ہیں۔

اگر واقعتاً یہ رجل، صلۃ بن زفر ہی ہوتے تو کسی نہ کسی طریق میں اس کی صراحت آنی چاہیے تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ طلحہ کبھی تو اس نامعلوم شخص کو ساقط کر کے روایت کرتے ہیں اور کبھی اس کا حوالہ بھی دیتے ہیں تو ''رجل'' کہہ کر اسے مبہم بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اگر صلۃ بن زفر ہی ہوتے تو انھیں ساقط کرنے اور ذکر کرنے کے باوجود بھی مبہم بنانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مزید یہ کہ طلحہ کے اساتذہ میں صلۃ بن زفر کا تذکرہ کسی کے یہاں نہیں ملتا نہ کسی اور مقام پر صلہ سے طلحہ کی کوئی روایت ملتی ہے۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ بہت بعید ہے کہ طلحہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیچ جو مبہم شخص ہے وہ صلۃ بن زفر ہوں، لہٰذا یہ روایت اس انقطاع و ابہام کے سبب ضعیف ہی ہے۔

مولانا طاہر گیاوی صاحب امام نسائی سے انقطاع والی جرح نقل کر کے اس کا جواب یوں دیتے ہیں:

''لیکن ''تہذیب التہذیب'' (۹۲/۵) سے ظاہر ہے کہ طلحہ بن یزید براہِ راست حضرت حذیفہ سے روایت کرتے ہیں۔''[1]

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢٤٠)

حالانکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

"روى عن حذيفة بن اليمان، وقيل عن رجل عنه"

"انھوں نے حذیفہ بن یمان سے روایت کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک نامعلوم شخص کے واسطے سے انھوں نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔"[1]

ملاحظہ فرمائیں! حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے طلحہ کے عدمِ سماع کی طرف بھی یہ کہتے ہوئے اشارہ کر دیا ہے کہ بعض محدثین کے بقول حذیفہ اور ان کے بیچ میں ایک نامعلوم شخص کا واسطہ ہے اور یہ بات درست ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے۔

مزید یہ کہ تہذیب میں اساتذہ و تلامذہ کی جو فہرست دی جاتی ہے وہ صرف روایات کے لحاظ سے ہوتی ہیں، اس میں سماع و عدمِ سماع کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہ بات عام طالب علم کو بھی پتا ہے، لہٰذا طاہر گیاوی صاحب کو اپنی معلومات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

ثانیاً: اگر ہم مبہم شخص کو "صلہ بن زفر" مان بھی لیں تو اس کے متن میں شدید اضطراب ہے، لہٰذا راجح روایت وہی قرار پائے گی جو صحیح مسلم میں ہے اور صحیح مسلم میں اس واقعہ میں رمضان کا لفظ نہیں ہے۔[2]

ثالثاً: اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ یہ رمضان کا واقعہ تھا تو اس کے کسی بھی طریق میں یہ اشارہ تک نہیں ہے کہ یہ تین رات تراویح والا واقعہ ہے، بلکہ بعض طرق میں ایسی تصریحات ہیں جو صاف بتلاتی ہیں کہ یہ تین رات تراویح والے سے الگ

---

[1] تهذيب التهذيب لابن حجر، ط الهند (٢٩/٥)

[2] دیکھیں: صحيح مسلم (٥٣٦/١، رقم (٧٧٢)

واقعہ ہے، مثلاً: مستدرک حاکم کے الفاظ ہیں:

”صليت مع رسول الله ﷺ ليلة من رمضان في حجرة من جريد النخل“[1]

”حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رمضان کی ایک رات اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ایک کمرے میں نماز پڑھی۔“

ظاہر ہے کہ تین رات تراویح والی نماز اس مقام پر نہیں ہوئی تھی اور بعض روایات میں تو یہ بھی ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نبی ﷺ کے ساتھ صرف حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی تھے، کوئی تیسرا تھا ہی نہیں۔[2]

ظاہر ہے کہ تین رات تراویح والے واقعہ میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد شریکِ جماعت تھی۔

رابعاً: سب سے اہم بات یہ کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں گیارہ رکعات سے کم کا تو ذکر ہے، لیکن گیارہ سے زائد کا ذکر نہیں ہے اور ہمارا موقف یہی ہے کہ گیارہ سے زائد رکعات پڑھنا نبی اکرم ﷺ ثابت نہیں ہے، نہ رمضان میں نہ غیر رمضان میں، البتہ گیارہ سے کم رکعات کی ہم نفی نہیں کرتے، لہٰذا اگر کسی روایت میں ملتا ہے کہ نبی ﷺ نے کسی رات گیارہ سے کم تعداد میں نماز پڑھی ہے تو یہ بات حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا یا حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں سے کسی کے خلاف نہیں۔

کیا حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ سے صرف ایک رات کی رکعات معلوم ہوتی ہیں؟

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اپنے الفاظ میں حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کا

---

[1] المستدرك على الصحيحين للحاكم (١/٤٦٦)

[2] دیکھیں: المعجم الأوسط (٤/٣٢١)

مفہوم و مستفاد بتلاتے ہوئے لکھا ہے:

"لم يرد في حديث أبي ذر هذا بيان عدد الركعات التي صلاها رسول الله في تلك الليالي، لكن قد ورد بيانه في حديث جابر رضی اللہ عنہ وهو أنه صلى في تلك الليالى ثمان ركعات ثم أوتر، كما ستقف عليه" [1]

''ابو ذر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ ان راتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی رکعات نماز پڑھی تھیں، لیکن اس کا بیان جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راتوں میں آٹھ رکعات اور وتر پڑھی تھیں، جیسا کہ آگے آپ کے سامنے یہ حدیث آئے گی۔''

اس پر مولانا طاہر گیاوی صاحب نے لکھا ہے:

''حدیثِ جابر میں صرف "ليلة" یعنی ایک رات کی تصریح موجود ہے، مگر کتنی دلیری کے ساتھ اس کو مولانا نے ''لیالی'' بنا لیا ہے۔ کیا یہ بات ان کی علمی ثقاہت کو مشتبہ نہیں کر ڈالتی؟!'' [2]

حالانکہ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے حدیث کے متن میں ''لیالی'' کا لفظ نہیں لکھا ہے بلکہ اپنے کلام میں روایت کا مفہوم و مستفاد بتلاتے ہوئے لکھا ہے اور یہ بالکل درست ہے، جیسا کہ خود احناف کے اکابر اہلِ علم نے بھی ایسا لکھا ہے۔

چنانچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کی الزام تراشی کے جواب میں ایک اہلِ حدیث عالم نے آئینہ دکھایا کہ عین یہی کام علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ سے پہلے علامہ

---

[1] تحفة الأحوذي (٣/٤٣٨)

[2] أحسن التنقيح (ص: ١٤)

عینی اور علامہ لکھنوی رحمہ اللہ بھی کر چکے ہیں، انھوں نے بھی حدیثِ جابر سے استدلال کرتے ہوئے ''ليالي'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے بتلایا کہ ان راتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعات اور وتر پڑھی تھیں۔ علامہ عینی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۵ھ) نے لکھا ہے:

''فإن قلت: لم يبين في الروايات المذكورة عدد هذه الصلاة التي صلاها رسول الله ﷺ في تلك الليالي؟ قلت: روى ابن خزيمة وابن حبان من حديث جابر رضي الله عنه ... الخ''[1]

''اگر آپ کہیں کہ مذکورہ روایات میں اس نماز کی تعدادِ رکعات کا ذکر نہیں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راتوں میں پڑھا تھا تو میں کہتا ہوں کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ...الخ۔''

یعنی علامہ عینی نے ایک رات نہیں، بلکہ راتوں میں پڑھی گئی نماز کی تعدادِ رکعات کے بیان میں حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کو پیش کیا۔

نیز علامہ عبدالحی لکھنوی (المتوفی: ۱۳۰۴ھ) نے لکھا ہے:

''وأمّا العدد فروى ابن حبّان وغيره أنّه صلى بهم في تلك الليالي ثمان ركعات، وثلاث ركعات وتراً''[2]

''جہاں تک (مسنون رکعاتِ تراویح کی) تعداد کی بات ہے تو ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راتوں میں آٹھ رکعات اور تین رکعاتِ وتر پڑھی تھیں۔''

یہ آئینہ دیکھنے کے بعد طاہر گیاوی صاحب ہڑبڑا گئے کہ جو کیچڑ انھوں نے

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١٧٧/٧)

[2] عمدة الرعاية بتحشية شرح الوقاية (١٦٦/١)

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ پر اچھالا تھا خود انھیں کے اکابر پر آ گرا ہے۔ پھر اپنے اکابر کے چہروں کو صاف کرنے کے لیے طاہر گیاوی صاحب نے اپنی فقہی بصیرت سے کچھ اس طرح پردہ اٹھایا:

''ان حنفی علما نے ابن حبان اور ابن خزیمہ کے حوالے سے حدیثِ جابر کو نقل فرمایا ہے جس میں ''لیلة'' کا لفظ موجود ہی نہیں ہے، اس لیے ان کے سامنے جو روایت ہے اس میں ایک رات کی قید نہ ہونے کی وجہ سے بظاہر عموم سمجھا جاتا تھا اور اسی ظاہری معنی کی بنیاد پر انھوں نے لکھا ہے جو زیادہ سے زیادہ بلا تحقیق ہونے کی وجہ سے سہو کہا جائے گا، لیکن مولانا عبدالرحمان صاحب کے سامنے میزان الاعتدال والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، چنانچہ وہ ذہبی کی ''إسناده وسط'' سے استدلال بھی فرما رہے ہیں، بنا بریں ان کے سامنے جو روایت ہے اس میں ''لیلة'' کی صراحت کے ساتھ قید موجود ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ''لیالي'' تحریر فرما رہے ہیں، جو بلا ارادہ یا غفلت کی وجہ سے نہیں، بلکہ بلاشبہہ قصداً اور ارادتاً ہے، اس لیے وہ اعتراض کی زد سے نہیں نکل سکتے۔''[1]

یہ صفائی بیان پڑھ کر لگتا ہے کہ طاہر گیاوی صاحب کی صرف فقہی بصیرت ہی نہیں، بلکہ بصارت بھی افلاس کا شکار ہے۔ موصوف کو اس حدیث کے ایک طریق میں وارد لفظ ''لیلة'' تو نظر آ گیا، لیکن اس حدیث کا پورا سیاق نہ انھیں دکھائی دے رہا ہے اور نہ سمجھ ہی میں آ رہا ہے۔

دراصل لفظ ''لیلة'' کو اس حدیث سے نکال بھی دیا جائے، تب بھی اس

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ٢١٤)

حدیث کا پورا سیاق پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ کی شرکت صرف آخری رات میں ہوئی تھی، اس کے بعد اگلی رات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت ترک کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صرف ابن خزیمہ اور ابن حبان ہی کے حوالے سے اس حدیث کو نقل کیا جس میں لفظ "لیلة" کا کوئی وجود نہیں تھا، پھر بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا:

"احتمل أن يكون جابر ممن جاء في الليلة الثالثة فلذلك اقتصر على وصف ليلتين"[1]

"اس بات کا احتمال ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے تیسری رات شرکت کی تھی، اسی لیے انھوں نے صرف دو رات کی حالت بیان کی ہے (یعنی ایک رات باجماعت نماز پڑھنے کی اور دوسری رات جماعت ترک کرنے کی)۔"

ملاحظہ فرمائیں! حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے سامنے حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے جو الفاظ ہیں، اس میں "لیلة" کا لفظ ہرگز نہیں، پھر بھی وہ جابر رضی اللہ عنہ کی شرکت صرف ایک رات میں مان رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ لفظ "لیلة" کے بغیر بھی حدیث کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے، کیوں کہ جابر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک رات نماز پڑھنے کا تذکرہ کیا اور اس کے فوراً بعد کہا کہ اگلی رات نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے آئے ہی نہیں۔

اب طاہر گیاوی صاحب سے گذارش ہے کہ بصارت اور بصیرت میں ذرا بھی حیات باقی ہو تو انھیں بروئے کار لاتے ہوئے بتلائیں کہ جب حدیث کا سیاق ہی واضح طور پر بتلا رہا ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ صرف ایک ہی رات شریکِ جماعت تھے تو پھر اس کے باوجود بھی علامہ عینی اور علامہ لکھنوی نے "ليالي" کا لفظ کیسے استعمال کر لیا؟!

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (۱۳،۱۲/۳)

بلکہ ہم یہ بھی بتلا دیں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، جنھوں نے واضح لفظوں میں صراحت کی ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ صرف ایک رات میں شریک ہوئے تھے، انھوں نے بھی جب تین راتوں میں پڑھی گئی نماز کی تعدادِ رکعات پر حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بات کی، تو لفظ ''ليالي'' ہی استعمال کیا۔[1]

دراصل علامہ عینی ہوں یا حافظ ابن حجر، علامہ لکھنوی ہوں یا علامہ مبارکپوری، سب کا استدلال یوں ہے کہ تین راتوں میں تعدادِ رکعات کی بابت حدیثِ جابر کے علاوہ کوئی روایت نہیں ملتی اور حدیثِ جابر کے مطابق جابر رضی اللہ عنہ نے ان تین میں سے ایک رات کی تعداد بتلا دی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہی تعداد تینوں رات میں بھی تھی۔ اسی لیے اگرچہ حدیثِ جابر کا سیاق صرف ایک رات میں جابر رضی اللہ عنہ کی شرکت بتلا رہا ہے، اس کے باوجود بھی مذکورہ اہلِ علم نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہی تعداد تینوں رات کی تھی۔

لیکن گیاوی صاحب بدقسمتی سے اہلِ علم کے اس طریقۂ استنباط کو سمجھ ہی نہ سکے، جس کے نتیجے میں ایک طرف تو علامہ مبارکپوری پر بدبودار الزام لگایا اور دوسری طرف علامہ عینی وغیرہ کا بھی لحاظ نہ رکھ سکے اور اپنی کج فہمی اور لایعنی فلسفہ ''عموم'' کو ان حضرات کی طرف بھی منسوب کر ڈالا۔



[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (۱۲/۳)

چوتھی حدیث

امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنا أبو يعلیٰ[1]، قال: حدثنا عبد الأعلى بن حماد النرسي، قال: حدثنا يعقوب القمي، قال: حدثنا عيسى بن جارية، قال: حدثنا جابر بن عبد الله، قال: جاء أبي بن كعب إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! كان مني الليلة شيء في رمضان. قال: وما ذاك يا أبي؟ قال: نسوة في داري قلن: إنا لا نقرأ القرآن، فنصلي بصلاتك، قال: فصليت بهن ثماني ركعات، ثم أوترت. قال: فكان شبه الرضا، ولم يقل شيئا"

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! گزشتہ رات رمضان میں مجھ سے ایک چیز سرزد ہوئی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے اُبی! وہ کیا چیز ہے؟ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے گھر میں خواتین نے مجھ سے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتیں، لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ

---

[1] صحيح ابن حبان (الإحسان: ٦/٢٩٠، رقم ٢٥٤٩) وإسناده صحيح

کی اقتدا میں نماز پڑھیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے انھیں آٹھ رکعات تراویح جماعت سے پڑھائیں، پھر وتر پڑھایا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمایا اور اس پر کوئی نکیر نہ کی۔''

یہ حدیث بھی صحیح ہے۔ عیسیٰ بن جاریہ اور یعقوب القمی کا تعارف گذشتہ روایت کے تحت ہو چکا ہے۔ عبد الاعلیٰ بن حماد الباہلی، بخاری، مسلم اور ابو داود وغیرہ کے رجال میں سے ہیں اور بالاتفاق ثقہ ہیں۔ کسی بھی امام نے ان پر کوئی جرح نہیں کی۔

امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

"المحدث الثبت"[1] ''یہ محدث اور ثبت ہیں۔''

معلوم ہوا کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اسی لیے امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسی سند سے اسے صحیح ابن حبان میں روایت کیا ہے۔[2]

امام ہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"رواه أبو يعلىٰ والطبراني بنحوه في الأوسط وإسناده حسن"[3]

''اسے ابو یعلیٰ اور طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔''

کیا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ رمضان کا نہیں ہے؟

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ واقعہ رمضان کا نہیں ہے، اس کے لیے موصوف نے سب سے پہلے زوائد مسند سے ایک

---

1. الكاشف للذهبي (۱/۶۱۰)
2. دیکھیں: صحیح ابن حبان (۶/۲۹۰)
3. مجمع الزوائد للهيثمي (۲/۹۱)

روایت پیش کی ہے، جس کا ضعف اس قدر واضح تھا کہ ایک معمولی طالب علم بھی محض سند دیکھ کر ہی مطلع ہو جاتا، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی ''رجل'' کے ذکر کے ساتھ مبہم ہے۔ لیکن مولانا گیاوی صاحب نے مسند احمد سے پوری سند نقل کرنے کے بجائے ابتدا سے ضعف والا حصہ حذف کر کے روایت نقل کر دی۔ ہم ذیل میں یہ پوری روایت مع سند نقل کرتے ہیں۔ امام عبد اللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۰ھ) فرماتے ہیں:

"حدثني أبو بكر بن أبي شيبة عبد الله بن محمد، حدثنا رجل، سماه، حدثنا يعقوب بن عبد الله الأشعري، حدثنا عيسى بن جارية، عن جابر بن عبد الله، عن أبي بن كعب، قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! عملت الليلة عملا قال: ما هو؟ قال: نسوة معي في الدار قلن لي: إنك تقرأ ولا نقرأ، فصل بنا، فصليت ثمانيا والوتر، قال: فسكت رسول الله ﷺ قال: فرأينا أن سكوته رضا بما كان"[3]

''اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کل رات میں نے ایک کام کیا۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا: وہ کیا؟ تو اس نے کہا: میرے ساتھ گھر کی خواتین تھیں، وہ کہنے لگیں: آپ قرآن پڑھنا جانتے ہیں اور ہم نہیں جانتے، تو آپ ہمیں نماز پڑھا دیں تو میں نے انھیں آٹھ رکعات اور وتر پڑھائے، کہتے

[1] مسند أحمد، ط الميمنية (١١٥/٥)

ہیں: اس پر اللہ کے رسول ﷺ خاموش ہو گئے تو ہم نے جان لیا کہ آپ کی خاموشی اس کام کے لیے رضا مندی تھی۔''

ملاحظہ فرمائیں! سند میں ''رجل'' ایک مبہم راوی ہے جس کے سبب یہ روایت ضعیف ہے اور اس کا متن بھی مختلف ہے۔ صحیح روایت میں یہ واقعہ خود ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ہے، لیکن اس ضعیف روایت میں یہ واقعہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کسی اور سے نقل کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسی ضعیف روایت کا سہارا لیتے ہوئے اس روایت کو مضطرب کہنے کی کوشش بھی کی ہے، حالانکہ جب یہ روایت ہی ثابت نہیں تو اسے بنیاد بنا کر اضطراب کا اعتراض بھی بے معنی اور لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

- طبرانی کی ایک اور روایت میں بھی رمضان کا ذکر نہیں ہے اس کی سند کا حال بھی دیکھ لیں۔ امام طبرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۶۰ھ) فرماتے ہیں:

''حدثنا عثمان بن عبيد الله الطلحي قال: نا جعفر بن حميد قال: نا يعقوب القمي، عن عيسى بن جارية، عن جابر قال: جاء أبي فقال: يا رسول الله! كان مني الليلة شيء، إن نساء اجتمعن في داري لا يقرأن، فصليت بهن ثماني ركعات، ثم أوترت فسكت النبي ﷺ، فكان شبه الرضا''[1]

''جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابی رضی اللہ عنہ آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کل رات مجھ سے ایک عمل ہوا ہے، میرے گھر کچھ خواتین جمع ہوئیں، جو قرآن نہیں پڑھ سکتی تھیں تو میں نے انھیں آٹھ رکعات نماز پڑھائی، پھر وتر پڑھایا تو نبی ﷺ خاموش ہو گئے تو یہ رضا مندی جیسا تھا۔''

---

[1] المعجم الأوسط للطبراني (١٠٨/٤)

اس کی سند میں ''عثمان بن عبیداللہ الطلحی، الکوفی'' ہے اس کی کوئی معتبر توثیق نہیں ملی، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ ہمارے علم کی حد تک یہی دو روایات ہیں جن میں رمضان کا ذکر نہیں ملتا ہے اور یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔

بعض روایات میں ''يعني رمضان'' کے الفاظ ہیں جس سے گیاوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لفظ مدرج ہے، یعنی ابی بن کعب کے علاوہ بعد کے کسی راوی کی طرف سے اضافہ ہے، اس کی تردید کی لیے یہی کافی ہے کہ ہم نے یہاں اصل روایت صحیح ابن حبان سے جو پیش کی ہے جس میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں رمضان کا لفظ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری روایت میں جو ''يعني رمضان'' کے الفاظ ہیں وہ جابر رضی اللہ عنہ ہی کے ہیں، جسے انھوں نے روایت بالمعنی کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے۔



باب 2

رکعاتِ تراویح اور آثارِ صحابہ

عہدِ فاروقی میں آٹھ رکعاتِ تراویح

امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں:

"عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، أَنَّهُ قَالَ: أَمَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَتَمِيمًا الدَّارِيَّ أَنْ يَقُومَا لِلنَّاسِ بِإِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً قَالَ: وَقَدْ كَانَ الْقَارِئُ يَقْرَأُ بِالْمِئِينَ، حَتَّى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ، وَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ إِلَّا فِي فُرُوعِ الْفَجْرِ"[1]

"سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو گیارہ رکعات تراویح پڑھانے کا حکم دیا۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ امام سو سو آیتیں ایک رکعت میں پڑھتا تھا، یہاں تک کہ ہم طویل قیام کی وجہ سے لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے

[1] الموطأ للإمام مالك (١/١١٥) وإسناده صحيح على شرط الشيخين، ومن طريق مالك رواه النسائي في السنن الكبرىٰ (٣/١١٣) رقم(٤٦٨٧)، و الطحاوي في شرح معاني الآثار (١/٢٩٣) رقم(١٧٤١)، و أبوبكر النيسابوري في الفوائد (ق ١٣٦/أ)، و البيهقي في السنن الكبرىٰ (٢/٤٩٦) رقم (٤٣٩٢) كلهم من طريق مالك به.

تھے اور فجر کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔‘‘

یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے، اس کی سند میں کسی علت کا نام ونشان تک نہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعات تراویح اور تین رکعات وتر ہی کا حکم دیا اور ان کے دور میں آٹھ رکعات تراویح ہی ہوتی تھیں۔ اس روایت کے برخلاف کسی ایک بھی روایت میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ عہدِ فاروقی میں یا اس سے قبل یا اس کے بعد کسی ایک بھی صحابی نے آٹھ رکعات سے زائد تراویح پڑھی ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ تراویح کی آٹھ رکعات ہونے پر تمام صحابہ کا اجماع تھا۔

اب ذیل میں اس روایت کی سند پر معلومات پیشِ خدمت ہیں۔

سند کے رجال کا تعارف

مذکورہ بالا روایت کی سند بالکل صحیح اور بے داغ ہے۔ اس روایت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے صحابیِ رسول عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں۔ پھر امام مالک اور ان صحابی کے بیچ صرف ایک راوی محمد بن یوسف ہیں جو بخاری و مسلم کے زبردست ثقہ راوی ہے۔

اب فرداً فرداً اس سند کے رجال کا تعارف ملاحظہ ہو:

- عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

آپ صحابی اور خلیفۂ دوم ہیں، اس لیے مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

- سائب بن یزید رضی اللہ عنہ۔

آپ بھی صحابی ہیں جیسا کہ بخاری کی ایک روایت میں اس کا ثبوت ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ يُونُسَ، حَدَّثَنا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، قَالَ: حُجَّ بِي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَأَنَا ابْنُ سَبْعِ سِنِينَ"[1]

''محمد بن یوسف رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرایا گیا تھا اور میں اس وقت سات سال کا تھا۔''

لہٰذا جب آپ بھی صحابی ہیں تو آپ کے بھی مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔

❁ محمد بن یوسف المدنی رحمہ اللہ۔

آپ بخاری و مسلم کے زبردست ثقہ راوی ہیں۔ آپ کی ثقاہت و اتقان پر اہلِ فن کا اتفاق ہے۔ میرے ناقص مطالعے کی حد تک کسی بھی ناقد امام نے ان پر کوئی جرح نہیں کی، لہٰذا ان کے بارے میں بھی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان سے متعلق اہلِ فن کے اقوال کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے انھیں "ثقة ثبت" کہا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"محمد بن يوسف بن عبد الله الكندي المدني الأعرج ثقة ثبت"[2]

❁ امام مالک رحمہ اللہ۔

آپ ائمۂ اربعہ میں سے ایک معروف امام ہیں، آپ بھی محتاجِ تعارف نہیں۔

معلوم ہوا کہ روایتِ مذکورہ بہت ہی بلند پایہ، ثقہ اورمعروف ومشہور روات

---

[1] صحيح البخاري، كتاب جزاء الصيد، باب حج الصبيان، رقم (١٨٥٨)

[2] تقريب التهذيب لابن حجر، رقم (٦٤١٤)

سے منقول ہے، لہٰذا اس روایت کی سند اعلیٰ درجے کی صحیح ہے۔

فائدہ: روایتِ مذکورہ کے تمام رجال نہ صرف یہ کہ بخاری و مسلم کے رجال میں سے ہیں، بلکہ عین اسی سلسلۂ سند سے بخاری و مسلم میں احادیث بھی منقول ہیں۔

سندِ مذکور سے بخاری میں روایت:

① امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ يُونُسَ، حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، قَالَ: حُجَّ بِي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَأَنَا ابْنُ سَبْعِ سِنِينَ"[1]

② امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنَا حَاتِمٌ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، قَالَ: صَحِبْتُ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللّٰهِ، وَسَعْدًا، وَالمِقْدَادَ بْنَ الأَسْوَدِ، وَعَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ عَوْفٍ رضی اللہ عنہم، فَمَا سَمِعْتُ أَحَدًا مِنْهُمْ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ إِلَّا أَنِّي سَمِعْتُ طَلْحَةَ يُحَدِّثُ عَنْ يَوْمِ أُحُدٍ"[2]

③ "حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِي الأَسْوَدِ، حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، قَالَ: سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ، قَالَ: صَحِبْتُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ عَوْفٍ، وَطَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللّٰهِ، وَالمِقْدَادَ، وَسَعْدًا رضی اللہ عنہم فَمَا سَمِعْتُ أَحَدًا مِنْهُمْ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ إِلَّا أَنِّي

---

[1] صحيح البخاري، كتاب جزاء الصيد، باب حج الصبيان، رقم (١٨٥٨)

[2] صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من حدث بمشاهده في الحرب، رقم (٢٨٢٤)

سَمِعْتُ طَلْحَةَ يُحَدِّثُ عَنْ يَوْمِ أُحُدٍ“[1]

سندِ مذکور سے مسلم میں روایت:

امام مسلم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

”حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمٍ، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، قَالَ: سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ، يُحَدِّثُ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: شَرُّ الْكَسْبِ مَهْرُ الْبَغِيِّ، وَثَمَنُ الْكَلْبِ، وَكَسْبُ الْحَجَّامِ“[2]

لطائفِ سند:

اول: صحابی سے روایت کرنے والے بھی صحابی ہیں۔

دوم: علو۔ امام مالک رحمہ اللہ اور صحابی کے بیچ صرف ایک راوی کا فاصلہ ہے، یعنی یہ روایت حد درجہ عالی ہے۔

سوم: مدنی سند۔ بشمول امام مالک سند کے تمام رجال مدنی ہیں۔ یعنی مذکورہ روایت مدنی سند سے منقول ہے۔

گھر کی شہادت:

مولانا نیموی حنفی (المتوفی: ۱۳۲۲ھ) نے روایتِ مذکورہ کی سند کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے: ”إسناده صحيح“[3] یعنی اس کی سند صحیح ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب إذ همت طائفتان منكم ....، رقم (٤٠٦٢)

[2] صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم ثمن الكلب، وحلوان الكاهن ....، رقم (١٥٦٨)

[3] آثارالسنن (٢/٢٥٠)

روایتِ مذکورہ پر اعتراضات:

اس روایت پر دو قسم کے اعتراضات کیے جاتے ہیں:

پہلی قسم: متن پر اعتراض۔

دوسری قسم: رواۃ پر اعتراض۔

ذیل میں ہم دونوں قسموں پر مشتمل اعتراضات کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔

اعتراض کی پہلی قسم: متن پر اعتراض

متن پر پہلا اعتراض: تعدادِ رکعات کے بیان میں اختلاف:

کہا جاتا ہے کہ اس روایت میں رکعاتِ تراویح کی تعداد کے بیان میں اضطراب ہے۔ کسی میں گیارہ کی تعداد بتائی گئی ہے تو کسی میں تیرہ کی اور کسی میں اکیس کی، لہٰذا یہ روایت مضطرب ہے۔

عرض ہے کہ گیارہ کی تعداد کے علاوہ جس طریق میں اکیس کی تعداد آئی ہے وہ ثابت ہی نہیں، تو پھر اضطراب کہاں؟ جہاں تک تیرہ کی تعداد کا معاملہ ہے تو اسے محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے:

أولاً: یہ گیارہ کی تعداد کے خلاف نہیں، بلکہ ان میں تطبیق ممکن ہے جس کی تفصیل اگلی سطور میں آرہی ہے۔ یاد رہے کہ علامہ نیموی حنفی رحمہ اللہ نے بھی تطبیق ہی کا موقف اختیار کیا ہے۔ کما سیأتي.

ثانیاً: اگر تطبیق کی صورت نہ اختیار کی جائے تو لازمی طور پر ابن اسحاق کی روایت شاذ ہو گی، کیوں کہ ابن اسحاق نے تنہا، محمد بن یوسف سے تیرہ کی تعداد نقل کی ہے اور کسی بھی دوسرے راوی نے ان کی متابعت نہیں کی، جب کہ امام مالک رحمہ اللہ

نے گیارہ کی تعداد نقل کی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ حافظہ میں ابن اسحاق سے بڑھ کر ہیں۔ مزید یہ کہ دیگر پانچ راویوں نے بھی امام مالک کی متابعت کی ہے، کما سیأتي۔ لہٰذا پانچ راویوں کی جماعت کے بالمقابل تنہا ابن اسحاق کے بیان کی کوئی حیثیت نہیں، بالخصوص جب کہ ان کے حفظ پر بھی لوگوں نے کچھ کلام کیا ہے۔

ثالثاً: احناف تو محمد بن اسحاق کو کذاب و دجال اور نا جانے کیا کیا کہتے پھرتے ہیں، پھر کس منہ سے وہ اس کی اس روایت کو ایک جماعت کی روایات کے خلاف پیش کر رہے ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ حضرات احناف قراءت خلف الامام وغیرہ کے مسئلے میں امام مالک رحمہ اللہ ہی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ امام مالک نے محمد بن اسحاق کو دجال کہا ہے، لیکن جب تراویح کی بات آتی ہے تو امام مالک ہی کے خلاف اس کی روایت پیش کر دیتے ہیں!!

الغرض گیارہ کی تعداد کی مخالفت ثابت نہیں، لہٰذا اضطراب کا دعویٰ فضول ہے، نیز اضطراب اس وقت تسلیم کیا جاتا ہے جب ترجیح کی کوئی صورت نہ ہو، لیکن اگر ترجیح کی صورت موجود ہو تو اضطراب کا دعویٰ مردود ہے۔ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ (المتوفی: ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں:

”المضطرب من الحديث هو الذي تختلف الرواية فيه فيرويه بعضهم على وجه، وبعضهم على وجه آخر مخالف له، وإنما نسميه مضطربا إذا تساوت الروايتان، أما إذا ترجحت إحداهما بحيث لا تقاومها الأخرى بأن يكون راويها أحفظ، أو أكثر صحبة للمروي عنه، أو غير

ذلك من وجوه الترجيحات المعتمدة، فالحكم للراجحة، ولا يطلق عليه حينئذ وصف المضطرب‘‘[1]

’’مضطرب وہ حدیث ہے جس کی روایت میں اس طرح اختلاف ہو کہ بعض ایک طرح روایت کریں اور بعض اس کے مخالف دوسری طرح روایت کریں۔ ہم ایسی حدیث کو اس وقت مضطرب کہیں گے جب طرفین کی روایت مساوی اور ایک درجے کی ہو، لیکن اگر دونوں میں سے کوئی روایت راجح قرار پائے اس طرح کہ دوسری روایت اس کے ہم پلہ نہ ہو، بایں طور کہ اس کے راوی احفظ ہوں یا مروی عنہ کے ساتھ اس نے زیادہ مدت گذاری ہو، یا اس کے علاوہ معتمد وجوہِ ترجیحات میں سے کوئی ہو تو حکم راجح روایت کے اعتبار سے لگے گا اور ایسی صورت میں یہ روایت مضطرب نہیں ہوگی۔‘‘

متن پر دوسرا اعتراض، رواۃ نے کبھی تعداد بیان کی ہے اور کبھی نہیں:

أولاً: یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں، کیوں کہ محدثین اختصار کی خاطر اپنی بیان کردہ روایت میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں، اس طرح کی باتوں کو اضطراب کی دلیل بنانا اس فن سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر اس طرح کی باتوں کو بنیاد بنا کر اضطراب کا دعویٰ کیا جانے لگا تو پھر قرآنی آیات بھی مضطرب نظر آنے لگیں گی، کیوں کہ قرآن میں ایک بات ایک مقام پر مختصر ہے جب کہ دوسرے مقام پر مفصل ہے اور یہ سارا کلام صرف اللہ واحد ہی کا ہے۔

---

[1] مقدمة ابن الصلاح (ص: ٩٤) اس سلسلے میں مزید اقوال کے لیے دیکھیں: انوار البدر (ص: ۵۲۲۔۶۲۵)

دوم: اس شبہے کی بنیاد جن روایات پر قائم ہے، یعنی وہ روایات جن میں تعداد کا ذکر نہیں، وہ محلِ نظر ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں ایک ہی کتاب سے دو روایات پیش کی جاتی ہیں، دونوں کی حقیقت ملاحظہ ہو:

پہلی روایت: امام عمر بن شبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۲ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا أَبُوْ ذُكَيْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ يُوْسُفَ الْأَعْرَجَ، يُحَدِّثُ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ، قَالَ: جَاءَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ لَيْلَةً مِنْ لَيَالِيْ رَمَضَانَ إِلَى مَسْجِدِ الرَّسُوْلِ ﷺ، وَالنَّاسُ مُتَفَرِّقُوْنَ، يُصَلِّي الرَّجُلُ بِنَفْسِهِ، وَيُصَلِّي الرَّجُلُ وَمَعَهُ النَّفَرُ فَقَالَ: لَوِ اجْتَمَعْتُمْ عَلَى قَارِئٍ وَاحِدٍ كَانَ أَمْثَلَ، ثُمَّ عَزَمَ فَجَمَعَهُمْ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، ثُمَّ جَاءَ مِنَ الْعَالِيَةِ وَقَدِ اجْتَمَعُوْا عَلَيْهِ وَاتَّفَقُوْا، فَقَالَ: نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هَذِهِ، وَالَّتِيْ يَنَامُوْنَ عَنْهَا أَفْضَلُ مِنَ الَّتِيْ يُصَلُّوْنَ، وَكَانَ النَّاسُ يُصَلُّوْنَ أَوَّلَ اللَّيْلِ وَيَرْقُدُوْنَ آخِرَهُ"[1]

یہ روایت ضعیف ہے، کیوں کہ مصنف کے استاذ ابو ذکیر (ذال سے) نا معلوم راوی ہیں۔ بعض نے اس کی تعیین ابو زکیر (زاء سے) سے کی ہے جن کا نام یحییٰ بن محمد بن قیس البصری المحاربی الضریر ہے، لیکن عرض ہے کہ یہ راوی بھی ضعیف ہے۔

❁ امام عقیلی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۲ھ) فرماتے ہیں:

"لا يتابع على حديثه"[2] "اس کی حدیث کی متابعت نہیں ہوتی۔"

---

[1] تاريخ المدينة لابن شبة (٧١٣/٢)

[2] الضعفاء الكبير للعقيلي (٤٢٧/٤)

امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

"أبو زكير ضعيف"[1] "ابوزکیر ضعیف ہے۔"

امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"كان ممن يقلب الأسانيد ويرفع المراسيل من غير تعمد، فلما كثر ذلك منه صار غير محتج به إلا عند الوفاق"[2]

"یہ ان لوگوں میں سے تھا جو غیر ارادی طور پر اسانید کو پلٹ دیتے تھے اور مرسل کو مرفوع بیان کرتے تھے۔ جب اس کے اندر یہ غلطی کثرت سے ہونے لگی تو یہ نا قابلِ احتجاج ہو گیا، مگر جب اس کی موافقت مل جائے۔"

دوسری روایت: امام عمر بن شبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۲ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عِيسَى قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهْبٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ، وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ، وَأُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ، أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ يُوسُفَ، حَدَّثَهُمْ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، قَالَ: جَمَعَ عُمَرُ رضي الله عنه النَّاسَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَتَمِيمٍ الدَّارِيِّ، فَكَانَا يَقُومَانِ فِي الرَّكْعَةِ بِالْمِئِينَ مِنَ الْقُرْآنِ، حَتَّى إِنَّ النَّاسَ لَيَعْتَمِدُونَ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ، وَيَتَنَوَّطُ أَحَدُهُمْ بِالْحَبْلِ الْمَرْبُوطِ بِالسَّقْفِ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ، وَكُنَّا نَخْرُجُ إِذَا فَرَغْنَا وَنَحْنُ نَنْظُرُ إِلَى بُزُوغِ الْفَجْرِ"[3]

یہ اختصار ابن وہب کی طرف سے ہے، کیوں کہ موصوف نے اس سند میں

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (۱۸٤/۹) وإسناده صحيح

[2] المجروحين لابن حبان (۱۱۹/۳)

[3] تاريخ المدينة لابن شبة (۷۱٦/۲)

مذکور اپنے تینوں اساتذہ (امام مالک، اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر) سے ایک ہی سیاق میں روایت نقل کی اور روایت کے صرف اسی مضمون کو پیش کیا جسے ان کے تمام اساتذہ نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے، کیوں کہ یہاں ان کے اساتذہ میں عبداللہ بن عمر بن حفص العمری بھی ہیں اوران سے تعداد والی روایت منقول نہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ تعداد بیان کرتے تو اس روایت کو اپنے تمام اساتذہ سے ایک ہی سیاق میں نقل نہ کر سکتے، لہٰذا انھوں نے روایت کے صرف اسی مضمون کو نقل کیا ہے جس کے بیان میں ان کے تمام اساتذہ متفق ہیں اور متفقہ مضمون بیان کرنے کے لیے اختصار تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ابن وہب نے یہاں اپنے تمام اساتذہ کی روایات سے وہ حصہ نقل کیا ہے جسے سب نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے۔

یاد رہے کہ اگر کوئی راوی مختلف اساتذہ اور مختلف اسانید کے ساتھ ایک ہی روایت بیان کرے اور اس کے تمام اساتذہ اس روایت پر متفق نہ ہوں تو یہ چیز راوی پر جرح کا سبب بن جاتی ہے جیسا کہ محمد بن عمرالواقدی کا معاملہ ہے، اس پر جن اسباب کی بنا پر جرح ہوئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مختلف اسانید سے ایک ہی مضمون کی روایت نقل کرتے تھے، حالانکہ اس مضمون پر تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوتا تھا، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ نے محمد بن واقدی پر جرح کرتے ہوئے کہا ہے:

”ليس أنكر عليه شيئا، إلا جمعه الأسانيد، ومجيئه بمتن واحد على سياقة واحدة عن جماعة ربما اختلفوا“[1]

”اس پر جو چیز قابلِ نکیر ہے وہ یہی ہے کہ یہ مختلف اسانید کو ایک ہی متن اور ایک ہی سیاق سے ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں جب کہ بعض

---

[1] تاريخ بغداد للخطيب البغدادي (٢٤/٤) وإسناده حسن بالشواهد

کے الفاظ مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔''

لہٰذا محدثین جب مختلف طرق سے کوئی ایک روایت پیش کرتے ہیں تو روایت کا صرف وہ حصہ پیش کرتے ہیں جو سارے طرق سے منقول ہو، یا کبھی کمی بیشی کے ساتھ بھی نقل کر دیتے ہیں اور ساتھ میں وضاحت بھی کر دیتے ہیں کہ کس کے طریق میں کیا فرق ہے، بصورتِ دیگر یہ طرزِ عمل ان پر جرح کا موجب ہوگا۔

الغرض ابن وہب نے ایک ہی مضمون اپنے متعدد اساتذہ سے نقل کیا ہے اور اختصار کی غرض سے صرف وہ مضمون نقل کیا ہے جس پر سب کا اتفاق تھا۔ متفقہ مضمون بیان کرنے کے لیے اختصار تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے جس بات کو بیان کرنے میں سب متفق نہ تھے، اس کا تذکرہ ابن وہب نے چھوڑ دیا ہے۔

اب رہا مسئلہ یہ کہ ان تینوں اساتذہ میں کس کس نے تعداد بیان کی ہے اور کس کس نے نہیں؟ تو عرض ہے کہ اس سند میں مذکوران کے اساتذہ میں سوائے عبداللہ بن عمر بن حفص العمری کے بقیہ دونوں اساتذہ سے تعداد منقول ہے جسے خود ابن وہب ہی نے دوسرے مقامات پر بیان کیا ہے۔

- چنانچہ ابن وہب نے اپنے استاذ امام مالک سے تعداد کا بیان امام طحاوی کی روایت میں نقل کیا ہے۔[1] نیز ابوبکر نیسا پوری کی روایت میں بھی نقل کیا ہے۔[2] اسی طرح ابن وہب نے اپنے استاذ اسامہ بن زید سے تعداد کا بیان امام ابوبکر نیسا پوری کی روایت میں نقل کیا ہے۔[3]
- اب باقی بچے ان کے استاذ عبداللہ بن عمر بن حفص العمری تو یہ موصوف ہی ہیں

---

[1] دیکھیں: شرح معاني الآثار (١/٢٩٣، رقم: ١٧٤٠) وإسناده صحيح.

[2] دیکھیں: فوائد أبي بكر النيسابوري (ق ١٣٦/أ) واسناده صحيح

[3] دیکھیں: فوائد أبي بكر النيسابوري (ق ١٣٥/أ) وإسناده صحيح

جنھوں نے اپنی روایت میں تعداد بیان نہیں کی اور یہ حضرت جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ ان کے بارے میں بعض اہلِ فن کے اقوال ملاحظہ ہوں:

- امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں:
"ضَعِيفٌ"[1] "یہ ضعیف ہے۔"
- امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:
"ضَعِيف"[2] "یہ ضعیف ہے۔"
- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:
"هُوَ يَزِيدُ فِي الْأَسَانِيدِ"[3] "یہ سندوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔"
- امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:
"فَلَمَّا فحش خَطؤُهُ اسْتحق التّرْك"[4]
"جب اس کی غلطیاں فحش ہوگئیں تو یہ ترک کا مستحق ہوگیا۔"
- امام حاکم رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں:
"لم يذكر إلا بسوء الحفظ فقط"[5]
"یہ صرف برے حافظہ کے ساتھ مذکور ہیں۔"
- امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:
"اَلْعُمَرِيُّ غَيْرُ مُحْتَجٍّ بِهِ"[6] "عمری ناقابلِ احتجاج ہے۔"

---

[1] الضعفاء الكبير للعقيلي (۲/۲۸۰) وإسناده صحيح
[2] العلل ومعرفة الرجال لأحمد (۲/۶۰۵) وإسناده صحيح
[3] الضعفاء الكبير للعقيلي (۲/۲۸۰) وإسناده صحيح
[4] المجروحين لابن حبان (۲/۷)
[5] المستدرك للحاكم (۳/٦٤٥)
[6] معرفة السنن والآثار للبيهقي (۹/۲۵۳)

⦿ امام ابن القیسرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"ضعيف"[1] "یہ ضعیف ہے۔"

⦿ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"ضعيف عابد"[2] "یہ ضعیف ہے اور عبادت گزار تھا۔"

موصوف کے بارے میں مزید جرح کے لیے عام کتبِ رجال ملاحظہ ہو۔

معلوم ہوا کہ عدمِ ذکر والی روایت عبد اللہ بن عمر بن حفص العمری سے مروی ہے اور یہ ضعیف ہیں، لہٰذا تعداد کے ذکر سے خالی یہ روایت ہی ضعیف ہے۔

سوم: اگر عدمِ ذکر کی روایات کو بھی مقبول مان لیا جائے تو بھی ذکر والی روایات راجح قرار پائیں گی، کیوں کہ وہ زیادہ مضبوط اور متعدد لوگوں سے منقول ہیں، اور جب ترجیح کی صورت ممکن ہے تو اضطراب کا دعویٰ مردود ہے۔ چنانچہ درج ذیل حضرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تعداد بیان نہیں کی:

⦿ امام مالک۔

⦿ اسامہ بن زید اللیثی۔

⦿ عبداللہ بن عمر العمری۔

⦿ ابو ذکیر۔

عرض ہے:

✿ جہاں تک امام مالک رحمہ اللہ کا معاملہ ہے تو امام مالک کے تمام شاگردوں نے امام مالک سے تعداد نقل کی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ سند میں ان کے شاگرد ابن وہب نے بھی امام مالک سے یہ تعداد نقل کی ہے۔ كما مضى وسيأتي۔ لہٰذا ابن وہب کی وہی روایت راجح قرار پائے گی جس پر امام مالک کے تمام شاگرد متفق ہیں۔

---

[1] معرفة التذكرة لابن القيسراني (ص: ١٩٩)

[2] تقريب التهذيب لابن حجر (٢٢٩/١)

- جہاں تک اسامہ بن زید اللیثی کا معاملہ ہے تو ابن وہب نے اپنے اس استاذ سے بھی تعداد نقل کی ہے، جیسا کہ ربیع بن سلیمان نے ان سے روایت کیا ہے اور یہ روایت محمد بن یوسف کے دیگر تمام شاگردوں کے موافق ہے، لہٰذا یہی راجح ہے، نیز اس کی سند بھی اعلیٰ اور مضبوط ہے، وسیأتي.
- رہی عبداللہ بن عمر العمری کی روایت کی بات، تو یہ متکلم فیہ ہیں اور جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، اور رہی ابو ذکیر کی روایات تو یہ مجہول ہیں، لہٰذا ان دونوں کی روایات بھی مرجوح قرار پائیں گی۔

مزید یہ کہ درج ذیل چار لوگوں نے بھی محمد بن یوسف سے مذکورہ روایت تعداد کے ساتھ نقل کی ہے اور ان کے شاگردوں میں سرے سے کوئی اختلاف ہے ہی نہیں:

- اسماعیل بن امیہ بن عمرو بن سعید القرشی (المتوفی: ۱۴۴ھ)
- اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر الانصاری (المتوفی: ۱۸۰ھ)
- عبدالعزیز بن محمد بن عبید الدراوردی (المتوفی: ۱۸۶ھ)
- امام یحییٰ بن سعید (المتوفی: ۱۹۸ھ)

ان سب کی روایتیں آگے امام مالک کی متابعات کے تحت آرہی ہیں۔ اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ صرف اور صرف ابن وہب نے تعداد بیان نہیں کی ہے اور وہ بھی صرف ایک دفعہ اور اختصار کی غرض سے، لہٰذا محض ان کی مختصر روایت میں تعداد کا ذکر نہ ہونا کوئی اثر نہیں رکھتا۔

نوٹ: محمد بن یوسف سے داؤد بن قیس کی ایک روایت میں بھی تعداد کا ذکر نہیں، لیکن یہ حد درجہ مختصر ہے۔ اس میں سرے سے نماز یعنی تراویح پڑھنے کا ہی ذکر نہیں، اس لیے تعداد ذکر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ روایت آگے آرہی ہے

اور یہ گزر چکا ہے کہ محمد بن یوسف کے چار شاگردوں نے متفقہ طور پر گیارہ کی تعداد نقل کی ہے اور یہ ساری روایات بسند صحیح ثابت ہیں جیسا کہ آگے سب کا مفصل بیان آرہا ہے۔

متن پر تیسرا اعتراض، الفاظ میں اختلاف:

یہ روایت بالمعنی ہے، اسے اضطراب قرار دینا بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر مفہوم کی یکسانیت کے باوجود الفاظ کے اختلاف کو اضطراب قرار دیا جائے تو اس صورت میں تو شاید ہی کوئی حدیث اضطراب کی زد سے بچ سکے، بلکہ حدیث تو درکنار قرآنی آیات میں بھی اضطراب نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر قرآن میں آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے، لیکن ہر جگہ الفاظ یکساں نہیں ہیں۔

اعتراض کی دوسری قسم: رواۃ پر اعتراض

رواۃ پر پہلا اعتراض:

کہا جاتا ہے کہ محمد بن یوسف سے رکعاتِ تراویح کی تعداد کی روایت میں غلطی ہوئی، کیوں کہ محمد بن یوسف ہی کے استاذ سے حارث بن عبد الرحمٰن بن ابی ذُباب اور یزید بن خصیفہ نے بھی یہی روایت بیان کی ہے، لیکن انھوں نے رکعات کی تعداد گیارہ نہیں بتلائی۔

عرض ہے کہ یہ دونوں روایات ثابت ہی نہیں ہیں، لہٰذا ان کی بنیاد پر محمد بن یوسف کی تغلیط بے معنی ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں روایات کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔

پہلی روایت: از حارث بن عبد الرحمٰن بن ابی ذُباب:

امام عبد الرزاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۱۱ھ) فرماتے ہیں:

"عَنِ الْأَسْلَمِيِّ، عَنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي ذُبَابٍ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ: كُنَّا نَنْصَرِفُ مِنَ الْقِيَامِ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ، وَقَدْ دَنَا فُرُوعُ الْفَجْرِ، وَكَانَ الْقِيَامُ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ ثَلَاثَةً وَعِشْرِينَ رَكْعَةً"[1]

''سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تراویح سے فارغ ہوتے تھے تو فجر کا وقت قریب ہوتا تھا اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تئیس رکعات پڑھی جاتی تھیں۔''

یہ روایت موضوع ہے اور اس میں کئی علتیں ہیں:

پہلی علت:

"الحارث بن عبد الرحمن بن عبد الله بن سعد بن أبي ذُباب"

موصوف اگرچہ صدوق ہیں، لیکن یہ منکر روایات بیان کرتے ہیں:

❁ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

"يروي عنه الدراوردي أحاديث منكرة وليس بذاك بالقوي"[2]

''دراوردی اس سے منکر احادیث بیان کرتے ہیں اور یہ ثقہ رواۃ کی طرح قوی نہیں ہیں۔''

فائدہ: علامہ البانی رحمہ اللہ نے صلاۃ التراویح (ص: ۵۲) پر صرف اسی ایک علت کی بنا پر اس روایت کو ضعیف کہا ہے، کیوں کہ انھیں اس روایت کی پوری سند نہ مل سکی تھی۔ دراصل علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو علامہ عینی کی کتاب عمدۃ القاری

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٢٦١/٤)

[2] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (٧٩/٣)

سے نقل کیا تھا اور علامہ عینی نے اسے علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، عمدۃ القاری میں مکمل سند منقول نہ تھی، اس لیے علامہ البانی رحمہ اللہ پوری سند سے آگاہ نہ ہو سکے، لیکن انھوں نے سند کے بقیہ حصے کے بارے میں بھی شک ظاہر کرتے ہوئے کہا:

"على أننا لا ندري إذا كان السند بذلك إليه صحيحا فليس كتاب ابن عبد البر في متناول يدنا لنرجع إليه فننظر في سائر سنده إن كان ساقه"[1]

"ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حارث بن عبد الرحمٰن تک بقیہ سند صحیح ہے، کیوں کہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی کتاب تک ہماری رسائی نہیں ہے کہ ہم اس کی طرف رجوع کریں اور ساری سند دیکھ سکیں، بشرطیکہ ابن عبدالبر نے پوری سند ذکر کی ہو۔"

لیکن حقیت یہ ہے کہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی پوری سند ذکر نہیں کی، ملاحظہ کریں:

"وروى الحارث بن عبد الرحمن بن أبي ذباب عن السائب ابن يزيد قال: كنا ننصرف من القيام على عهد عمر"[2]

عرض ہے کہ ہمارے سامنے اس کی پوری سند ہے اور سند کے جس حصے سے علامہ البانی رحمہ اللہ واقف نہ ہو سکے تھے، اس حصے میں تو کذاب راوی ہے۔ اگر علامہ البانی رحمہ اللہ کو یہ پوری سند مل گئی ہوتی تو موصوف اس روایت کو موضوع کہتے۔ ہمارے سامنے چونکہ اس سند کا بقیہ حصہ بھی موجود ہے اور اس میں کذاب راوی ہے

---

[1] صلاة التراويح للألباني (ص:٥٢)

[2] الاستذكار لابن عبد البر (٦٩/٢)

اس لیے اس روایت کے موضوع ہونے میں ہمیں ذرا بھی شک نہیں، اس سند میں جو کذاب راوی ہے اس کے بارے میں تفصیل اگلی سطور میں ملاحظہ کریں۔

دوسری علت:

"إبراهيم بن محمد بن أبي يحيىٰ الأسلمي"

- امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں:

"كنا نتهمه بالكذب"[1] "ہم اسے جھوٹ سے متہم کرتے تھے۔"

- امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

"إبراهيم بن أبى يحيى ليس بثقة، كذاب"[2]

"ابراہیم بن ابی یحییٰ ثقہ نہیں ہے، بہت بڑا جھوٹا ہے۔"

- امام علی بن المدینی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۴ھ) فرماتے ہیں:

"إبراهيم بن أبي يحيى كَذَّاب"[3]

"ابراہیم بن ابی یحییٰ بہت بڑا جھوٹا ہے۔"

- امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

"كذاب متروك الحديث"[4]

"یہ بہت بڑا جھوٹا اور متروک الحدیث ہے"

یہ صرف وہ ثابت اقوال ہیں جن میں اہلِ فن نے راوی مذکور کو کذاب کہا ہے، اس کے علاوہ جو شدید جرحیں اس پر ہوئی ہیں اس کے لیے تہذیب اور عام کتبِ رجال

---

1. الضعفاء للعقيلي (٦٣/١) وإسناده صحيح
2. الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١٢٦/٢)
3. سؤالات ابن أبي شيبة لابن المديني (ص:١٢٤)
4. الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١٢٦/٢)

کی طرف مراجعت کی جائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ روایت ''ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی'' کی وجہ سے موضوع ومن گھڑت ہے، لہٰذا اس کذاب کی روایت کو بنیاد بنا کر بخاری ومسلم کے ثقہ راوی محمد بن یوسف کی تغلیط کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

الاسلمی کے تعین پر اشکال اور اس کا جواب:

''الاجماع'' کے مضمون نگار صاحب نے لکھا:

''حارث بن عبدالرحمٰن بن ابی ذباب کے شاگردوں میں الاسلمی کے نام سے دو راوی ہیں: ① ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی (المتوفی: ۱۸۴ھ) اور ② محمد بن فلیح الاسلمی (المتوفی: ۱۹۷ھ)۔''[1]

عرض ہے:

أولاً: یہاں اس سند میں جو''الاسلمی'' ہے، وہ امام عبدالرزاق کا استاذ بھی ہے اور امام عبدالرزاق کے اساتذہ میں صرف ایک ہی ''الاسلمی'' کا ذکر ملتا ہے جو''ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی'' ہی ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں ''الاسلمی'' کے نام سے حارث بن عبدالرحمٰن بن ابی ذباب کا جو شاگرد ہے وہ یہی کذاب ہی ہے، نہ کہ محمد بن فلیح مراد ہے۔

ثانیاً: محمد بن فلیح کا ''الاسلمی'' کے نام سے سندوں میں آنا معروف نہیں، جب کہ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ بکثرت ''الاسلمی'' کے نام سے سندوں میں آتا ہے، جیسا کہ مصنف عبدالرزاق کی کئی روایات میں ہے اور ایک روایت میں تو خود

---

[1] ''الاجماع'' (شمارہ ۱، ص: ۵۵)

[2] دیکھیں: تهذيب الكمال للمِزي (۱۸/۵۲)

مضمون نگار نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہاں ''الاسلمی'' سے مراد یہی کذاب ہے۔[1]

ثالثاً: امام عبدالرزاق نے اپنے استاذ کو ''الاسلمی'' بتا کر ایک روایت بیان کی تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا:

''أخرجه عبد الرزا ق عن الأسلمي عن عبد الله بن دينار، لكن الأسلمي، أضعف من موسى عند الجمهور''[2]

''اسے عبدالرزاق نے ''الاسلمی'' کے طریق سے عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے، لیکن ''الاسلمی'' جمہور کے نزدیک موسیٰ سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔''

ایک اور مقام پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''وقال عبد الرزاق في مصنفه: أخبرنا الأسلمي عن زيد بن أسلم .... وهذا ضعيف مع إرساله، والأسلمي هو إبراهيم بن محمد بن أبي يحيى''[3]

''امام عبدالرزاق نے اپنی کتاب ''مصنف'' میں کہا ہے: ہم سے ''الاسلمی'' نے زید بن اسلم سے بیان کیا ..... یہ مرسل ہونے کے ساتھ ضعیف بھی ہے۔ ''الاسلمی'' یہ ''ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ'' ہے۔''

ایک اور مقام پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وروى عبد الرزاق عن الأسلمي هو إبراهيم بن أبي يحيى عن هشام بن عروة .... إبراهيم ضعيف''[4]

---

[1] دیکھیں: ''الاجماع'' (شمارہ ۱، ص: ۵۶)

[2] التمييز لابن حجر، ت دكتور الثاني (١٧٦٧/٤)

[3] التمييز لابن حجر، ت دكتور الثاني (١٧٦٨/٤)

[4] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٤٥٩/٣)

''عبدالرزاق نے ''الاسلمی'' سے روایت کیا۔ یہ ''ابراہیم بن ابی یحییٰ'' ہے، اوراس نے ہشام بن عروۃ سے ....ابراہیم ضعیف ہے۔''

معلوم ہوا کہ عبدالرزاق کے استاذ کی جگہ جب بھی ''الاسلمی'' آتے ہیں تو اس سے مراد ''ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی'' کذاب ہی ہوتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔

رابعاً: بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیں کہ امام عبدالرزاق کے اساتذہ میں دو اسلمی ہیں تو بھی یہاں تعین کذاب اسلمی ہی کا ہوگا جیسا کہ مذکورہ بالا دلائل شاہد ہیں۔

دوسری روایت از یزید بن خصیفہ:

علی بن الجعد بن عبید البغدادی (المتوفی: ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں:

"أَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ يَزِيْدَ بْنِ خُصَيْفَةَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ: كَانُوْا يَقُوْمُوْنَ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ بِعِشْرِيْنَ رَكْعَةً، وَإِنْ كَانُوْا لَيَقْرَءُوْنَ بِالْمِئِيْنَ مِنَ الْقُرْآنِ"[1]

''سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں رمضان میں بیس رکعات پڑھتے تھے اور ایک ایک رکعت میں سوسو آیات پڑھتے تھے۔''

حافظ زبیر علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''اس روایت کا ایک راوی علی بن الجعد تشیع کے ساتھ مجروح ہے۔ یہ سیدنا معاویہ وغیرہ صحابہ کی تنقیص کرتا تھا، (دیکھیں: تہذیب التہذیب

---

[1] مسند ابن الجعد (ص: ٤١٣) وأخرجه الفريابي في الصيام (ص: ١٣١) من طريق يزيد بن هارون عن ابن أبي ذئب به.

وغیرہ) اس کی روایات صحیح بخاری میں متابعات میں ہیں اور جمہور محدثین نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن ایسے مختلف فیہ راوی کی شاذ روایت موطا امام مالک کی صحیح روایت کے خلاف کیوں کر پیش کی جا سکتی ہے؟''[1]

عرض ہے کہ اس روایت میں علی بن الجعد کا کوئی قصور نہیں ہے، کیوں کہ اس روایت کے نقل کرنے میں وہ منفرد نہیں، بلکہ تین ثقہ رواۃ نے اس کی متابعت کی ہے:

① یزید بن ہارون (ثقہ) نے۔[2]

② محمد بن یوسف (ثقہ) نے۔[3]

③ اسماعیل بن امیہ (ثقہ) نے۔[4]

لہٰذا علی بن الجعد کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے البتہ یہ روایت دوسری وجوہات کی بنا پر شاذ ہے، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

شذوذ کی پہلی وجہ:

سند میں موجود یزید بن خصیفہ، رکعات کی تعداد صحیح طور سے ضبط نہیں کر سکے جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے اور پوری صراحت کے ساتھ بتلا دیا ہے کہ انھیں تعداد بالضبط یاد نہیں ہے، کیوں کہ انھیں ایسا لگتا تھا کہ محمد بن سائب نے اکیس کی تعداد بتائی ہوگی۔ چنانچہ امام ابو بکر النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

"حدّثنا يوسف بن سعيد، ثنا حجاج، عن ابن جريج، حدثني إسماعيل بن أمية، أنّ محمد بن يوسف ابن أخت

---

[1] قیامِ رمضان (ص: ۳۱) ایضاً (ص: ۷۷)

[2] دیکھیں: الصيام للفريابي (ص: ۱۳۱)

[3] دیکھیں: فوائد أبي بكرالنيسابوري (ق۱۵۳/ب)

[4] دیکھیں: فوائد أبي بكر النيسابوري (ق۱۵۳/ب)

السّائب بن يزيد أخبره، أنّ السّائب بن يزيد أخبره قال: جمع عمر بن الخطاب الناس على أبي بن كعب وتميم الداري، فكانا يقومان بمائة في ركعة، فما ننصرف حتى نرى أو نشك في فروع الفجر، قال: فكنا نقوم بأحد عشر قلت: أو واحد وعشرين؟! قال: لقد سمع ذلك من السائب ابن يزيد ابنُ خصيفة ـفسألتُ يزيد بن خصيفة، فقال: حسبتُ أنّ السّائب قال: أحد وعشرين۔ قال محمد: أَوَ قلت لإحدى وعشرين؟"[1]

''سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، تو یہ دونوں ایک رکعت میں سو آیات پڑھاتے تھے، پھر جب ہم نماز سے فارغ ہوتے تھے تو ہم کو لگتا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم گیارہ رکعات پڑھتے تھے۔ اس روایت کے راوی اسماعیل بن امیہ نے جب محمد بن یوسف سے یہ سنا تو پوچھا: یا اکیس رکعات؟ محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔ اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یزید بن خصیفہ سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔ محمد بن یوسف نے کہا: کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟''

یہ کتاب ابھی تک مخطوط ہے، اس لیے متعلقہ صفحہ سے اس کا عکس صفحہ (۴۰۰)

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

میں ملاحظہ ہو۔

اس روایت میں غور کیجیے کہ محمد بن یوسف سے ان کے شاگرد اسماعیل بن امیہ نے جب گیارہ کی تعداد سنی تو پوچھا کہ ''یا اکیس رکعات؟''

یہ استفسار کرنے پر بھی محمد بن یوسف نے گیارہ ہی کی تعداد بیان کی اور کہا اکیس والی بات تو ابن خصیفہ بیان کرتے ہیں، گویا محمد بن یوسف کو اپنے حفظ و ضبط پر مکمل اعتماد تھا، اسی لیے انھوں اپنے شاگرد کے دوبارہ پوچھنے پر بھی گیارہ ہی کی تعداد بتلائی۔

نیز محمد بن یوسف کو یہ بھی معلوم تھا کہ یزید بن خصیفہ اکیس کی تعداد بتلاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے گیارہ ہی کی تعداد آگے روایت کی، جس سے معلوم ہوا کہ محمد بن یوسف نے پورے وثوق سے گیارہ کی تعداد بیان کی ہے۔

اس کے برعکس یزید بن خصیفہ کا حال یہ ہے کہ ان سے جب تعداد کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے تردد ظاہر کیا اور یوں کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ سائب بن یزید نے اکیس کی تعداد بتلائی تھی، نیز انھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے دوسرے ساتھی کیا تعداد بیان کرتے ہیں، لہٰذا ان کی بیان کردہ تعداد مشکوک ہے اور محمد بن یوسف کی بیان کردہ تعداد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

اسماعیل بن امیہ نے اپنے استاذ محمد بن یوسف سے سوال کیوں کیا؟

یہاں ایک بات غور طلب یہ ہے کہ اسماعیل بن امیہ کے استاذ محمد بن یوسف نے جب ان کے سامنے گیارہ کی تعداد بیان کی تو انھوں نے اپنے استاذ سے دوبارہ کیوں پوچھا کہ ''یا اکیس رکعات؟''

دکتور بقالی صاحب نے کہا ہے:

''فهذا النص يشعر بأن محمد بن يوسف لم يكن بذاك

الضابط المتقن للعدد؛ ولذلك جعل إسماعيل بن أمية يراجعه ويستوثقه بقوله: أو واحد وعشرين؟ وكأنّه سمع ذلك من غيره"[1]

''یعنی اس نص سے پتا چلتا ہے کہ محمد بن یوسف کو تعداد صحیح طرح یاد نہ تھی، اسی لیے ان کے شاگرد ابن امیہ نے ان سے مزید تسلی کے لیے یہ کہتے ہوئے سوال کیا: یا اکیس رکعات؟ گویا اسماعیل بن امیہ نے اکیس کی تعداد محمد بن یوسف کے علاوہ کسی اور سے سن رکھی تھی۔''

عرض ہے کہ اسماعیل بن امیہ کے سوال کرنے سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ محمد بن یوسف کو تعداد یاد نہ تھی، کیوں کہ اسماعیل بن امیہ کے سوال کے بعد بھی محمد بن یوسف نے گیارہ ہی کی تعداد بتلائی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسماعیل بن امیہ کے انھیں استاذ محمد بن یوسف ہی کے حوالہ سے کچھ لوگ یہ بھی بیان کرتے پھرتے تھے کہ انھوں نے اکیس کی تعداد روایت کی ہے، جیسا کہ مصنف عبدالرزاق میں ہے:

"عَنْ دَاوُدَ بْنِ قَيْسٍ، وَغَيْرِهِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، أَنَّ عُمَرَ جَمَعَ النَّاسَ فِيْ رَمَضَانَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَعَلَى تَمِيمٍ الدَّارِيِّ عَلَى إِحْدَى وَعِشْرِيْنَ رَكْعَةً يَقْرَءُوْنَ بِالْمِئِيْنَ وَيَنْصَرِفُوْنَ عِنْدَ فُرُوْعِ الْفَجْرِ"[2]

''داود بن قیس وغیرہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، انھوں نے سائب

---

[1] فصل الخطاب في بيان عدد ركعات صلاة التراويح في زمن عمر بن الخطاب (المنشور على الشبكة)

[2] مصنف عبد الرزاق (٤/٢٦٠) یہ روایت ضعیف ہے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رمضان میں لوگوں کو ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ اکیس رکعات تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، یہ سو سو آیات پڑھتے تھے اور فجر کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔''

اس روایت میں دیکھیں کہ اسماعیل بن امیہ کے استاذ محمد بن یوسف ہی کے حوالے سے کسی نے اکیس کی تعداد نقل کی ہے، یقیناً یہ بات اسماعیل بن امیہ تک بھی پہنچی ہوگی اور انھوں نے یہ سن رکھا ہوگا کہ بعض کے بقول محمد بن یوسف نے اکیس کی تعداد بیان کی ہے، لیکن جب انھوں نے اپنے استاذ محمد بن یوسف سے براہِ راست یہ روایت سنی تو محمد بن یوسف نے اکیس کی تعداد نہیں بتلائی، جیسا کہ لوگوں نے ان کے حوالے سے بیان کر رکھا تھا، بلکہ گیارہ کی تعداد بتلائی۔ ظاہر ہے کہ ان کے شاگرد کو حیرانی ہوئی ہوگی، کیوں کہ انھوں نے اپنے اسی استاذ کے حوالے سے اکیس کی تعداد سنی تھی، لہٰذا انھوں نے فوراً سوال اٹھا دیا کہ ''یا اکیس رکعات؟'' اس پر ان کے استاذ نے بتلایا کہ گیارہ ہی رکعات ہے اور اکیس والی تعداد تو دوسرے صاحب یزید بن خصیفہ بیان کرتے ہیں۔

اس وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس روایت میں محمد بن یوسف کے حوالے سے اکیس کی تعداد بیان کی گئی ہے، وہ مردود ہے، کیوں کہ محمد بن یوسف نے اس سے براءت ظاہر کر دی ہے۔

تنبیہ بلیغ: یاد رہے کہ ''فوائد ابی بکر'' للنیسابوری ابھی تک غیر مطبوع ہے، لیکن کسی صاحب نے اس کی ٹائپنگ کر کے شاملہ فارمیٹ میں تیار کیا ہے اور یہ شاملہ کی سائٹ پر موجود ہے، اس شاملہ والے نسخے میں مذکور روایت میں تحریف کر دی

گئی ہے اور وہ عبارت جس سے یزید بن خصیفہ کے وہم کی دلیل تھی، اسے بدل دیا گیا ہے۔ چنانچہ مخطوطہ میں اصل عبارت یوں ہے:

"فسألتُ يزيد بن خصيفة، فقال: حسبتُ أنّ السّائب قال: أحد وعشرين."[1]

''اسماعیل بن امیہ نے یزید بن خصیفہ سے تعدادِ رکعات سے متعلق پوچھا تو یزید بن خصیفہ نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔''

چونکہ اس عبارت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یزید بن خصیفہ کو بالضبط تعداد یاد نہ تھی اور تعداد کی بابت وہ تردد کے شکار تھے، اس لیے کچھ لوگوں نے اس عبارت میں اس طرح تحریف کر دی کہ یزید بن خصیفہ کے اظہارِ تردد پر پردہ پڑ جائے، چنانچہ شاملہ کے محولہ نسخے میں ہے:

"فسألت يزيد بن خصيفة، فقال: أحسنت، إن السائب قال: إحدى وعشرين."[2]

''اسماعیل بن امیہ نے یزید بن خصیفہ سے تعدادِ رکعات سے متعلق پوچھا تو یزید بن خصیفہ نے کہا: تم ٹھیک کہہ رہے ہو، سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔''

غور فرمائیں! اس تحریف سے عبارت کیا سے کیا بن گئی؟! یعنی یزید بن خصیفہ کے تردد کو یقین سے بدل دیا گیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

اس شاملہ والے نسخہ کے ناسخ نے مخطوطہ کے مصدر کا حوالہ یوں دیا ہے:

---

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

[2] فوائد أبي بكر عبد الله بن محمد بن زياد النيسابوري (ص: ١٤) ترقيم الشامله

”مصدر المخطوط: مجاميع المدرسة العمرية، الموجودة في المكتبة الظاهرية، رقم المجموع (٣٧٥٥) عام (مجاميع: ١٨)“

اسی مخطوطہ سے متعلقہ صفحہ کا عکس صفحہ (٤٠٠) پر ملاحظہ کریں۔

مخطوطہ میں صاف پڑھا جارہا ہے کہ ”حسبت“ سے قبل ”أ“ موجود نہیں ہے، لہٰذا اسے ”أحسنت“ پڑھنا کسی بھی صورت میں درست نہیں۔[1]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی مخطوطہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے اور ”حسبت“ ہی نقل کیا ہے اور اسی سے یزید بن خصیفہ کے تردد پر استدلال بھی کیا ہے۔[2]

دکتور کمال بقالی نے بھی اسے مخطوطہ ہی سے نقل کیا ہے اور ”حسبت“ ہی نقل کیا ہے۔ اس کے لیے موصوف کا مضمون: ”فصل الخطاب في بيان عدد ركعات صلاة التراويح في زمن عمر بن الخطاب“ ملاحظہ کریں۔ لہٰذا قارئین سے گذارش ہے کہ شاملہ کے نسخہ سے دھوکا نہ کھائیں۔

یاد رہے کہ دکتور بقالی صاحب نے ”حسبت“ کی تاویل کی ہے جو باطل ہے، اور کہا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ یہ شک کے لیے استعمال کیا ہو، بلکہ ممکن ہے کہ احتیاط کے لیے کہا ہو اور دیگر رواۃ نے تو بالجزم اسے روایت کیا ہے۔

عرض ہے کہ یہ لفظ محمد بن یوسف کے بالضبط بیان کے بالمقابل استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا سیاق وسباق تو صاف دلالت کرتا ہے کہ موصوف نے اظہارِ شک کے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ رہی دیگر روایات جو جزم کے ساتھ ہیں تو اس شک کے مخالف نہیں، کیوں کہ ان روایات میں شک کا انکار نہیں ہے۔

نیز اگر ابن خصیفہ نے بعض دفعہ بالجزم بیان کیا ہے تو محمد بن یوسف نے تو

---

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

[2] دیکھیں: صلاة التراويح للألباني (ص: ٥٨)

ہر دفعہ بالجزم بیان کیا ہے، لہٰذا اس پہلو سے بھی محمد بن یوسف ہی کی روایات راجح قرار پائیں گی۔

نوٹ: بعض لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ اس روایت نے تو سارا پول کھول دیا اور یزید بن خصیفہ کی غلطی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی تو ان لوگوں نے اس روایت میں لفظی ومعنوی تحریف کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ محمد بن یوسف ہی نے غلطی ہے اور انھوں نے اپنی اس غلطی سے رجوع بھی کر لیا تھا، اس پرُتحریف دعوے کی تردید ہم آگے پوری تفصیل سے کریں گے۔ إن شاء اللہ

شذوذ کی دوسری وجہ:

حفظ وضبط میں یزید بن خصیفہ، محمد بن یوسف سے بہت کم تر ہیں۔

❁ ابن خصیفہ کے ضعفِ حفظ کی پہلی دلیل: محمد بن یوسف کے حفظ پر کسی نے بھی جرح نہیں کی، جب کہ یزید بن خصیفہ کو ثقہ کہنے کے ساتھ ساتھ ان کے حفظ پر درج ذیل ناقدین کی جرح بھی ملتی ہے:

❁ پہلے ناقد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ)۔ چنانچہ امام مزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَقَال أبو عُبَيد الآجري، عَن أبي داود : قال أحمد: منكر الحديث“[1]

”امام احمد نے کہا: یزید بن خصیفہ منکر الحدیث ہے۔“

بعض اہلِ علم کا یہ کہنا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے یہاں منکر سے منفرد حدیث بیان کرنے والا مراد لیا ہے، لیکن اس کے لیے قرینہ درکار ہے جو یہاں نہیں ملتا۔ یاد

---

[1] تهذيب الكمال للمزي (۱۷۳/۳۲)

رہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ روایت پر تفرد کے اعتبار سے منکر کا اطلاق کرتے تھے نہ کہ راوی پر بولتے تھے۔[1]

تنبیہ: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دکتور بشار عواد نے امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کو غیر ثابت قرار دیا ہے اور کہا:

"هذا شيء لم يثبت عن أحمد، فيما أرى والله أعلم، فقد تقدم قول الأثرم عنه، وفي العلل لابنه عبد الله، أنه قال: ما أعلم إِلَّا خَيْرًا، وهو توثيق واضح"[2]

''میرے خیال سے امام احمد سے یہ چیز ثابت نہیں ہے ۔والله أعلم۔ کیوں کہ پہلے ان سے امام اثرم کی روایت گزر چکی ہے، نیز علل میں ہے کہ آپ (امام احمد رحمہ اللہ) نے کہا: میں اس کے بارے میں صرف خیر ہی جانتا ہوں۔''

عرض ہے:

- اگر بشار صاحب نے اس قول کو غیر ثابت کہا ہے تو دیگر اہلِ علم نے ان پر رد بھی کیا ہے، مثلاً علامہ اسحاق الحوینی فرماتے ہیں:

"ولعل هذا الاختلاف من يزيد بن خصيفة، فهو وإن كان ثقة إلّا أن أحمد قال في رواية: منكر الحديث، وقد خولف فيه كما يأتي، وزعم المعلق على تهذيب الكمال (١٧٣/٣٢) أن هذا لم يثبت عن أحمد، ولم يُبْدِ حجة سوى قوله: فيما أرى! وبأن أحمد قال: "لا أعلم إلا خيرًا" وهذا القول لا

---

[1] دیکھیں: الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (٤٩٩/٥) واسناده حسن.

[2] حاشيه تهذيب الكمال للمزي (١٧٣/٣٢)

يمنع أن يكون لأحمد فيه قول آخر، والله أعلم"[1]

''شاید یہ اختلاف یزید بن خصیفہ کی طرف سے ہے، یہ گرچہ ثقہ تھے مگر امام احمد رحمہ اللہ نے ایک روایت کے مطابق کہا: یہ منکر الحدیث ہے۔ متعلقہ روایت میں یزید کی مخالفت کی گئی ہے۔ تہذیب (۳۲/۱۷۳) کے حاشیہ نگار نے جو یہ کہا ہے کہ یہ امام احمد سے ثابت نہیں ہے تو انھوں نے یہ کہنے کے علاوہ اس کی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے کہ ''میرے خیال سے''۔ اور یہ کہ امام احمد نے کہا: ''میں ان کے بارے میں صرف خیر جانتا ہوں۔'' لیکن یہ قول اس بات سے مانع نہیں ہے کہ اس کے بارے میں امام احمد کا دوسرا قول بھی ہو۔ واللہ أعلم''

- اس قول کو امام احمد بن حنبل سے امام ابو داود نے روایت کیا ہے اور ان سے ابو عبید نے، پھر انھیں کی کتاب سے امام مزی نے اس قول کو نقل کیا، پھر اسے غیر ثابت کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟!
- امام احمد رحمہ اللہ ہی کی طرح ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی یزید بن خصیفہ کے حفظ پر کلام کیا ہے، لہٰذا بلاوجہ امام احمد کی طرف اس قول کی نسبت سے انکار کرنا درست نہیں۔

شمارہ ''الاجماع'' کے مضمون نگار امام احمد کے اس قول پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوالات ابو عبید الآجری میں یہ قول ہے ہی نہیں، نہ مطبوعہ میں اور نہ ہی مخطوطہ میں۔''[2]

---

[1] فضائل القرآن لابن كثير (ص: ١١٧ حاشيه)

[2] مجلّہ ''الاجماع'' (شمارہ: ١، ص: ٢٦)

عرض ہے:

أولاً: مضمون نگار پر کہاں سے یہ وحی آئی ہے کہ مخطوطہ میں بھی یہ قول موجود نہیں ہے، کیا مضمون نگار نے سوالات الآجری کا مکمل مخطوطہ دیکھا ہے؟ یا ایسے ہی ہوائی قیاس آرائی فرمائی ہے؟ گذارش ہے کہ کم از کم ''الاجماع'' نامی مجلّہ میں اس طرح کی قیاس آرائیوں کا مظاہرہ نہ کیا کریں۔

قارئین کی اطلاع کے لیے ہم عرض کر دیں کہ ہماری معلومات کی حد تک سوالات الآجری کا کوئی بھی ایسا مخطوطہ اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے جو مکمل ہو، لہٰذا یہ کہنا کہ مخطوطہ میں بھی یہ قول نہیں ہے رجماً بالغیب کے سوا کچھ نہیں۔

ثانیاً: یہ قول ہم نے امام مِزی رحمہ اللہ کی کتاب ''تہذیب الکمال'' سے نقل کیا ہے اور امام مزی رحمہ اللہ نے اس کتاب میں یہ قول ابو عبید الآجری کی کتاب سے نقل کیا ہے، لہٰذا اس پر اعتراض کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اگر سولات الآجری کا وہ حصہ مفقود ہے جس میں یہ قول تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ امام مِزی نے اسی حصے سے اس قول کو اپنی کتاب میں نقل کر رکھا ہے۔ رہا مضمون نگار کا یہ الزام کہ ہم نے الجرح والتعدیل میں منقول ایک قول کو درست کیوں نہیں جانا؟ تو اس کی وضاحت اپنے مقام پر آرہی ہے۔

مضمون نگار نے آگے یہ بحث کی ہے کہ بعض ائمہ تفرد پر نکارت کا اطلاق کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے بالکل انکار نہیں، یقیناً بعض ائمہ کبھی روایات کے لیے اور کبھی رواۃ کے لیے تفرد کے معنی میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ائمہ جرح کے معنی میں اس لفظ کا استعمال بالکل نہیں کرتے، اس لیے ایسے کسی بھی قول میں تفرد کا معنی خاص کرنے کے لیے دلائل یا قرائن درکار ہیں۔

جہاں تک امام احمد رحمہ اللہ کی بات ہے تو ان کے تعلق سے یہ تو مسلّم ہے کہ وہ راوی کی منفرد حدیث پر بھی منکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ جب وہ کسی راوی کے لیے منکر الحدیث کا لفظ استعمال کریں تو اس کا بھی ہمیشہ یہی مطلب ہوتا ہے، یہ بات محلِ نظر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے "عبد الرحمن بن أبي الموال" کی استخارہ والی حدیث کو "منکر" کہا، لیکن عبد الرحمٰن بن ابی الموال کو منکر نہیں کہا بلکہ ساتھ ہی انھیں "لا بأس به" کہا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ راوی کی منفرد روایت پر تو منکر کا اطلاق کرتے ہیں لیکن راوی پر اس کا اطلاق نہیں کرتے، اس لیے خاص امام احمد رحمہ اللہ جب کسی روایت کے بجائے کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اسے تفرد کے معنی میں لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اِلا یہ کہ اس کی کوئی صریح دلیل بھی مل جائے۔

مضمون نگار نے اس ضمن میں اہلِ علم کی جو عبارات نقل کی ہیں، ان میں بھی یہی بات ہے کہ امام احمد نے کسی روایت ہی کو منکر کہا ہے، یعنی روایت کا تفرد مراد لیا ہے۔ البتہ صرف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے راوی سے متعلق بھی محمول کیا ہے، بلکہ زیرِ بحث راوی سے متعلق ہی ان کی بات ہے۔ لکھتے ہیں:

"وروى أبو عبيد الآجري عن أبي داود عن أحمد أنه قال: منكر الحديث. قلت: هذه اللفظة يطلقها أحمد على من يغرب على أقرانه بالحديث عرف ذلك بالاستقراء من حاله"[2]

---

[1] الكامل لابن عدي ت عادل وعلي (٤٩٩/٥) وإسناده حسن

[2] مقدمة فتح الباري لابن حجر (ص: ٤٥٣)

''ابو عبید الآجری نے ابو داؤد کے واسطے سے امام احمد سے نقل کیا کہ انھوں نے کہا: (یزید بن خصیفہ) منکر الحدیث ہے۔ میں (ابن حجر) کہتا ہوں: یہ لفظ امام احمد رحمہ اللہ اس راوی پر اطلاق کرتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے بیچ منفرد حدیث روایت کرتا ہے۔ یہ بات امام احمد کی حالت کے استقرا کے بعد پتا چلی ہے۔''

یہاں سب سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ مضمون نگار نے ابن حجر رحمہ اللہ کی اس عبارت کے آخری حصے ''عرف ذلك بالاستقراء من حاله'' کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''یہ چیز اس کی تمام روایتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے۔''[1]

یہاں یہ جملہ امام احمد سے متعلق ہے، لیکن مضمون نگار نے اسے راوی کی روایات سے ملا دیا۔ یہ ہے عربی عبارت فہمی سے متعلق مضمون نگار کی حالت!

اب ایسا ملکہ رکھنے والے حضرات اگر رکعاتِ تراویح سے متعلق محمد بن یوسف کی روایت میں دن کو رات بنا ڈالیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

بہر حال یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام احمد کے حوالے سے راوی پر بھی جو منکر کے اطلاق کی بات کہی ہے تو انھوں نے روایت والے معاملے پر اسے قیاس ہی کیا ہے، کیوں کہ خود ابن حجر رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ منفرد روایت پر منکر کا اطلاق کرتے ہیں جسے خود مضمون نگار نے بھی نقل کیا ہے، چنانچہ ایک راوی کی احادیث کو امام احمد نے منکر کہا تو ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا:

''المنكر أطلقه أحمد بن حنبل وجماعة على الحديث الفرد الذي لا متابع له فيحمل هذا على ذلك''[2]

---

[1] الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۳۰)

[2] مقدمة فتح الباري لابن حجر (٤٣٧)، نیز دیکھیں: مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۳۰)

''منکر کا اطلاق امام احمد اور محدثین کی ایک جماعت نے ایسی منفرد حدیث پر کیا ہے جس کی کوئی متابعت نہ ملے، لہٰذا امام احمد کی اس بات کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔''

عرض ہے کہ اصل معاملہ یہی ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ راوی پر نہیں بلکہ روایت پر منکر کا اطلاق کرتے ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی پر راوی سے متعلق امام احمد کی طرف سے منکر کی جرح کو بھی قیاس کر لیا ہے اور اس قیاس کی گنجایش بھی ہوتی اگر امام احمد رحمہ اللہ کی طرف سے صراحتاً یہ ثبوت نہ ملتا کہ انھوں نے روایت پر منکر کے اطلاق کے ساتھ ہی اس کے راوی کو ثقہ بھی کہا ہے۔ کما مضٰی

مضمون نگار نے ایک مقام پر ناچیز سے تاکید کے ساتھ جواب کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ کے فرقہ کے محقق شاہد محمود صاحب لکھتے ہیں کہ بلکہ امام احمد تو محمد بن ابراہیم التیمی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے منکر حدیث نقل کی ہے اور یہ (محمد بن ابراہیم) بخاری و مسلم کے، اور حدیث ''إنما الأعمال بالنیات'' کے بنیادی راوی ہیں۔'' (دوامِ حدیث، ص: ۵۵۴)۔ جب کفایت صاحب کے نزدیک امام احمد صرف روایت پر تفرد کے اعتبار سے منکر کا اطلاق کرتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ کیا کفایت صاحب آپ کے نزدیک یہ روایت منکر ہے؟ (نعوذ باللہ) جواب ضرور عنایت فرمایئے!''[1]

عرض ہے کہ اہلِ حدیث محقق شیخ شاہد محمود حفظہ اللہ نے بھی جو بات کہی ہے وہ بھی

[1] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۳۲)

یہی ہے کہ امام احمد نے روایت پر منکر کا اطلاق کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ روایت کیا ہمارے نزدیک منکر ہے تو یہ بتایا جا چکا ہے کہ امام احمد حدیث کو منکر کہہ کر تفرد و غرابت مراد لیتے ہیں نہ کہ حدیث کی تضعیف کرتے ہیں۔

الغرض امام احمد رحمہ اللہ نے منکر الحدیث بول کر اس راوی پر جرح ہی کی ہے، لیکن چونکہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی توثیق بھی کی ہے، لہٰذا دونوں اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے یہی کہا جائے گا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ راوی ثقہ ہے، لیکن حفظ و ضبط میں کمزور ہے۔

❁ دوسرے ناقد: امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ)، چنانچہ موصوف نے کہا ہے:

"وكان يهم كثيرا إذا حدث من حفظه"[1]

"یہ جب اپنے حافظہ سے بیان کرتے تھے تو بہت زیادہ وہم کا شکار ہوتے تھے۔"

یہاں امام ابن حبان رحمہ اللہ کی جرح کو تشدد کا حوالہ دیکر رد کرنے کی گنجایش نہیں ہے، کیوں کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ اس کی ثقاہت کے منکر نہیں، بلکہ انھوں نے اسے اپنی کتاب ثقات میں ذکر کیا ہے اور یہاں وہ اس کے حافظہ پر مفسر جرح کر رہے ہیں، لہٰذا یہ خاص اور مفسر جرح قابلِ قبول ہے، بالخصوص جب کہ امام احمد رحمہ اللہ کی مذکورہ جرح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

❁ تیسرے ناقد: امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ)۔ چنانچہ موصوف نے اس راوی کو اپنی کتاب میزان میں نقل کرتے ہوئے کہا:

"وروى أبو داود أن أحمد قال: منكر الحديث"[2]

---

[1] مشاهير علماء الأمصار لابن حبان (ص:١٣٥)

[2] ميزان الاعتدال للذهبي (٤٣٠/٤)

”امام ابو داود نے نقل کیا ہے کہ امام احمد نے انھیں منکر الحدیث کہا ہے۔“

امام ذہبی رحمہ اللہ نے امام احمد کے قول پر کوئی تعاقب نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ بھی اسے ثقہ ماننے کے ساتھ ساتھ اس کے حافظہ پر کلام کو تسلیم کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ امام ذہبی میزان میں غیر معتبر جرح نقل کرنے کے بعد اس پر رد بھی کرتے ہیں۔

ابن خصیفہ کے ضعفِ حفظ کی دوسری دلیل:

محمد بن یوسف کی کئی ایک محدثین نے اعلیٰ توثیق کی ہے، ملاحظہ ہو:

① امام یحییٰ بن سعید نے آپ کو ثبت قرار دیا ہے: ”كان يحيى بن سعيد يثبته“[1]

② امام علی بن المدینی رحمہ اللہ نے بھی اسے برضا و رغبت نقل کیا ہے، چنانچہ امام ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

”رَأَيْتُ في كتاب علي بن الْمَدِينِي: سمعت يَحْيَى يقول: مُحَمَّد بن يُوسُف أثبت من عَبْد الرَّحْمَن بن حُمَيْد وعَبْد الرَّحْمَن بن عَمَّار، قَالَ: قلت: أيما أثبت: عَبْد الرَّحْمَن بن حُمَيْد أو عَبْد الرَّحْمَن بن عَمَّار؟ فقال: ما أقربهما، وسألته عن عمر بن نبيه؟ قَالَ: لم يكن به بأس، قَالَ: وكان مُحَمَّد ابن يُوسُف أعرج، وكان ثبتا، وكان يقول: سمعت السائب بن يزيد وهو جدى من قِبَلِ أُمِّي“[2]

---

[1] تهذيب التهذيب (٥/٣١) تاريخ ابن أبي خيثمة (٢٨٢/٢) وإسناده صحيح

[2] تاريخ ابن أبي خيثمة (٢٨٢/٢)

③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے برضا و رغبت نقل کرتے ہوئے کہا:

"كَانَ يحيى يُثَبِّتُهُ"[1] "امام یحییٰ بن سعید انھیں ثبت قرار دیتے تھے۔"

④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ناقدین کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے یزید بن خصیفہ کو صرف "ثقة" کہا ہے۔ (تقریب: ۷۷۳۸) جب کہ محمد بن یوسف کو "ثقة ثبت" کہا ہے۔ (تقریب: ٦٤١٤)

ایک عجیب غلط فہمی:

بعض لوگوں نے دھاندلی میں یہ دعویٰ کر لیا کہ حافظ ابن حجر نے جو محمد بن یوسف کو ثقہ کے ساتھ ثبت قرار دیا ہے تو اس سلسلے میں انھوں نے احمد بن صالح المصری کے قول پر اعتماد کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے یہ قول تہذیب میں اسی راوی کے ترجمے میں پیش کیا ہے، لیکن اس قول کا تعلق محمد بن یوسف سے نہیں، بلکہ اسی نام کے دوسرے راوی سے ہے اور حافظ موصوف کو وہم ہوا ہے، لہٰذا جب یہ قول ہی ثابت نہیں تو حافظ ابن حجر کے ثبت کہنے کی بنیاد بھی ختم ہوگئی۔

عرض ہے کہ اگرچہ محمد بن یوسف سے متعلق "احمد بن صالح المصری" کا قول ثابت نہیں، لیکن جرح و تعدیل کے مشہور امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف کو "ثبت" قرار دیا ہے اور اسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"كان يحيى بن سعيد يثبته"[2]

"امام یحییٰ بن سعید انھیں ثبت قرار دیتے تھے۔"

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (٤٢/٢)

[2] تهذيب التهذيب لابن حجر (٣٥/٣١)

امام بخاری کی روایت ان کی کتاب تاریخ میں یوں موجود ہے:

"كَانَ يحيى يُثَبِّتُهُ"[1] "امام یحییٰ بن سعید انھیں ثبت قرار دیتے تھے۔"

اس کے ساتھ ساتھ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

"قال ابن معين: قال لي يحيى: لم أر شيخا يشبهه في الثقة"[2]

"ابن معین نے کہا: مجھ سے امام یحییٰ بن سعید نے کہا: میں نے ثقاہت میں محمد بن یوسف کے ہم پلہ کسی کو نہیں دیکھا۔"

یہ اقوال تہذیب الکمال میں بھی منقول ہیں، لہٰذا حافظ ابن حجر کی بنیاد یہی اقوال ہیں جن کے بیان میں انھیں کوئی وہم نہیں ہوا، لہٰذا حافظ موصوف کا محمد بن یوسف کو ثقہ کے ساتھ ثبت قرار دینا بالکل مبنی برصواب ہے۔

الغرض محمد بن یوسف کو دو عظیم محدثین نے ثقہ وثبت کہا ہے۔ ایک جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن سعد نے اور دوسرے خاتمة الحفاظ حافظ ابن حجر نے۔ جب کہ یزید بن خصیفہ کے بارے میں صرف اور صرف ایک محدث ابن سعد ہی سے اعلیٰ توثیق منقول ہے، چنانچہ امام ابن سعد رحمہ اللہ نے کہا:

"وَكَانَ عَابِدًا نَاسِكًا ثِقَةً كَثِيرَ الْحَدِيثِ ثَبَتًا"[3]

"یہ عابد، ناسک، ثقہ، کثیر الحدیث اور ثقہ تھے۔"

لیکن یحییٰ بن سعید جیسے جرح وتعدیل کے امام اور حافظ ابن حجر جیسے ماہرِ رجال کے بالمقابل ابن سعد کی اعلیٰ توثیق وزن نہیں رکھتی۔

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (٤٢/٢)

[2] تهذيب التهذيب لابن حجر (٣٥/٣١)

[3] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٢٧٤/٩)

ابن خصیفہ کے ضعفِ حفظ کی تیسری دلیل:

محمد بن یوسف نے کسی بھی روایت میں اپنے حافظے پر تردد کا اظہار نہیں کیا ہے، جب کہ یزید بن خصیفہ نے اپنے حافظے پر تردد کا اظہار کیا ہے، جیسا کہ فوائد ابی بکر النیسابوری کے حوالے سے وضاحت گزر چکی ہے۔

ابن خصیفہ کے ضعفِ حفظ سے متعلق بعض شبہات کا ازالہ:

بعض لوگ یہ بے بنیاد دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ یزید بن خصیفہ، محمد بن یوسف سے زیادہ ثقہ ہیں۔ اب ان حضرات کے شبہات کا ازالہ پیشِ خدمت ہے:

پہلا شبہہ:

امام اثرم نے احمد بن حنبل سے یزید بن خصیفہ کے بارے میں نقل کیا:

"ثقة ثقة"[1] "یہ ثقہ ہیں، یہ ثقہ ہیں۔"

عرض ہے کہ یہ مکرر توثیق امام احمد رحمہ اللہ سے ثابت نہیں جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

① یہ مکرر توثیق صرف ایک مخطوطہ میں ہے، دیگر مخطوطوں میں ایسا نہیں۔

② امام احمد بن حنبل کے کسی بھی دوسرے شاگرد نے ان سے یہ بات نقل نہیں کی۔

③ امام احمد بن حنبل کے بیٹے نے بھی ایسا نقل نہیں کیا۔

④ امام احمد سے ان کے بارے میں منکر الحدیث بھی منقول ہے۔

''الاجماع'' کے مضمون نگار صاحب نے ان نکات کا کوئی جواب دینے کے بجائے الزاماً یہ کہا ہے کہ ناچیز نے ایک مقام پر امام بخاری کے حوالے سے ایک جملے

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (٢٧٤/٩)

کو درست قرار دیا ہے، جب کہ وہ جملہ ان کی کتاب التاریخ الاوسط کے اس نسخے میں تھا جس سے امام ابن کثیر نے نقل کیا ہے، لیکن التاریخ الاوسط کے دوسرے نسخے میں یہ جملہ نہیں ہے۔ [1]

عرض ہے کہ ''التاریخ الاوسط'' والی عبارت سے متعلق جو بات ہم نے کہی ہے وہ نقص و کمی سے متعلق ہے، جب کہ یہاں معاملہ نقص و کمی کا نہیں بلکہ تصحیف و نکارت کا ہے۔

امام بخاری کا جو کلام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، اس میں تصحیف کا کوئی امکان ہی نہیں، کیوں کہ ناسخ اس طرح کی غلطی نہیں کر سکتا کہ پورا ایک نیا جملہ اپنی طرف سے اضافہ کر دے، مزید یہ کہ امام بخاری کا وہ کلام ان کے کسی بھی موجود دوسرے کلام سے نہ تو مختلف ہے اور نہ ان کے کسی اور کلام کے معارض ہے۔ جب کہ یہاں معاملہ یہ ہے کہ صرف ایک نسخے میں لفظ ثقہ دوبار لکھ دیا گیا ہے، جب کہ دوسرے نسخوں میں ایسا نہیں ہے۔ یہ صاف دلیل ہے کہ یہاں ناسخ کا قلم سبقت کر گیا ہے اور اس نے ایک ہی لفظ کو مکرر لکھ دیا ہے۔ ناسخین اور کاتبین سے اس طرح کی غلطیاں عام سی بات ہیں۔ آج بھی لکھنے والے اس طرح کی غلطی کرتے رہتے ہیں اور پروف ریڈنگ والے ان کی اصلاح کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ یہی قول امام اثرم ہی کے حوالے سے امام مزی رحمہ اللہ نے بھی تہذیب الکمال میں نقل کیا ہے اور صرف ایک ہی بار لفظ ''ثقہ'' نقل کیا ہے۔ [2]

امام مِزی رحمہ اللہ براہِ راست ابوبکر الاثرم کی کتاب سے نقل کرتے ہیں، جس

---

[1] ماحصل از مجلّہ ''الاجماع'' (شمارہ: ۱، ص: ۲۶، ۲۷)

[2] تهذيب الكمال للمزي (۱۷۳/۲۳)

سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوبکر الاثرم نے یہ لفظ مکرر روایت ہی نہیں کیا، بلکہ ان کے واسطے سے جب یہ لفظ الجرح والتعدیل میں درج ہوا تو اس کے کسی ناسخ نے سہواً یہ لفظ مکرر لکھ دیا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ ہی سے اس کے معارض بات ثابت ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے ابن خصیفہ کو منکر الحدیث کہا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے راوی کو امام احمد رحمہ اللہ اعلیٰ درجے کا ثقہ کہہ ہی نہیں سکتے۔

دوسرا شبہہ:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابن معین نے انھیں ''ثقة حجة'' کہا ہے۔

عرض ہے کہ ابن معین سے یہ قول ثابت ہی نہیں۔ یہ قول الکمال للمقدسی (۹/ ۴۰۵) میں بے سند و بے حوالہ مذکور ہے اور وہیں سے دیگر کتب والوں نے بھی نقل کیا ہے۔ مثلاً ''تہذیب الکمال'' للمزی (۳۲/ ۱۷۳) وغیرہ۔

ایک صاحب نے لکھا کہ ابن معین کا کوئی قول یزید بن خصیفہ کی تضعیف میں نہیں تو پھر اہلِ حدیث مسلک کے اصول کی روشنی ہی میں کفایت اللہ صاحب کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔[1]

یہ صاحب شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابن معین رحمہ اللہ سے یزید بن خصیفہ کی توثیق ثابت ہے اور یہ بھی توثیق ہی ہے، اس لیے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

عرض ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ سے جو توثیق ثابت ہے وہ محض لفظ ''ثقة'' سے ثابت ہے:

- چنانچہ امام ابن طہمان البادی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۸۴ھ) نے ابن معین سے نقل کیا:

''ثقة''[2] ''یہ ثقہ ہیں۔''

---

[1] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۳۲)

[2] سؤالات البادي عن ابن معين (ص: ٩٧)

❀ امام اسحاق بن منصور رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۱ھ) نقل کرتے ہیں:

"ثقة"[1] "یہ ثقہ ہیں۔"

امام ابن معین کے یہ دو تلامذہ متفق اللسان ہو کر ابن خصیفہ کے بارے میں ابن معین سے صرف لفظ "ثقة" نقل کر رہے ہیں، لیکن ان دونوں کے برعکس احمد بن سعد بن ابی مریم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۳) تنہا ہی ہیں جو الگ الفاظ میں "ثقة، حجة" نقل کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے جب ایک صیغہ صحیح سند سے ثابت ہے تو اس سے مختلف ایسا صیغہ کیسے قبول کر لیا جائے جس کی کوئی سند ہی نہ ہو۔ بلکہ اگر احمد بن سعد بن ابی مریم کی یہ روایت صحیح سند سے ثابت بھی ہوتی تو بھی ناقابلِ التفات ہوتی، کیوں کہ ابن معین سے توثیق نقل کرتے ہوئے ان کی یہ عادت ہے کہ وہ ابن معین سے عموما "ثقة، حجة" ہی کے الفاظ میں توثیق نقل کرتے ہیں، یعنی "حجة" کا لفظ امام ابن معین کا نہیں ہوتا، بلکہ یہ خود روایت بالمعنی کرتے ہوئے اپنی طرف سے بڑھا دیتے ہیں۔

اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ کبھی کبھی ثقہ کا لفظ بول کو محض دیانت داری مراد لیتے تھے، جیسا کہ علامہ معلّمی رحمہ اللہ ابن معین رحمہ اللہ کے اقوال کا استقراء کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وهذا يشعر بأن ابن معين كان ربما يطلق كلمة ثقة، لا يريد بها أكثر من أن الراوي لا يتعمد الكذب"[2]

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ کبھی کبھی ثقہ بول کر صرف

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ت المعلمي (٢٧٤/٩) وإسناده صحيح.

[2] التنكيل بما في تأنيب الكوثري من الأباطيل (١٦٤/١)

یہ مراد لیتے تھے کہ یہ راوی جھوٹ نہیں بولتا۔‘‘

یعنی ضبط کے لحاظ سے توثیق مراد نہیں ہوتی تھی۔ امام ابن معین رحمہ اللہ کے اس طرزِ عمل سے بعض لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں اور دیانت والی توثیق کو ضبط والی توثیق بھی سمجھ سکتے ہیں یا اس کے برعکس ضبط والی توثیق کو صرف دیانت پر بھی محمول کر سکتے ہیں، ابن معین رحمہ اللہ کے اقوالِ توثیق میں اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ان کے شاگرد احمد بن سعد بن ابی مریم نے یہ طریقہ اپنایا کہ ہر وہ توثیق جو محض دیانت داری بتلانے کے لیے نہیں ہوتی تھی، بلکہ عام اصطلاحی توثیق ہوتی تھی، اسے نقل کرتے ہوئے لفظ ’’ثقة‘‘ کے ساتھ اپنی طرف سے ’’حجة‘‘ کا بھی اضافہ فرماتے گئے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ احمد بن سعد بن ابی مریم اپنی طرف سے ہی لفظ ’’حجة‘‘ کا اضافہ کرتے تھے؟ تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن معین کے کسی بھی شاگرد نے ابن معین رحمہ اللہ کی کوئی ایک توثیق بھی ’’ثقة، حجة‘‘ کے الفاظ میں نقل نہیں کی۔ ہماری معلومات کی حد تک احمد بن سعد بن ابی مریم کے علاوہ ابن معین رحمہ اللہ سے ان کے جن تلامذہ نے بکثرت سوالات کیے ہیں یا ان کے اقوال نقل کیے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

- المفضل الغلابی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۶ھ)
- اسحاق بن منصور رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۱ھ)
- امام ابن الجنید رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۰ھ تقریباً)
- جعفر بن محمد الباہلی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ)
- عباس الدوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۱ھ)
- ہاشم بن مرثد رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۸ھ)

❁ ابن طہمان البادی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۸۴ھ)

❁ عثمان الدارمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۸۰ھ)

❁ احمد بن محمد بن قاسم بن مُحرِز (وفات نامعلوم)

المفضل الغلابي کے سوالات تاریخ بغداد میں ہیں، اسحاق بن منصور کے سوالات الجرح والتعدیل وغیرہ میں ہیں، جعفر بن محمد الباہلی کے سوالات المجروحین لابن حبان، تاریخ دمشق لابن عساکر وغیرہ میں ہیں اور باقی سب کے سوالات مطبوع ہیں۔

کوئی شخص ابن معین کے ان تمام شاگردوں کے سارے سوالات چھان مارے، حتی کہ مذکورہ تلامذہ کے علاوہ بعض دیگر تلامذہ جنھوں نے ابن معین سے بکثرت تو نہیں مگر کچھ اقوال ضرور نقل کیے ہیں، انھیں بھی دیکھ ڈالے، ان سب میں کسی ایک شاگرد کے یہاں بھی ابن معین سے ''ثقة، حجة'' کے الفاظ میں کوئی توثیق نہیں ملے گی۔

لیکن آپ احمد بن سعد بن ابی مریم کے سوالات دیکھیں تو ان کے یہاں ابن معین سے نقل کردہ توثیقات میں ننانوے فی صد توثیقات ''ثقة، حجة'' کے الفاظ ہی میں پائیں گے۔

آسانی کے لیے ''موسوعة أقوال يحيى بن معين في الجرح والتعديل'' ہی دیکھ لیں، اس کے مطابق کم از کم بیس (۲۰) راویوں سے متعلق احمد بن سعد بن ابی مریم نے امام ابن معین سے ''ثقة، حجة'' کے الفاظ نقل کیے ہیں، لیکن ان میں سے کسی بھی راوی سے متعلق ابن معین سے دنیا کے کسی بھی راوی نے یہ الفاظ نقل نہیں کیے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک معمولی طالب علم بھی پکار اٹھے گا کہ احمد بن سعد بن ابی مریم کی نقل کردہ توثیقات میں ''حجة'' کا لفظ شاگرد کا اپنا لفظ ہے، نہ کہ

ابن معین کا۔ اور اس کی یہ توجیہ گزر چکی ہے کہ اس لفظ کے اضافہ کا مقصد توثیق میں تاکید یا وزن پیدا کرنا نہیں، بلکہ محض لفظ ثقہ کی تشریح کرنا مقصود ہے کہ یہ عام اصطلاحی معنی میں توثیق ہے۔

واضح رہے کہ ابن خصیفہ سے متعلق ابن معین سے احمد بن سعد بن ابی مریم کی نقل کردہ توثیق ثابت بھی نہیں ہے، جن صاحب کی تردید میں ہم یہ تفصیل لکھ رہے ہیں، انھوں نے بہت توانائی صرف کی لیکن اس قول کی کوئی صحیح سند تو درکنار سرے سے سند ہی تلاش نہیں کر سکے اور اپنی اس بے بسی پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ مضحکہ خیزی کی کہ تہذیب الکمال کے مخطوطہ کا عکس پیش کیا اور فرمایا کہ یہ توثیق مخطوطہ میں بھی موجود ہے۔[1]

سبحان اللہ ! سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شاہکار تحقیق پر ہم کیا عرض کریں، کیوں کہ ہم نے تو تہذیب الکمال میں اس توثیق کے وجود کا انکار ہی نہیں کیا، پھر مخطوطہ بینی چہ معنی دارد؟

موصوف ان مضحکہ خیزیوں کے بعد فرماتے ہیں:

’’معلوم ہوا اس قول کی کوئی نہ کوئی سند موجود ہے۔‘‘[2]

مودبانہ گذارش ہے کہ جب ’’کوئی نہ کوئی‘‘ کا قیاسی گھوڑا ہی دوڑانا ہے تو اپنے ادارے کا نام ’’اجماع فاؤنڈیشن‘‘ کے بجائے ’’قیاس فاؤنڈیشن‘‘ رکھ لیں!

امام ابن معین کا ایک اور غیر ثابت وغیر متعلق قول:

ابن معین سے ایک اور قول منقول ہے، چنانچہ ابن محرز نے کہا:

’’سَمِعتُ يَحيَى، وقيل له: أيما أَحبُّ إليكَ: يَزيد بن عَبد الله

[1] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱،ص: ۲۴)

[2] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱،ص: ۲۴)

بن خُصَيفَة، أَو مُحَمّد بن عَمرو بن عَلقَمَة؟ فقال: يَزيد، ويَزيد أعلاهما‘‘[1]

’’امام ابن معین سے کہا گیا کہ ابن خصیفہ اور محمد بن عمرو میں کون آپ کو زیادہ پسند ہے؟ ابن معین رحمہ اللہ نے کہا: یزید، دونوں میں یہ اعلیٰ ہے۔‘‘

اول یہ اعلیٰ درجے کی توثیق نہیں ہے، دوم یہ قول ثابت نہیں، کیوں کہ ابن محرز نامعلوم التوثیق ہے۔

ہم نے یہ قول خود اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا اور اس کی تردید کی تھی، لیکن اجماع کے مضمون نگار نے اسی کو بطور تائید پیش کر دیا، حالانکہ ہم بتا چکے تھے کہ یہ قول نہ تو ثابت ہے اور نہ اس میں کوئی اعلیٰ درجے کی توثیق ہے، لیکن مجلّہ ’’الاجماع‘‘ کے مضمون نگار امام ابن معین سے منقول یہی قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

’’یہ صاف بتلا رہا ہے کہ یزید بن خصیفہ ثقہ ہی نہیں بلکہ حجت اور مضبوط ہیں، کیوں کہ محمد بن عمرو بن علقمہ (المتوفی: ۱۴۵ھ) صحیحین کے راوی ہیں اور خود امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ آپ ثقہ ہیں۔‘‘[2]

عرض ہے کہ موصوف کی بات میں کسی حد تک وزن تب ہوتا جب محمد بن عمرو بن علقمہ مطلقاً ثقہ ہوتے اور ان پر کوئی جرح نہ ہوتی، لیکن ائمہ فن کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی ائمہ نے ان پر جرح کی ہے، اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان سے متعلق ائمہ کے اقوال کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا ہے:

’’صدوق له أوهام‘‘[3] ’’یہ صدوق ہیں، ان سے اوہام صادر ہوتے تھے۔‘‘

---

[1] معرفة الرجال لابن معين رواية ابن محرز (١١٦/١)

[2] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۲۴)

[3] تقريب التهذيب لابن حجر (٦١٨٨)

نیز فتح الباری کے مقدمہ میں کہتے ہیں:

”صدوق تكلم فيه بعضهم من قبل حفظه“[1]

”یہ صدوق ہیں۔ بعض نے حافظے کے لحاظ سے ان پر جرح کی ہے۔“

جہاں تک یہ بات ہے کہ یہ صحیحین کے راوی ہیں، تو صحیحین میں ان کی روایت کس حیثیت سے ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وأخرج له الشيخان، أما البخاري فمقرونا بغيره وتعليقا، وأما مسلم فمتابعة“[2]

”شیخین (بخاری و مسلم) نے ان کی حدیث روایت کی ہے، جہاں تک امام بخاری کی بات ہے، تو انھوں نے اسے دوسرے کے ساتھ ملا کر روایت کیا ہے یا تعلیقات میں ان کی حدیث روایت کی ہے، اور رہے امام مسلم تو انھوں نے متابعات میں ان کی حدیث روایت کی ہے۔“

معلوم ہوا کہ صحیحین میں اس راوی سے کوئی بھی ایسی حدیث نہیں ہے جس کا دار و مدار صرف اسی پر ہو، نیز ائمہ فن نے اس کے حافظہ پر جرح کی ہے، اس لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب اور مقدمہ فتح الباری، دونوں کتابوں میں اسے صرف صدوق ہی کہا ہے اور ساتھ ہی اس کے حفظ کی کمزوری بیان کی ہے۔

جہاں تک امام ابن معین رحمہ اللہ کی بات ہے تو انھوں نے بھی متعدد مواقع میں اس راوی پر جرح کی ہے، چنانچہ عباس الدوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۱ھ) نے ابن معین سے نقل کیا:

---

[1] مقدمة فتح الباري لابن حجر (ص: ٤٤١)

[2] مقدمة فتح الباري لابن حجر (ص: ٤٤١)

"لم يكونوا يكتبون حديث محمد بن عمرو حتى اشتهاها أصحاب الإسناد فكتبوها"[1]

''محدثین محمد بن عمرو کی حدیث لکھتے ہی نہیں تھے، یہاں تک کہ اسناد سے شوق رکھنے والے اس کی طرف مائل ہوئے تو محدثین نے لکھنا شروع کیا۔''

امام ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

"سئل يحيى بن معين عن محمد بن عمرو؟ فقال: ما زال الناس يتقون حديثه، قيل له: وما علة ذلك؟ قال: كان محمد بن عمرو يحدث مرة عن أبي سلمة بالشيء من رأيه، ثم يحدث به مرة أخرى عن أبي سلمة، عن أبي هريرة"[2]

''امام ابن معین سے محمد بن عمرو کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: محدثین اس کی حدیث سے اجتناب کرتے تھے۔ کہا گیا: اس کی وجہ کیا ہے؟ تو ابن معین رحمہ اللہ نے جواب دیا: محمد بن عمرو، یہ ابوسلمہ سے کبھی ان کی رائے نقل کرتے اور پھر دوسری دفعہ اسی رائے کو ابوسلمہ کے واسطے ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے لگتے۔''

معلوم ہوا کہ دیگر محدثین کے علاوہ خود ابن معین رحمہ اللہ نے بھی محمد بن عمرو کے حافظے پر جرح کر رکھی ہے، لہٰذا ایسے کمزور حافظہ والے کے مقابل میں ابن معین، یزید بن خصیفہ کو بہتر بتائیں تو یہ فی نفسہٖ اعلیٰ درجے کی توثیق ہے نہ کسی مطلق ثقہ کے مقابلے میں اعلیٰ توثیق ہے، بلکہ ایک کمزور حفظ والے راوی کے مقابلے میں ان کا رتبہ

---

[1] تاريخ ابن معين، رواية الدوري (۳/۲۲۵)

[2] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ت المعلمي (۸/۳۰)

بڑا بتلانا مقصود ہے، اور اس سے کس کو انکار ہے؟

تنکے کا سہارا:

ایک روایت کے مطابق ابن معین رحمہ اللہ نے محمد بن عمرو کو محمد بن اسحاق کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ قرار دیا تو اس کا حوالہ دینے کے بعد ''الاجماع'' کے مضمون نگار نے یہ کہا کہ ابن معین نے محمد بن اسحاق کو ''ثبت في الحديث'' کہا ہے، پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جب ابن معین کے یہاں ابن اسحاق ثبت فی الحدیث ہیں اور ابن معین ہی نے محمد بن عمرو کو ان سے زیادہ پسندیدہ بتلایا ہے، پھر ابن خصیفہ کو محمد بن عمرو پر بھی فوقیت دی ہے تو اس سے بھی پتا چلا کہ ابن خصیفہ بھی ابن معین کے یہاں حجت اور مضبوط ہیں۔[1]

عرض ہے کہ ابن معین نے ابن اسحاق کے بارے میں صرف ''ثبت'' ہی نہیں کہا، بلکہ انھوں نے ابن اسحاق پر متعدد دفعہ جرح بھی کی ہے، بلکہ بعض اقوال میں اسے ضعیف کہا ہے اور خود احناف بھی ابن معین کی طرف سے ابن اسحاق کی تضعیف کو اس وقت مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں جب ابن اسحاق فاتحہ خلف الامام والی روایت بیان کرتے ہیں، بلکہ امام مالک کے حوالے سے ابن اسحاق کو دجال تک کہہ جاتے ہیں اور یہاں معصومیت دیکھیں کہ ابن اسحاق کو صرف ''ثقة'' ہی نہیں بلکہ ''ثبت في الحديث'' بھی ماننے کے لیے مجبور ہیں۔ سبحان اللّٰہ!

جواباً عرض ہے کہ جس موازنے پر مضمون نگار نے اپنے استدلال کی پوری بنیاد رکھی ہے، اس کی نوعیت مضمون نگار کے نزدیک ثقہ راوی ابن محرز نے یوں نقل کی ہے:

''محمد بن عمرو أحب إلي منه، وأهل المدينة لا يرون أن

---

[1] ماحصل از الاجماع (شمارہ:۱،ص:۲۵)

يحدثوا عن ابن إسحاق، وذلك أنه كان قدريا" [1]

''محمد بن عمرو میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور اہلِ مدینہ ابن اسحاق سے روایت بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قدری تھے۔''

ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں موازنہ حفظ و ضبط کے لحاظ سے نہیں، بلکہ قدری ہونے کے لحاظ سے ہے، لہٰذا محمد بن عمرو پر قدری ہونے کا الزام نہیں ہے تو یہ چیز ان کے حفظ و ضبط میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔

تاہم اسے ہم نظر انداز بھی کر دیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ حفظ کے لحاظ سے یہ موازنہ تھا تو عرض ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ نے خود محمد بن عمرو کے بارے میں جو جروح کر رکھی ہیں انھیں ماقبل میں پیش کیا جا چکا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ابن اسحاق سے انھیں زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ابن معین نے ابن اسحاق پر محمد بن عمرو سے بھی زیادہ جرح کر رکھی ہے، حتی کہ بعض اقوال میں انھیں ضعیف تک کہا ہے، ملاحظہ ہو۔

ابو الحسن المیمونی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۴ھ) نے ابن معین سے نقل کیا:

"محمد بن إسحاق ضعيف" [2] ''محمد بن اسحاق ضعیف ہے۔''

امام ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) نے ابن معین سے نقل کیا:

"ليس بذاك، ضَعِيف" [3] ''یہ لیس بذاک اور ضعیف ہے۔''

اب توثیق کے اقوال دیکھیں:

عباس الدوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۱ھ) نے ابن معین سے نقل کیا:

---

[1] معرفة الرجال، رواية ابن محرز، ت الأزهري (ص: ۱۷۳)

[2] العلل للأحمد رواية الميموني، ت الأزهري (ص: ۱۷۵)

[3] تاريخ ابن أبي خيثمة (٣٢٤/٤)

"محمد بن إسحاق صدوق ولكنه ليس بحجة "[1]

''محمد بن اسحاق صدوق ہیں، لیکن حجت نہیں ہیں۔''

نیز یہ بھی نقل کیا ہے:

"ليس هو بقوي في الحديث"[2] ''یہ حدیث میں قوی نہیں ہیں۔''

امام ابو زرعہ الدمشقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۸۱ھ) کہتے ہیں کہ میں نے ابن معین سے ابن اسحاق کے حجت ہونے کے بارے میں سوال کیا تو ابن معین نے جواب دیا:

"كان ثقة، إنما الحجة عُبيد الله بن عمر ...."[3]

''یہ ثقہ تھے، لیکن حجت عبیداللہ بن عمر اور فلاں فلاں ہیں۔''

توثیق کے یہ اقوال دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ ابن اسحاق کو اعلیٰ درجے کا ثقہ نہیں مان رہے، بالخصوص جب کہ دوسری طرف انھوں نے اس کی تضعیف بھی کی ہے۔ سارے اقوال کو دیکھنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ابن معین رحمہ اللہ کی نظر میں ابن اسحاق نہ تو ایسے ضعیف ہیں کہ ان کی روایت بالکل ہی رد کر دی جائے اور نہ ایسے ثقہ ہیں کہ ان کی روایت کو اعلیٰ درجے پر فائز کر دیا جائے، بالفاظ دیگر یہ کہہ لیں کہ ابن معین کی نظر میں یہ حسن الحدیث ہیں۔

اب رہی بات یہ کہ المفضل الغلابی رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں "ثبت في الحديث" کے الفاظ نقل کیے ہیں، تو عرض ہے کہ ان کے کلام میں یہ الفاظ حسن الحدیث ہی کے معنی میں ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ خود انھوں نے ہی دوسرے موقع پر یہی الفاظ نقل کیے ہیں، چنانچہ المفضل الغلابی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۶ھ) ہی ابن اسحاق کے

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ت المعلمي (۱۹۲/۷)

[2] تاريخ ابن معين، رواية الدوري (۲٤۷/۳)

[3] تاريخ أبي زرعة الدمشقي، ط مجمع (٤٦٠/۱)

بارے میں دوسری جگہ ابن معین سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كان ثقة، وكان حسن الحديث"[1]

''ابن اسحاق ثقہ اور حسن الحدیث تھے۔''

ملاحظہ فرمائیں! امام الغلابی ہی کی دوسری روایت سے سارے بادل چھٹ گئے اور یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ ان کی روایت میں "ثبت في الحديث" حسن الحدیث ہی کے معنی میں ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ابن معین رحمہ اللہ کی نظر میں ابن اسحاق اوسط درجے کے ثقہ، یعنی حسن الحدیث ہیں، لہٰذا ان کے مقابلے میں اگر ابن معین نے محمد بن عمرو کو زیادہ پسندیدہ کہا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محمد بن عمرو، یہ ابن اسحاق کے مقابلے میں فوقیت رکھتے ہیں اور اس فوقیت کا مفہوم اسی دائرے میں ہے جو خود محمد بن عمرو سے متعلق ابن معین کے دیگر اقوال سے طے ہوتا ہے، جس کی وضاحت ماقبل میں ہوچکی ہے، یعنی یہ بھی صدوق وحسن الحدیث ہی کے مقام پر ہیں لیکن ابن اسحاق کی بہ نسبت ان کی حالت قدرے بہتر ہے۔

پھر محمد بن عمرو کے مقابلے میں یزید بن خصیفہ کو اعلیٰ بتلانے کا مقصود یہ ہے کہ یزید بن خصیفہ صدوق وحسن الحدیث کے درجے سے اوپر ثقہ کے درجے پر فائز ہیں، لیکن اعلیٰ درجے کے ثقہ ہرگز نہیں ہیں۔

یہ پورا جواب یہ فرض کر لینے کی صورت میں ہے کہ ابن معین سے محمد بن عمرو اور ابن خصیفہ کے مابین مذکورہ موازنہ ثابت ہو، لیکن ہم عرض کر چکے ہیں کہ ابن محرز کے سبب سرے سے یہ موازنہ ہی ثابت نہیں ہے۔

---

[1] تاريخ مدينة السلام للخطيب البغدادي (١١/٢)

تیسرا شبہہ:

ابن سعد نے یزید بن خصیفہ کو تابعین میں ذکر کیا ہے، لیکن محمد بن یوسف کو ذکر نہیں کیا۔

عرض ہے کہ اول تو طبقات کے کئی صفحات مفقود ہیں، اس لیے محمد بن یوسف کے عدمِ ذکر کا دعویٰ محلِ نظر ہے۔ دوم عدمِ ذکر سے یہ کہاں لازم آ گیا کہ ابن سعد کی نظر میں وہ کم حفظ والے تھے۔ ایسا اسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ جب ابن سعد نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہوتا اور دونوں کے تعارف میں تفریق کی ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے، لہٰذا یہ دعویٰ ثابت نہ ہوا۔

نیز الزاماً ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ نے یزید بن خصیفہ کو اپنی کسی مجلس میں نہ تو ثقہ کہا اور نہ ہی ان کا تذکرہ کیا، جب کہ اسی طبقے سے تعلق رکھنے والے محمد بن یوسف کو اعلیٰ درجے کا ثقہ قرار دیا، بلکہ ایک روایت کے مطابق یہاں تک کہا:

"لم أر شيخا يشبهه في الثقة"[1]

''میں نے ثقاہت میں محمد بن یوسف کے ہم پلہ کسی کو نہیں دیکھا۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ محمد بن یوسف جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن سعید کی نظر میں یزید بن خصیفہ سے زیادہ ثقہ تھے۔ یاد رہے کہ ابن سعد کے بالمقابل امام یحییٰ بن سعید رجال کی بابت زیادہ ماہر ہیں۔

چوتھا شبہہ:

امام ذہبی رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف کے بارے میں کہا:

---

[1] تهذيب الكمال للمزي (٥٠/٢٧) تهذيب التهذيب لابن حجر (٣٥/٣١)

''صدوق مقل'' [1] ''یہ صدوق اور قلیل الحدیث ہیں۔''

عرض ہے:

① امام ذہبی رحمہ اللہ نے صدوق کے ساتھ مقل بھی کہا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ موصوف نے مقل کے اعتبار سے انھیں صدوق کہہ دیا ہے، یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد کم ہے، اسی لیے جن کی مرویات زیادہ ہوں انھیں امام ذہبی رحمہ اللہ حافظ سے تعبیر کرتے ہیں جس پر ان کی کتاب تذکرۃ الحفاظ شاہد ہے۔

نیز امام ذہبی رحمہ اللہ نے تو قلتِ روایت کی وجہ سے صرف ''صدوق'' کہا ہے، لیکن امام ابن معین کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ قلیل الحدیث رواۃ کو ''لیس بشيء'' کہہ دیا کرتے تھے، چاہے وہ ثقہ وثبت ہی کیوں نہ ہو اور ''لیس بشيء'' سے مراد متعلقہ راوی کے حفظ کی کمزوری نہیں، بلکہ اس کی مرویات کی قلت مقصود ہوتی تھی۔ [2]

لہٰذا اگر قلیل الحدیث کی وجہ سے کسی کو ''لیس بشيء'' کہنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر قلیل الحدیث کے سبب کسی کو صدوق کہنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟

بنا بریں امام ذہبی رحمہ اللہ کے اس صیغے سے حافظے کی کمزوری قطعاً مراد نہیں جس کی ایک زبردست دلیل یہ بھی ہے کہ اگر امام ذہبی رحمہ اللہ کی نظر میں اس کا حافظہ کمزور ہوتا تو موصوف اس کا تذکرہ میزان الاعتدال میں ضرور کرتے، کیوں کہ اس کتاب میں امام ذہبی رحمہ اللہ نے تو ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ثقہ وثبت ہیں اور ان پر بلاوجہ کلام کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں محمد بن یوسف کا تذکرہ تو میزان میں ضرور ہونا

---

[1] الكاشف للذهبي (٢/٢٣٢)

[2] التعريف برجال الموطأ (٣/٨١٢) فتح المغيث (٢/١٢٣) التنكيل (ص: ٥٤)

چاہیے، کیوں کہ یہ تو خود امام ذہبی رحمہ اللہ کے نزدیک کمزور حافظہ والے تھے۔

② امام ذہبی نے اسی کتاب میں یزید بن خصیفہ کو ثقہ کہنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں امام احمد کی جرح منکر الحدیث بھی نقل کی ہے اور کوئی دفاع نہیں کیا، نیز اس کا تذکرہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے میزان میں بھی کیا ہے اور وہاں بھی کوئی دفاع نہیں کیا، جب کہ محمد بن یوسف سے متعلق امام ذہبی رحمہ اللہ نے کوئی جرح نقل نہیں کی اور اس کا تذکرہ بھی میزان میں نہیں کیا ہے۔

قارئین غور کریں کہ ایک راوی جسے امام ذہبی ضعفاء والی کتاب میں ذکر کریں اور کوئی دفاع نہ کریں، ایسا راوی حفظ و اتقان میں اس راوی سے بڑھ کر کیسے ہوسکتا ہے جس کا تذکرہ امام ذہبی ضعفاء کی کسی بھی کتاب میں نہ کریں اور اس کے بارے میں کوئی جرح نہ نقل کریں۔

③ متقدمین محدثین نے متفقہ طور پر محمد بن یوسف کو ثقہ کہا بلکہ جرح وتعدیل کے مسلمہ امام یحییٰ بن سعید القطان نے انھیں ثبت قرار دیا ہے، لہٰذا متقدمین اور جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن سعید کے بالمقابل امام ذہبی کے فیصلے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

پانچواں شبہہ:

ایک صاحب نے لکھا ہے:

حافظ المغرب امام ابو عمر بن عبد البر (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

”وکان ثقة مأمونا“[1] ”ابن خصیفہ ثقہ و مامون ہیں۔“

عرض ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث میں حفظ و ضبط کے لحاظ سے موازنہ کی بات چل رہی ہے کہ کون اعلیٰ درجے کا ضابط ہے اور کون ادنیٰ درجے کا ضابط ہے، جب کہ

[1] التمهيد لابن عبد البر (۲۳/۲۵)

"مأمون" کے لفظ سے دیانت وغیرہ کی گواہی دی جاتی ہے نہ کہ ضبط کی، چنانچہ امام مسلم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲٦۱ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا نصر بن علي الجهضمي حدثنا الأصمعي عن ابن أبي الزناد عن أبيه قال: أدركت بالمدينة مائة كلهم "مأمون" ما يؤخذ عنهم الحديث، يقال: ليس من أهله"[1]

"امام ابو الزناد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے مدینہ میں سیکڑوں لوگوں کو پایا جو مامون تھے، لیکن ان سے حدیث کی روایت نہیں کی جاتی تھی، کیوں کہ بقول اہلِ علم وہ اس کے قابل نہ تھے۔"

اب اگر امام ابن عبدالبر نے ثقہ کے ساتھ انھیں "مأمون" کہہ دیا ہے تو یہ صرف دیانت کا بیان ہے، بھلا اس سے حفظ وضبط کا پلڑا کیسے بھاری کیا جا سکتا ہے؟!

شذوذ کی تیسری وجہ:

یزید بن خصیفہ کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کے بھی خلاف ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ اللیل کی تعداد گیارہ بتلائی گئی ہے۔ یاد رہے کہ صلاۃ اللیل ہی کو رمضان میں تراویح کہا جاتا ہے۔

کیا کسی راوی نے یزید بن خصیفہ کی متابعت کی ہے؟

"الاجماع" کے مضمون نگار لکھتے ہیں:

"بیس رکعات تراویح کے سلسلے میں ابن خصیفہ منفرد ہی نہیں، بلکہ ان کے پیچھے متابعات بھی موجود ہیں۔"[2]

---

[1] صحيح مسلم، مقدمه (۱۲/۱) وإسناده صحيح.

[2] الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۲۷)

عرض ہے کہ چھے تو درکنار کوئی ایک ہی صحیح روایت پیش کر دیں جس میں یزید بن خصیفہ کی جگہ کسی اور ثقہ راوی نے محمد بن سائب کی سند سے یہ بیس والی بات نقل کی ہو۔

ہمارے علم کی حد تک صرف ایک راوی حارث بن عبدالرحمٰن کی متابعت ملتی ہے، لیکن یہ سنداً موضوع ومن گھڑت ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور متابعت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، صحیح ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

لطیفہ: کچھ لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امیر یزید رحمہ اللہ پر سب وشتم کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے پھرتے ہیں کہ یزید کے دور کے بعد اہلِ سنت نے اپنے لڑکوں کا نام یزید رکھنا بند کر دیا۔

عرض ہے کہ اکیس رکعات کی تعداد یزید نامی راوی ہی بیان کر رہے ہیں جو یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کے بعد کے تھے، جب کہ گیارہ کی رکعات کی تعداد محمد نامی راوی بیان کر رہے ہیں۔

اگر یزید کے مخالفین مذکورہ بالا بات پر یقین رکھتے ہیں تو پھر ان کے اصول کے مطابق یزید نامی راوی کوئی اچھا راوی نہیں ہوگا، اس لیے ان حضرات کو یزید بن خصیفہ کے بجائے محمد بن یوسف کی روایت کو ترجیح دینی چاہیے، ورنہ ایک طرف یزید نام سے بھی نفرت اور دوسری طرف محمدی سند کو نظر انداز کر کے یزیدی سند کو گلے لگا لینا، بہت حیرت انگیز ہے!!

موطا میں ایک منقطع روایت کو بھی بیس رکعت والے پیش کرتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے اس میں بھی یزید نامی ایک راوی موجود ہے، بلکہ بیس رکعات سے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے جو مرفوع حدیث پیش کی جاتی ہے اس میں بھی

یزید نام کا راوی موجود ہے۔[1]

تنبیہ: کچھ لوگ محمد بن یوسف کی روایت کے بالمقابل ابن خصیفہ کی روایت کو اس لیے راجح قرار دیتے ہیں کہ ابن خصیفہ سے روایت کرنے والے شاگردوں نے رکعات کی تعداد میں اختلاف نہیں کیا ہے، جب کہ محمد بن یوسف کے شاگردوں نے تعدادِ رکعات میں اختلاف کیا ہے، لٰہذا محمد بن یوسف کی روایت مرجوح ہوگی۔

أولاً: عرض ہے کہ اس روایت میں یزید بن خصیفہ کے صرف اور صرف دو شاگرد ہیں، جب کہ محمد بن یوسف کے آٹھ شاگرد ہیں، ان آٹھ میں سے چھے شاگردوں نے متفقہ طور پر گیارہ رکعات نقل کیا ہے، یعنی ابن خصیفہ سے اگر دو شاگردوں نے بالاتفاق بیس کی تعداد نقل کی ہے تو محمد بن یوسف سے چھے شاگردوں نے بالاتفاق گیارہ کی تعداد نقل کی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ یزید بن خصیفہ سے جس تعداد نے متفق ہو کر بیس نقل کیا ہے، اس تعداد سے تین گنا بڑی تعداد یعنی چھے شاگردوں نے محمد بن یوسف سے متفق ہو کر گیارہ نقل کیا ہے۔ اب اگر ایک دو لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ظاہر ہے کہ جس کے تلامذہ زیادہ ہوں گے، ان میں ایک دو کمزور حفظ والے بھی مل جاتے ہیں جن سے غلطی ہوسکتی ہے۔

ہاں اگر دونوں طرف شاگردوں کی تعداد یکساں ہوتی، یعنی جس طرح اس روایت میں یزید بن خصیفہ کے صرف دو ہی شاگرد ہیں، ٹھیک اسی طرح محمد بن یوسف کے بھی صرف دو ہی شاگرد ہوتے اور یہ اختلاف کرتے تو بات کسی حد تک قابلِ غور بھی تھی، لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ محمد بن یوسف کے شاگردوں کی تعداد

---

[1] اسی کتاب کا صفحہ (۳۰۷ و ۳۵۳) دیکھیں۔

کئی گنا زیادہ ہے۔

ثانیاً: محمد بن یوسف کے چھے شاگردوں نے متفقہ طور پر ایک ہی تعداد بیان کی ہے جن میں امام مالک، یحییٰ بن سعید القطان جیسے جلیل القدر محدثین بھی ہیں، لہٰذا یہاں ایک دو شاگردوں کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں۔

ثالثاً: محمد بن یوسف کے شاگردوں میں بھی اختلاف ثابت نہیں ہے جس کی تفصیل آرہی ہے، کیوں کہ جن چھے شاگردوں نے متفقہ تعداد نقل کی ہے ان کی روایات ثابت ہیں، اسی طرح جس نے تیرہ کی تعداد نقل کی ہے وہ بھی ثابت ہے، مگر یہ معنوی طور پر گیارہ کے منافی نہیں ہے ۔كما سيأتي۔ جبکہ آٹھواں ''نامعلوم'' شخص ہے، لہٰذا اس کے بیان کا کوئی اعتبار ہی نہیں، اس کی تفصیل آرہی ہے۔

ایک صاحب نے لکھا ہے:

''ہمارے علم کے مطابق عبدالرحمٰن مبارکپوری سے پہلے کسی ایک محدث نے بھی اس روایت کو ضعیف نہیں کہا ہے، لیکن پھر بھی کفایت صاحب اس روایت کو ضعیف ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''[1]

یہی صاحب ایک جگہ ناچیز سے مطالبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارا اہلِ حدیثوں سے عموماً اور کفایت صاحب سے خصوصاً سوال ہے کہ وہ کم سے کم امام نووی رحمہ اللہ سے پہلے کا کسی ایک محدث سے حوالہ پیش کریں جنھوں نے ابن خصیفہ کی بیس رکعات تراویح والی روایت کو ضعیف کہا ہو۔''[2]

---

[1] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۱۶)

[2] مجلّہ الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۲۰)

عرض ہے کہ اس روایت پر سب سے پہلے کسی محدث کی طرف سے حکم لگا ہے تو وہ شذوذ ہی کا لگا ہے، یعنی سب سے پہلے اس حدیث کی تضعیف ہی کی گئی ہے اور یہ حکم گیارہ رکعات کے راوی محمد بن یوسف نے لگایا ہے، چنانچہ ماقبل میں گزر چکا ہے اور آگے بھی بات آ رہی ہے کہ جب محمد بن یوسف کے شاگرد نے بیس رکعات کی تعداد کی بابت دریافت کیا تو محمد بن یوسف نے اس کا سختی سے انکار کیا اور اس کے لیے یزید بن خصیفہ کو ذمہ دار ٹھہرایا، جو صاف دلیل ہے کہ محمد بن یوسف بیس کی تعداد روایت کرنے میں یزید بن خصیفہ کو خطا کار ٹھہرا رہے ہیں۔[1]

رواۃ پر دوسرا اعتراض

کہا جاتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے رکعاتِ تراویح کی تعداد کی روایت میں غلطی ہوئی، کیوں کہ ان کے استاذ محمد بن یوسف ہی سے داوٗد بن قیس نے بھی یہی روایت بیان کی ہے، لیکن انھوں نے رکعات کی تعداد گیارہ نہیں بلکہ اکیس بتلائی ہے۔

ابوالقاسم رفیق دلاوری صاحب رقمطراز ہیں:

> ''اسی طرح ہمیں یقین ہے کہ گیارہ کی روایت جو موطا امام مالک میں ہے اسناداً بالکل صحیح ہے، لیکن ہمارے اہلِ حدیث حضرات کی بدقسمتی سے امام مالک اکیس کو گیارہ سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔''[2]

عرض ہے کہ اکیس والی روایت ثابت ہی نہیں، لہٰذا اس کی بنیاد پر امام مالک رحمہ اللہ کی تغلیط ہی بے معنی ہے۔

ذیل میں ہم اس روایت کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔

---

[1] اسی کتاب کا صفحہ (۱۸۴ و ۲۵۳) دیکھیں۔

[2] التوضیح عن رکعات التراویح (ص: ۱۷۰)

تغلیط امام مالک رحمہ اللہ کی بنیاد والی منکر روایت:

امام عبد الرزاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۱۱ھ) فرماتے ہیں:

”عَنْ دَاوُدَ بْنِ قَيْسٍ، وَغَيْرِهِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، أَنَّ عُمَرَ جَمَعَ النَّاسَ فِي رَمَضَانَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَعَلَى تَمِيمٍ الدَّارِيِّ عَلَى إِحْدَى وَعِشْرِينَ رَكْعَةً يَقْرَءُونَ بِالْمِئِينَ وَيَنْصَرِفُونَ عِنْدَ فُرُوعِ الْفَجْرِ“[1]

”داؤد بن قیس وغیرہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، انھوں نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رمضان میں لوگوں کو ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ اکیس رکعات تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا۔ یہ سو سو آیات پڑھتے تھے اور فجر کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔“

یہ روایت ضعیف ہے اور ثقہ رواۃ کے خلاف ہے، لہٰذا منکر ہے۔ اس کی علتوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

پہلی علت:

امام عبد الرزاق نے یہ روایت اپنے دو اساتذہ سے بیان کی ہے:

① داؤد بن قیس۔ ② ”وغیرہ“ یعنی ایک اور نامعلوم شخص۔

جب کوئی محدث اپنے دو طریق سے ایک متن کے ساتھ روایت بیان کرے تو عام اصول یہی ہے کہ وہ متن دونوں طرق کا مانا جائے گا، اِلا یہ کہ تفریق کی کوئی صریح دلیل مل جائے اور یہاں صریح دلیل موجود ہے کہ امام عبد الرزاق کے دونوں استاذ

[1] مصنف عبد الرزاق (٤/٢٦٠)

یعنی ''داؤد بن قیس'' اور ''غیرہ'' (نامعلوم) کا متن مختلف ہے۔ چنانچہ محمد بن یوسف ہی سے داؤد بن قیس کی یہ روایت امام فریابی (المتوفی: ۳۰۱ھ) نے یوں نقل کی ہے:

"حدثنا قتيبة، حدثنا وكيع، عن داود بن قيس، عن محمد ابن يوسف الأعرج، عن السائب بن يزيد قال: كنا في زمن عمر بن الخطاب نفعله، يعني نربط الحبال في شهر رمضان بين السواري، ثم نتعلق بها حتى نرى فروع الفجر"[1]

''سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عہدِ فاروقی میں، ہم ماہِ رمضان میں، ستونوں کے درمیان رسیاں باندھتے تھے، پھر ہم فجر کے ظہور تک اس کا سہارا لیتے تھے۔''

ملاحظہ فرمائیں! داؤد بن قیس کی یہ روایت جو صحیح سند سے ثابت ہے، اس میں تعداد تو درکنار، سرے سے رکعات ہی کا ذکر نہیں، بلکہ فجر تک رسیوں کا سہارا لینے کی بات ہے، یعنی کب تک نماز پڑھتے تھے؟ اس کا بیان ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد بن قیس نے اس روایت کو حد درجہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور صرف رسیوں کا سہارا لینے اور اختتام نماز کے وقت کو ذکر کیا ہے۔

اختتامِ نماز کا یہ وقت عبدالرزاق کی مذکورہ روایت میں بھی ہے، لیکن اس میں رکعات کی تعداد اور نماز کے ائمہ وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اضافی باتیں اس نامعلوم شخص ہی کے متن کا حصہ ہیں جن کا نام امام عبدالرزاق نے نہیں بتلایا ہے، لہٰذا اس نامعلوم شخص کے سبب یہ روایت ضعیف ہے۔ یاد رہے کہ یہ طرزِ عمل یعنی دو طرق سے مختلف الفاظ کو یکجا کر کے ایک ہی سیاق

---

[1] الصيام للفريابي (ص: ۱۳۱، رقم: ۱۷۵) وإسناده صحيح.

میں بیان کرنا اہلِ فن کے یہاں نہ صرف معیوب بات ہے، بلکہ بکثرت ایسا کرنا باعثِ جرح بھی ہے، جیسا کہ ماقبل میں بتایا گیا ہے کہ واقدی پر اس وجہ سے بھی جرح کی گئی ہے۔

چونکہ امام عبدالرزاق سے یہ عمل بکثرت ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس طرح کی ایک دو غلطی معاف ہے، مگر جس روایت میں یہ غلطی ثابت ہوگئی وہ روایت اس سیاق میں صحیح نہ ہوگی۔ علاوہ بریں آگے اس بات کا تذکرہ آ رہا ہے کہ امام عبدالرزاق نابینا ہونے کے بعد متغیر الحفظ ہو گئے تھے اور اس حالت میں تلقین قبول کر لیا کرتے تھے، یعنی کوئی ان کی اپنی ہی روایت رد و بدل کے ساتھ بیان کرتا تو اس سے بھی اتفاق فرما لیتے تھے اور تبدیلی کو بھانپ نہیں پاتے تھے۔

زیرِ بحث روایت امام عبدالرزاق سے دبری نے بیان کی ہے اور دبری کے بارے میں بھی اہلِ فن کی شہادت آ رہی ہے کہ یہ بہت چھوٹے تھے جب ان کے والد انھیں امام عبدالرزاق کے حلقۂ درس میں بٹھا دیا کرتے تھے۔ جہاں دوسرے لوگ امام عبدالرزاق کی مرویات پڑھ کر سناتے اور دبری اسے سنتے۔ ممکن ہے یہ روایت جس حلقۂ درس میں دبری نے نوٹ کی ہے، اس میں کسی قاری نے امام عبدالرزاق کی اس روایت کے ساتھ اضافہ بھی بیان کر دیا ہو، جس پر یا تو امام عبدالرزاق متنبہ نہیں ہو سکے، یا ''وغیرہ'' کہہ کر اس کی اضافہ کردہ بات بھی شاملِ روایت کر لی، شاید یہی وجہ ہے کہ اس طالب علم کا نام بھی نہ لیا، بلکہ ''وغیرہ'' کہہ کر اس کا حوالہ دے دیا۔ واللہ أعلم

دوسری علت:

اسحاق بن ابراہیم الدبری عن عبدالرزاق کے طریق میں ضعف۔ مصنف عبدالرزاق کے مطبوعہ نسخے میں مذکورہ روایات کو امام عبدالرزاق سے اسحاق بن ابراہیم

الدبری نے نقل کیا ہے اور اس طریق سے عبدالرزاق کی مرویات پر اہلِ فن نے کلام کیا ہے۔ اسحاق دبری نے امام عبدالرزاق سے آخری دور میں سنا ہے اور آخر میں عبدالرزاق رحمہ اللہ مختلط ہو گئے تھے۔[1]

لہٰذا جب امام عبدالرزاق اخیر میں مختلط ہو گئے تھے تو جن لوگوں نے ان سے اختلاط کے بعد روایت کی ہے وہ حجت نہیں اور زیرِ تحقیق روایت کو ان سے اسحاق الدبری نے روایت کیا جنھوں نے امام عبدالرزاق کے اختلاط کے بعد ان سے روایت کی ہے۔

تیسری علت:

امام عبدالرزاق سے نقل کرنے والے ''اسحاق بن ابراہیم الدبری'' یہ خود بھی متکلم فیہ ہیں۔[2]

یاد رہے کہ مصنف عبدالرزاق کی عام روایات دبری کے طریق سے آنے کے باوجود بھی مقبول ہیں، کیوں کہ دبری کی روایت کتاب سے ہے، لیکن جن روایات میں نکارت اور مخالفت ہو وہ دبری کی وجہ سے محلِ نظر ہوں گی۔

چوتھی علت:

محمد بن یوسف کے چھے شاگردوں نے ان سے گیارہ رکعات کی تعداد نقل کی ہے۔ ان شاگردوں میں امام مالک اور امام یحییٰ بن سعید جیسے جلیل القدر محدثین بھی ہیں، لہٰذا جمہور اور اوثق کے خلاف دوسری تعداد بتلانے والی یہ روایت منکر ہے۔

روایتِ مذکورہ کے ضعیف و مردود ہونے کی ایک اور زبردست دلیل:

اس روایت کے ضعیف و مردود ہونے کی ایک زبردست دلیل یہ بھی ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ (ص: ۲۴۷۔۲۴۸)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ (ص: ۲۴۹۔۲۵۰)

اس روایت میں محمد بن یوسف کے حوالے سے اکیس کی تعداد نقل کی گئی ہے، جب کہ ابوبکر النیسابوری کی روایت میں محمد بن یوسف کے شاگرد اسماعیل بن امیہ نے جب ان سے یہ روایت سنی تو ان کے استاذ محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد بتلائی، اس پر ان کے شاگرد اسماعیل بن امیہ نے اپنے استاذ کو روک کر پوچھا کہ ''یا اکیس؟'' اس استفسار پر بھی محمد بن یوسف نے گیارہ ہی کی تعداد روایت کی اور اکیس کی تعداد سے متعلق کہا کہ یہ تو یزید بن خصیفہ بیان کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ محمد بن یوسف کے حوالے سے اکیس کی تعداد نقل کرنا سراسر غلط ہے، کیوں کہ انھوں نے اس سے براءت ظاہر کر دی ہے۔ والحمد للّٰہ

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اکیس رکعت والی روایت ثابت ہی نہیں، لہٰذا اسے بنیاد بنا کر امام مالک رحمہ اللہ کی تغلیط کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے نقد کا جائزہ:

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) نے جو یہ کہا ہے:

"ھکذا قال مالك في ھذا الحدیث إحدی عشرة رکعة، وغیر مالك یخالفه فیقول في موضع: إحدی عشرة رکعة (إحدی وعشرین) ولا أعلم أحدا قال في ھذا الحدیث إحدی عشرة رکعة غیر مالك، واللّٰه أعلم"[1]

''یعنی امام مالک رحمہ اللہ نے گیارہ رکعت روایت کیا ہے، جب کہ امام مالک کے علاوہ دوسرے راوی گیارہ رکعات کے بجائے اکیس رکعات روایت کرتے ہیں اور مجھے امام مالک کے علاوہ ایک بھی راوی ایسا نہیں

[1] الاستذکار (۶۸/۲)

معلوم جس نے اس روایت میں گیارہ رکعت نقل کیا ہو۔‘‘

عرض ہے کہ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی یہ بات درست نہیں۔

أولاً: علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اکیس کی تعداد والی جن روایات پر اعتماد کر کے امام مالک رحمہ اللہ کی تغلیط کی ہے وہ صحیح نہیں ہیں، کما مضی۔

ثانیاً: علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ مجھے ایک بھی راوی ایسا نہیں معلوم جس نے اس روایت میں گیارہ رکعت نقل کیا ہو، یہ بجائے خود بہت بڑی غلطی ہے، کیوں کہ امام مالک کے علاوہ بھی بہت سارے رواۃ نے اسی روایت کو بیان کرتے ہوئے گیارہ رکعت کی تعداد نقل کی ہے، اسی لیے امام زرقانی نے موطا کی شرح میں علامہ ابن عبدالبر کی اس بات کا بھرپور رد کیا ہے۔

❀ امام زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَقَوْلُهُ: إِنَّ مَالِكًا انْفَرَدَ بِهِ، لَيْسَ كَمَا قَالَ، فَقَدْ رَوَاهُ سَعِيدُ ابْنُ مَنْصُورٍ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ فَقَالَ: إِحْدَى عَشْرَةَ، كَمَا قَالَ مَالِكٌ“ [1]

’’ابن عبدالبر کا یہ کہنا کہ صرف امام مالک نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے گیارہ کی تعداد نقل کی ہے، درست نہیں، کیوں کہ سعید بن منصور نے ایک دوسرے طریق (عبدالعزیز بن محمد بن عبید الدراوردی) سے محمد بن یوسف سے نقل کیا اور اس راوی نے بھی امام مالک کی طرح گیارہ کی تعداد نقل کی ہے۔‘‘

❀ علامہ سبکی (المتوفی: ۷۵٦ھ) بھی حافظ ابن عبدالبر پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] شرح الزرقاني على الموطأ (١/٤١٩)

”وَكَأَنَّهُ لَمْ يَقِفْ عَلَى مُصَنَّفِ سَعِيْدِ بْنِ مَنْصُوْرٍ فِيْ ذَٰلِكَ فَإِنَّهُ رَوَاهَا كَمَا رَوَاهَا مالك عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ محمد بن يوسف شَيْخِ مالك“[1]

”لگتا ہے کہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ سعید بن منصور رحمہ اللہ کی کتاب سے واقف ہی نہیں ہوئے، کیوں کہ اس کتاب میں بھی امام مالک ہی کی روایت کے مطابق، امام مالک کے شیخ محمد بن یوسف سے عبدالعزیز بن محمد نے روایت کیا ہے۔“

❁ بلکہ نیموی حنفی بھی فرماتے ہیں:

”مَا قاله ابن عَبْدِ الْبَرِّ مِنْ وَهَمِ مَالِكٍ فَغَلَطٌ جِدًّا، لِأَنَّ مَالِكًا قَدْ تَابَعَهُ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ مُحَمَّدٍ عِنْدَ سَعِيْدِ بْنِ مَنْصُوْرٍ فِيْ سُنَنِهِ، وَيَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ الْقَطَّانُ عِنْدَ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ أَبِيْ شَيْبَةَ فِيْ مُصَنَّفِهِ، كِلَاهُمَا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوْسُفَ، وَقَالَا: إِحْدَى عَشْرَةَ، كَمَا رَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوْسُفَ، وَأَخْرَجَ مُحَمَّدُ بْنُ نَصْرٍ الْمَرْوَزِيُّ فِيْ قِيَامِ اللَّيْلِ مِنْ طَرِيْقِ مُحَمَّدِ ابْنِ إِسْحَاقَ حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ عَنْ جَدِّهِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّيْ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ فِيْ رَمَضَانَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، انتهى. هٰذَا قَرِيْبٌ مِمَّا رَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ يُوْسُفَ، أَيْ مَعَ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ“[2]

---

[1] الحاوي للفتاوى (١/٤١٧)

[2] آثار السنن (٢/٥٢) وانظر: تحفة الأحوذي (٣/٤٤٣)

''ابن عبدالبر نے امام مالک رحمہ اللہ کے وہم سے متعلق جو بات کہی ہے وہ بالکل غلط ہے، کیوں کہ امام مالک رحمہ اللہ کی متابعت عبدالعزیز بن محمد نے کی ہے جیسا کہ سنن سعید بن منصور میں ہے اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ نے بھی امام مالک کی متابعت کی ہے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، چنانچہ عبدالعزیز بن محمد اور یحییٰ بن سعید القطان، ان دونوں اماموں نے (امام مالک ہی کے شیخ) محمد بن یوسف سے یہی روایت نقل کی ہے اور ان دونوں نے بھی اسی طرح گیارہ رکعات نقل کیا ہے، جس طرح امام مالک رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، نیز امام مروزی رحمہ اللہ نے بھی قیام اللیل میں محمد بن اسحاق کے طریق سے روایت کی تو انھوں نے کہا: مجھ سے محمد بن یوسف نے بیان کیا، انھوں نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انھوں نے کہا: ہم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ یہ روایت بھی تقریباً امام مالک کی محمد بن یوسف سے نقل کردہ روایت ہی کی طرح ہے، بایں طور کہ اس روایت میں عشا کے بعد کی دو سنت رکعات بھی شمار کر لی گئی ہیں۔''

عرض ہے اس کے علاوہ بھی اور کئی رواۃ نے محمد بن یوسف سے اسی روایت کو گیارہ کی تعداد کے ساتھ نقل کیا اور ان سب کی کل تعداد چھے ہے۔

امام مالک کی متابعات:

امام مالک رحمہ اللہ سے گیارہ کی تعداد نقل کرنے میں قطعاً کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی زبردست اور قطعی دلیل یہ ہے کہ امام مالک کے استاذ محمد بن یوسف ہی سے چھے اور راویوں نے بھی یہی روایت نقل کی ہے اور ان سب نے بھی وہی تعداد

نقل کی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے نقل کی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

- اسماعیل بن امیۃ بن عمرو القرشی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۴۴ھ)
- اسامہ بن زید اللیثی المدنی ابو زید رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۵۳ھ)
- اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر الانصاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۸۰ھ)
- عبدالعزیز بن محمد بن عبید الدراوردی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۸۶ھ)
- امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۹۸ھ)
- امام المغازی محمد بن اسحاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۵۰ھ)

ان چھے متابعات میں سے شروع کی پانچ متابعات میں صراحتاً گیارہ کی تعداد کا ذکر ہے، جب کہ چھٹی متابعت میں معنوی طور پر یہ تعداد مذکور ہے۔

ذیل میں ان سب کی روایات ملاحظہ ہوں۔

پہلی متابعت از اسماعیل بن امیۃ بن عمرو بن سعید القرشی:

امام ابو بکر النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

”حدّثنا يوسف بن سعيد، ثنا حجاج، عن ابن جريج، حدثني إسماعيل بن أمية، أنّ محمد بن يوسف ابن أخت السّائب بن يزيد أخبره، أنّ السّائب بن يزيد أخبره قال: جمع عمر بن الخطاب الناس على أبي بن كعب وتميم الداري، فكانا يقومان بمائة في ركعة، فما ننصرف حتى نرى أو نشك في فروع الفجر. قال: فكنا نقوم بأحد عشر“[1]

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق۱۳۵/ب) وإسناده صحيح، ورجاله كلهم من رجال الصحيحين خلا يوسف بن سعد فمن رجال النسائي وهو ثقة، و ابن جريج مدلس لكنه صرح بالتحديث في هذا السند.

”اسماعیل بن امیہ رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اُبی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، تو یہ دونوں ایک رکعت میں سو آیات پڑھاتے تھے، پھر جب ہم نماز سے فارغ ہوتے تو ہم کو لگتا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم گیارہ رکعات پڑھتے تھے۔“

نوٹ: اس روایت کے آخر میں اسماعیل بن امیہ کا اپنے استاذ سے سوال و جواب بھی مذکور ہے جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

دوسری متابعت از اسامہ بن زید اللیثی:

امام ابو بکر النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

”حدثنا الربيع بن سليمان، ثنا ابن وهب، حدثني أسامة ابن زيد، عن محمد بن يوسف، عن السائب بن يزيد، قال: جمع عمر بن الخطاب الناس في قيام رمضان على أبي ابن كعب وتميم الداري، كانا يقومان أحد عشرة ركعة“[1]

”اسامہ بن زید اللیثی المدنی رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رمضان میں لوگوں کو ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، تو یہ دونوں گیارہ رکعات پڑھاتے تھے۔“

[1] فوائد أبي بكر عبد الله بن محمد بن زياد النيسابوري (ق١٣٥/ب) وإسناده صحيح رجاله ثقات كلهم مترجمون في التهذيب.

تیسری متابعت از اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر الانصاری:

علی بن حجر بن ایاس السعدی (المتوفی: ۲۴۴ھ) فرماتے ہیں:

”ثنا إِسْمَاعِيلُ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيدَ الْكِنْدِيُّ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّهُمْ كَانُوا يَقُومُونَ فِي زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِإِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً يَقْرَءُونَ فِي الرَّكْعَةِ بِالْمِائَتَيْنِ حَتَّى إِنَّهُمْ لَيَعْتَمِدُونَ بِالْعِصِيِّ“[1]

”اسماعیل بن امیہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں گیارہ رکعات تراویح پڑھتے تھے اور ایک ایک رکعت میں سو سو آیات پڑھتے تھے یہاں تک کہ طویل قیام کی وجہ سے لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔“

چوتھی متابعت از عبدالعزیز بن محمد بن عبید الدراوردی:

امام سعید بن منصور رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۲۷ھ) فرماتے ہیں:

”حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ مُحَمَّدٍ، حَدَّثَنِي محمد بن يوسف: سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ يَقُولُ:كُنَّا نَقُومُ فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِإِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، نَقْرَأُ فِيهَا بِالْمِئِينَ، وَنَعْتَمِدُ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ، وَنَنْقَلِبُ عِنْدَ بُزُوغِ الْفَجْرِ“[2]

---

[1] أحاديث إسماعيل بن جعفر (٤٤٠) وإسناده صحيح على شرط الشيخين، وأخرجه المستغفري في فضائل القرآن (٤٠٦/١) من طريق إسماعيل بن جعفر به.

[2] الحاوي للفتاوي (٤١٦/١) وانظر: المصابيح في صلاة التراويح للسيوطي (ص: ٣٨) وإسناده صحيح.

''عبدالعزیز بن محمد الدراوردی رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ہم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں گیارہ رکعات تراویح پڑھتے تھے، ہم سو سو آیات پڑھتے تھے، لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے اور طلوعِ فجر کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔''

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے اس روایت کو حد درجہ صحیح قرار دیتے ہوئے کہا:

''وَفِيْ مُصَنَّفِ سَعِيْدِ بْنِ مَنْصُوْرٍ بِسَنَدٍ فِيْ غَايَةِ الصِّحَّةِ''[1]

''یعنی سعید بن منصور کی کتاب میں حد درجہ صحیح سند کے ساتھ یہ روایت مروی ہے۔''

تنبیہ: بعض حضرات سے چوک ہوئی ہے اور انھوں نے امام سبکی کی اس تصحیح کو امام سیوطی کی تصحیح سمجھ لیا، مثلاً حافظ زبیر علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''جلال الدین سیوطی (متوفی: ۹۱۱ھ) اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وفي مصنف سعيد بن منصور بسند في غاية الصحة'' ''اور یہ (گیارہ رکعات والی روایت) مصنف سعید بن منصور میں بہت صحیح سند کے ساتھ ہے۔''[2]

عرض ہے کہ یہ تصحیح امام سیوطی رحمہ اللہ کی نہیں، بلکہ امام سبکی کی ہے جسے امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔

---

[1] نقله السيوطي في الحاوي للفتاوى (١/٤١٧)

[2] المصابيح في صلاة التراويح (ص: ١٥)، قیامِ رمضان (ص: ۲۵) ایضاً (ص: ۳۵) ایضاً (ص: ۴۹) ایضاً (ص: ۷۹)

پانچویں متابعت از امام یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ:

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، أَنَّ السَّائِبَ أَخْبَرَهُ أَنَّ عُمَرَ جَمَعَ النَّاسَ عَلَى أُبَيٍّ وَتَمِيمٍ فَكَانَا يُصَلِّيَانِ إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يَقْرَآنِ بِالْمِئِينَ، يَعْنِي فِي رَمَضَانَ"[1]

"امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رمضان میں لوگوں کو ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، تو یہ دونوں گیارہ رکعات پڑھاتے تھے اور ہر رکعت میں سو سو آیات پڑھاتے تھے۔"

چھٹی متابعت از امام ابن اسحاق رحمہ اللہ:

امام ابو بکر النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا أبو الأزهر، ثنا يعقوب بن إبراهيم، حدثني أبي، عن ابن إسحاق، قال: حدثني محمد بن يوسف بن عبد الله ابن أخت السائب، عن السائب، قال: كُنَّا نُصَلِّي فِي زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي رَمَضَانَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً وما كُنَّا نَخْرُجُ إِلَّا فِي وِجَاهِ الصُّبْحِ، كَانَ الْقَارِئُ يَقْرَأُ فِي كل رَكْعَةٍ

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (۲/۳۹۱) وإسناده صحيح، وأخرجه أيضاً عمر بن شبة في تاريخ المدينة (۲/۷۱۳) من طريق يحيى به.

خَمْسِيْنَ آيَةً، سِتِّيْنَ آيَةً"[1]

''امام محمد بن اسحاق نے محمد بن یوسف سے نقل کیا، وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ہم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں رمضان میں تیرہ رکعات پڑھتے تھے اور ہم صبح کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔ قاری ایک رکعت میں پچاس سے ساٹھ آیات کی تلاوت کرتا تھا۔''

تطبیق:

ابن اسحاق کی اس روایت میں بھی معنوی طور پر امام مالک کی متابعت کی گئی ہے، کیوں کہ اس میں جو تیرہ رکعات کا ذکر ہے، وہ امام مالک کی روایت میں مذکور گیارہ رکعات کے مخالف نہیں ہے، کیوں کہ دونوں میں تطبیق ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ابن اسحاق کی روایت میں عشا کے بعد کی دو سنت رکعات بھی شمار کر لی گئی ہیں۔

تطبیق مذکور کی مثال:

اس تطبیق کی مثال اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاۃ اللیل سے متعلق صحیحین میں مروی مختلف روایات بھی ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معروف ومشہور روایت میں یہ تعداد گیارہ رکعات بتلائی گئی ہے۔[2] جب کہ صحابی رسول زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ نے یہ تعداد تیرہ رکعات بتلاتے ہوئے کہا ہے:

"فَذٰلِكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً"[3] ''تو یہ تیرہ رکعتیں ہوگئیں۔''

---

[1] فوائد أبي بكر عبد الله بن محمد بن زياد النيسابوري (ق١٣٦/أ) واسناده حسن

[2] بخاري كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان (٢٠١٣)

[3] صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه، رقم (٧٦٥)

بخاری و مسلم کی یہ دونوں روایات باہم مضطرب یا ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ نے عشا کے بعد کی دو رکعات بھی شمار کر لی ہیں، جیسا کہ ان کی روایت کے سیاق سے صاف ظاہر ہے اور حدیثِ عائشہ کے تحت اس پر پوری تفصیل گزر چکی ہے۔

ہم کہتے ہیں یہی صورتِ تطبیق امام مالک کی روایت اور ابن اسحاق کی روایت کے مابین بھی اختیار کی جائے گی۔

گھر کی مثال:

لطف تو یہ ہے کہ اختلاف کی یہی صورتِ حال احناف کی ان ضعیف و مردود مستدل روایات میں بھی ہے جنھیں وہ بیس رکعات کی دلیل میں پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان روایات میں سے:

- کسی میں بیس رکعات کا ذکر ہے۔[1]
- تو کسی میں اکیس رکعات کا ذکر ہے۔[2]
- تو کسی میں تیئس رکعات کا ذکر ہے۔[3]

لیکن احناف کو یہاں اضطراب نظر نہیں آتا، بلکہ وہ بڑے مزے سے ان کے مابین تطبیق دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اضطراب کا نام تک نہیں لیتے۔

عرض ہے کہ اگر بیس، اکیس، تیئس میں تطبیق ممکن ہے تو گیارہ اور تیرہ میں تطبیق کیوں کر ناممکن ہے؟!

بلکہ ایک موضوع روایت میں ستائیس رکعات کا ذکر آیا تو احناف نے اس میں

---

[1] كتاب الصيام للفريابي (ص: ١٨٥)

[2] مصنف عبد الرزاق (٤/٢٦٠، رقم: ٧٧٣٠)

[3] مصنف عبد الرزاق (٤/٢٦١، رقم: ٧٧٣٣

ابتدائی چار رکعات کے بارے میں کہا کہ یہ عشا کی چار فرض رکعات تھیں، كما سيأتي

الغرض امام مالک کی روایت اور امام ابن اسحاق کی روایت میں بایں طور تطبیق ممکن ہے کہ امام مالک کی روایات میں خالص رکعاتِ تراویح کا بیان ہے، جب کہ امام ابن اسحاق کی روایت میں رکعاتِ تراویح کے ساتھ عشا کے بعد کی دو رکعت سنت بھی شمار کر لی گئی ہیں۔

گھر کی شہادت:

چنانچہ دیوبندیوں کے علامہ نیموی حنفی نے بھی امام مالک کی روایت میں اور امام ابن اسحاق کی روایات میں یہی تطبیق دی ہے، اور پھر یہ تطبیق دینے کے بعد امام ابن اسحاق کی اس روایت کو امام مالک کی روایت کی متابعات کے ضمن میں پیش کیا ہے، ملاحظہ ہوں موصوف نیموی حنفی کے الفاظ:

"لِأَنَّ مَالِكًا قَدْ تَابَعَهُ عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ مُحَمَّدٍ عِنْدَ سَعِيدِ بْنِ مَنْصُورٍ فِي سُنَنِهِ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ عِنْدَ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ فِي مُصَنَّفِهِ كِلَاهُمَا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ وَقَالَا إِحْدَى عَشْرَةَ كَمَا رَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، وَأَخْرَجَ مُحَمَّدُ بْنُ نَصْرٍ الْمَرْوَزِيُّ فِي قِيَامِ اللَّيْلِ مِنْ طَرِيقِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ عَنْ جَدِّهِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي فِي زَمَنِ عُمَرَ رضي الله عنه فِي رَمَضَانَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، انتهى. هَذَا قَرِيبٌ مِمَّا رَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، أَيْ مَعَ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ"[1]

---

[1] آثار السنن (٥٢/٢) وانظر: تحفة الأحوذي (٤٤٣/٣)

”کیوں کہ امام مالک رحمہ اللہ کی متابعت عبدالعزیز بن محمد نے کی ہے جیسا کہ سنن سعید بن منصور میں ہے اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ نے بھی امام مالک کی متابعت کی ہے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، چنانچہ عبدالعزیز بن محمد اور یحییٰ بن سعیدالقطان، ان دونوں اماموں نے (امام مالک ہی کے شیخ) محمد بن یوسف سے یہی روایت نقل کی ہے اور ان دونوں نے بھی اسی طرح گیارہ رکعات نقل کیا، جس طرح امام مالک رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، نیز امام مروزی رحمہ اللہ نے بھی قیام اللیل میں محمد بن اسحاق کے طریق سے روایت کی تو انھوں نے کہا: مجھ سے محمد بن یوسف نے بیان کیا، انھوں نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انھوں نے کہا: ہم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ یہ روایت بھی تقریباً امام مالک کی محمد بن یوسف سے نقل کردہ روایت ہی کی طرح ہے، بایں طور کہ اس روایت میں عشا کے بعد کی دو سنت رکعات بھی شمار کر لی گئی ہیں۔“

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ اشکال آئے کہ ابن اسحاق نے باجماعت نماز تراویح کی تعداد روایت کی ہے اور عشا کی سنت باجماعت نہیں پڑھی جاتی تو ابن اسحاق اس میں سنتِ عشا کو کیسے شامل کر سکتے ہیں؟ تو عرض ہے کہ ابن اسحاق نے شروع میں جس اسلوب سے یہ رکعات بیان کی ہیں ان میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کی صراحت نہیں ہے، بلکہ انھوں نے اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے، لہٰذا ان کی روایت میں سنتِ عشا بغیر جماعت اور نمازِ تراویح باجماعت دونوں شامل ہے۔

اور اگر ابن اسحاق کی روایت اور امام مالک کی روایت میں تطبیق نہ دی جائے

اور یہ مانا جائے کہ ابن اسحاق کی روایت امام مالک کی روایت سے مختلف ہے تو دریں صورت ابن اسحاق کی روایت شاذ قرار پائے گی، کیوں کہ ابن اسحاق ثقہ ہیں اور بعض نے ان کے حفظ پر کلام بھی کیا ہے، جب کہ امام مالک رحمہ اللہ اوثق اور احفظ ہیں اور اوثق کے خلاف ثقہ کی روایت شاذ قرار پاتی ہے۔

مزید برآں امام مالک رحمہ اللہ کی متابعت بھی چار رواۃ نے کی ہے جن میں یحییٰ بن سعید القطان جیسے زبردست محدث بھی ہیں۔ ایسی صورت میں لازمی طور پر امام مالک کی روایت راجح ہوگی اور ابن اسحاق کی روایت شاذ و ناقابلِ التفات ہوگی۔ لیکن ہماری نظر میں تطبیق کی صورت ہی بہتر ہے، کیوں کہ اس کی نظیر ہمیں صحیحین کی روایت میں بھی ملتی ہے۔

فائدہ: حافظ زبیر علی زئی صاحب فرماتے ہیں:

''یہ روایت باسند متصل نہیں ملی، لہٰذا مردود ہے۔''[1]

عرض ہے کہ اس روایت کی متصل سند فوائد ابی بکر عبد اللہ بن محمد بن زیاد النیسابوری میں موجود ہے جسے اوپر نقل کیا گیا ہے اور یہ سند حسن ہے، لہٰذا مقبول ہے۔

پھر ہمارے نزدیک یہ روایت، امام مالک کی روایت کے مخالف نہیں، بلکہ معنوی طور پر اس کی موید ہے، لیکن اگر کوئی ابن اسحاق کی روایت کو امام مالک کی روایت کے خلاف سمجھے تو اسے لازمی طور پر ابن اسحاق کی روایت کو شاذ تسلیم کرنا چاہیے، کیوں کہ ابن اسحاق حفظ و اتقان میں امام مالک سے کمتر ہیں اور اپنی روایت میں منفرد بھی ہیں، جب کہ امام مالک ان کی بہ نسبت اوثق و احفظ ہیں اور اپنی روایت میں منفرد بھی نہیں بلکہ یحییٰ بن سعید جیسے جلیل القدر محدث سمیت پانچ رواۃ نے ان کی

---

[1] قیامِ رمضان (ص:۳٦)

متابعت کی ہے۔ کما مضیٰ، وللّٰہ الحمد.

نوٹ: بعض حضرات ابن ابی شیبہ وغیرہ سے منقطع وضعیف شواہد بھی پیش کرتے ہیں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ تمام شواہد منقطع ہونے کے ساتھ ساتھ موطا کی اس ثابت شدہ روایت کے خلاف ہیں، لہٰذا منکر ہیں اور منکر روایت ہمیشہ منکر ہی ہوتی ہے وہ شواہد کے لائق نہیں ہوتی۔

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ موطا امام مالک کی روایت اعلیٰ درجے کی صحیح و حجت ہے۔

متابعات پر ایک اعتراض اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے مذکورہ بالا متابعات کو رد کرنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ ان متابعات میں گیارہ رکعت کے الفاظ تو ہیں، لیکن یہ بیان نہیں ہے کہ ان کا حکم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، فرماتے ہیں:

''ان میں سے ایک بھی بحکم فاروقی گیارہ رکعت پڑھنے کی روایت نہیں کرتا، بلکہ سب کے سب صرف گیارہ رکعت نقل کرتے ہیں، پس بحکم فاروقی گیارہ رکعت کی روایت میں امام مالک منفرد اور تنہا رہ جاتے ہیں، اور ان کا کوئی متابع نہیں ہے، بنا بریں علامہ ابن عبدالبر کا خیال اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ امام مالک کے علاوہ کسی نے یہ گیارہ رکعتوں کا بحکم فاروقی پڑھنا روایت نہیں کیا ہے۔''[1]

ہم کہتے ہیں:

أولاً: اس اقتباس کی آخری سطور پر توجہ دیں کہ مولانا گیاوی صاحب نے اپنے شگوفے

---

[1] أحسن التنقیح (ص: ٣٤٥)

کو علامہ ابن عبدالبر کی طرف بھی منسوب کر دیا ہے، حالانکہ علامہ ابن عبدالبر نے اپنے نقد میں ''حکم فاروقی کی صراحت'' کو بنیاد ہرگز نہیں بنایا ہے، بلکہ الفاظ ''گیارہ رکعت'' کو بنیاد بنایا ہے، نیز انھوں نے اپنے نقد کو مدلل کرنے کے لیے امام مالک کی روایت کے خلاف جو بیس رکعات والی روایات پیش کی ہیں، ان میں اس بات کا التزام نہیں کیا ہے کہ وہی روایات پیش کریں جن میں ''حکم فاروقی کی صراحت'' ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ امام ابن عبدالبر کے نقد کی تلخیص پیش کر دی جائے۔

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے سب سے پہلے یہ کہا:

''ولا أعلم أحدا قال في هذا الحديث إحدى عشرة ركعة غير مالك، والله أعلم''

''مجھے نہیں معلوم کہ اس حدیث میں کسی ایک نے بھی ''گیارہ رکعت'' کہا ہے سوائے مالک کے۔ واللہ اعلم''[1]

ملاحظہ فرمائیں! امام مالک کے سوا کسی سے سرے سے ''گیارہ رکعت'' کے الفاظ ہی کو معدوم بتا رہے ہیں، نہ کہ ان الفاظ کے ساتھ ''حکمِ فاروقی کی صراحت'' کو، لیکن مولانا گیاوی صاحب کا کمال دیکھیں کہ کس طرح سے بات کو گھما دیا اور نقد کو ''گیارہ رکعت'' کے الفاظ سے ہٹا کر ''حکمِ فاروقی کی صراحت'' کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہ تحریفی کارروائی نہ صرف یہ کہ علمی بددیانتی ہے، بلکہ امام ابن عبدالبر کی تنقیص بھی ہے، کیوں کہ نقد میں ایسی حرف پرستی اور بے تکی باتوں کا مظاہرہ نہ ان کی کتابوں میں ملتا ہے اور نہ ان کے شایانِ شان ہے۔

اب آگے بڑھیے! امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کے بعد امام مالک کی روایت کے خلاف جو دیگر روایات ذکر کی ہیں وہ یہ ہیں:

---

[1] الاستذكار لابن عبد البر (٢/٦٨)

① داؤد بن قیس والی روایت، (جو ضعیف ہے اور پیچھے گزر چکی ہے)

② یحییٰ بن سعید کی روایت (جو منقطع ہے اور آگے آرہی ہے)

③ حارث بن عبد الرحمٰن کی روایت (جو موضوع اور من گھڑت ہے اور پیچھے گزر چکی ہے)

④ یزید بن رومان کی روایت (جو منقطع ہے اور آگے آرہی ہے)

اس کے بعد کہا:

"وهذا كله يشهد بأن الرواية بإحدى عشرة ركعة وهم وغلط"[1]

''یہ ساری روایات بتلاتی ہیں کہ گیارہ رکعت والی روایت وہم اور غلط ہے۔''

ان چاروں روایات کے الفاظ ہم اس کتاب میں نقل کر چکے ہیں۔ اگر مولانا طاہر گیاوی صاحب کی فلسفہ سنجی کو بروئے کار لا کر ان کے الفاظ پر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی روایت بھی امام مالک کی روایت کے مخالف نہ ہو گی، کیوں کہ پہلی، تیسری اور چوتھی روایات مولانا گیاوی صاحب کے معیار پر حکمِ فاروقی بیان نہیں کرتیں۔ دوسری روایت میں حکمِ فاروقی ضرور ہے، لیکن یہ حکم ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے لیے نہیں بلکہ ''رَجُلًا'' کے لفظ سے نا معلوم شخص کے لیے ہے۔

اب غور کریں کہ امام ابن عبدالبر کے پیشِ نظر بھی اگر گیاوی صاحب جیسی شگوفہ سنجی ہی تھی تو انھوں نے ان غیر متعلق روایات کو امام مالک کی روایت کے خلاف کیسے پیش کر دیا؟

صاف واضح ہے کہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے علم میں سرے سے گیارہ رکعت

---

[1] الاستذكار لابن عبد البر (٦٩/٢)

والی کوئی روایت ہے ہی نہیں ہے، اور اگر ان کی نگاہ ان روایات پر پڑ جاتی جن میں اسی طریق سے گیارہ رکعت منقول ہے تو وہ ہرگز امام مالک کی تغلیط نہ کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی اس طریق میں گیارہ رکعت کے الفاظ دیکھے، اس نے فوراً امام مالک کا دفاع کیا، حتی کہ خود نیموی حنفی بھی گیارہ رکعت والی روایات دیکھ کر امام مالک کی تائید کیے بغیر نہیں رہ سکے اور انھوں نے بھی امام ابن عبدالبر کی اس چوک پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا، جیسا کے حوالے گزر چکے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ مولانا طاہر گیاوی صاحب نے متابعات پر یہ اعتراض اس غرض سے کیا کہ امام ابن عبدالبر کے نقد کو مبنی بر صواب قرار دیں، لیکن درحقیقت ان کے اس اعتراض نے امام ابن عبدالبر کے نقد کے بھی پرخچے اڑا دیے ہیں، کیوں کہ متن کا یہ اختلاف ان روایات میں بھی ہے جن کو بنیاد بنا کر حافظ ابن عبدالبر نے نقد کیا تھا۔

ثانیاً: قابلِ غور بات یہ ہے کہ ساری متابعات ایک ہی طریق: ''عن محمد بن یوسف، عن السائب بن یزید'' سے ہیں، اور بنیادی مضمون بھی ایک ہی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کا مخرج ایک ہی ہے، لہٰذا جب ساری متابعات متحد المخرج ہیں تو سب کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہو گا اور الفاظ کے اختلاف کو اختصار و تفصیل اور روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے گا۔

ثالثاً: مولانا طاہر گیاوی صاحب کا یہ فرمانا بھی درست نہیں ہے کہ امام مالک کی متابعات میں حکمِ فاروقی کا بیان نہیں، کیوں کہ کئی متابعات میں یہ الفاظ ہیں: ''جمع عمر بن الخطاب....'' یعنی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا۔ اس کے بعد گیارہ رکعت کا ذکر ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نے جس طرح جماعت پر جمع کیا تھا، اسی طرح گیارہ رکعات پر بھی جمع کیا تھا، اس سے انکار سوائے حرف پرستی اور معنوی تحریف کے کچھ نہیں۔

رابعاً: یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ الفاظ کا جو ظاہری اختلاف ہے وہ عددِ رکعات کے علاوہ دیگر حصوں سے متعلق ہے، لیکن عددِ رکعات یعنی ''گیارہ رکعات'' کے الفاظ پر ساری متابعات میں اتفاق ہے، اس لیے اختلاف کا کوئی اثر بھی ہو گا تو وہ دیگر حصوں سے متعلق ہو گا، لیکن عددِ رکعات پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔

خامساً: سب سے اہم بات تو یہ کہ امام مالک کی روایت کی تصحیح کے لیے ان متابعات کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیوں کہ امام مالک کی روایت کے خلاف جو بھی روایات ہیں ان میں سے ایک بھی روایت صحیح و ثابت ہی نہیں ہے۔

سادساً: بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ متابعات والی روایات الگ روایات ہیں تب تو صحابہ سے گیارہ رکعات تراویح کے ثبوت میں روایات کی قطار لگ جائے گی، کیوں کہ ہر روایت سے صحابہ کی الگ الگ جماعت سے ثابت ہو گا کہ وہ گیارہ رکعات ہی پڑھتے تھے اور امام مالک کی روایت بھی محفوظ و صحیح برقرار رہے گی، کیوں کہ اس کے خلاف ایک روایت بھی ثابت نہیں ہے۔

کیا امام مالک نے بھی بیس رکعات کی تعداد روایت کی ہے؟

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے متابعات کو رد کرنے کے لیے جس لفاظی کا سہارا لیا تھا، اس کی احسن طریقے سے تنقیح کر دی گئی ہے، اسی ضمن میں موصوف نے اس سے بھی زیادہ عجوبہ نگاری یہ کی ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ایک وہم کو بھی اپنے حق میں بطورِ دلیل استعمال کر لیا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سبقت قلمی یا وہم سے یہ لکھ دیا تھا:

''وروى مالك من طريق يزيد بن خصيفة عن السائب بن

يزيد عشرين ركعة، وهذا محمول على غير الوتر"[1]

''امام مالک نے یزید بن خصیفہ عن السائب بن یزید کے طریق سے بیس رکعت روایت کیا ہے اور یہ وتر کے علاوہ پر محمول ہے۔''

امام شوکانی نے بھی فتح الباری کی اسی روایت سے دھوکا کھا کر اسی روایت کو امام مالک کی طرف منسوب کر دیا۔ ان دونوں اہلِ علم کی اس چوک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا طاہر گیاوی صاحب نے یہ دعویٰ کر دیا کہ یزید بن خصیفہ کی بیس رکعات والی روایت امام مالک نے بھی روایت کی ہے۔[2] حالانکہ یہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا وہم ہے، کیوں کہ یزید بن خصیفہ والی روایت نہ موطا مالک میں ہے اور نہ امام مالک ہی کے طریق سے کسی اور کتاب میں اس کا کوئی نام ونشان ہے، اسی لیے علامہ البانی رحمہ اللہ نے کہا:

"وعزاه الحافظ في الفتح لمالك فوهم"[3]

''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں وہم کا شکار ہو کر اسے امام مالک کی طرف منسوب کر دیا۔''

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الہدایہ کی تخریج میں جہاں تعدادِ رکعات والی روایات پر بحث کی ہے، وہاں ابن خصیفہ کی بیس رکعات والی اس روایت کو صرف امام بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے اور امام مالک کی طرف صرف یزید بن رومان والی منقطع روایت منسوب کی ہے۔[4]

واضح رہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو فتح الباری میں متعدد روایات کے انتساب

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٢٥٤/٤)

[2] أحسن التنقيح (ص: ٣٥١-٣٥٤)

[3] صلاة التراويح (ص: ٤٩)

[4] الدراية في تخريج أحاديث الهداية (٢٠٣/١)

میں وہم ہوا ہے، بلکہ خود صحیح بخاری ہی کی روایت کی طرف احالہ کرنے میں ان سے سہو ہوا ہے، چنانچہ صلاۃ اللیل ہی کی رکعات پر بحث کے دوران میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"وأما ما رواه الزهري عن عروة عنها كما سيأتي في باب ما يقرأ في ركعتي الفجر بلفظ، كان يصلي بالليل ثلاث عشرة ركعة ثم يصلي إذا سمع النداء بالصبح ركعتين خفيفتين" [1]

''رہی وہ روایت جسے زہری نے عروہ کے واسطے سے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، جیسا کہ "باب ما یقرأ في ركعتي الفجر" کے تحت یہ روایت آ رہی ہے، اس کے الفاظ ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ رکعات پڑھتے تھے، پھر جب فجر کی اذان سنتے تھے تو دو ہلکی رکعات پڑھتے۔''

حالانکہ صحیح بخاری میں مذکورہ باب میں یہ روایت ''زہری'' نے نہیں، بلکہ "ھشام بن عروہ" نے عروہ کے واسطے سے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے۔ [2]

امام زہری نے عروہ کے واسطے سے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں شروع میں تیرہ نہیں، بلکہ گیارہ رکعات پڑھنے کی بات ہے اور اس کے بعد فجر کی دو رکعت سنت پڑھنے کی بات ہے، ان روایات کے مابین تطبیق پر بحث حدیثِ عائشہ کے ضمن میں ہو چکی ہے۔

یہاں مقصود یہ دکھلانا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وہم کے سبب جب خود صحیح بخاری

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (٢١/٣)

[2] دیکھیں: صحیح البخاری :كتاب التهجد، باب ما يقرأ في ركعتي الفجر (١١٧٠)

میں موجود ہشام کی روایت کو زہری کی طرف منسوب کر سکتے ہیں تو اگر بیہقی کی روایت کو مالک کی طرف منسوب کر دیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ انصاف پسند آدمی کو اوہام پرستی کے بجائے حقیقتوں پر ایمان لانا چاہیے۔

کیا اس روایت کے رواۃ کا عمل اس کے خلاف ہے؟

بعض لوگ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اس روایت کے جو راوی ہیں، سب کا عمل اس کے خلاف ہے۔

عرض ہے:

أولاً: اس روایت کے کسی ایک بھی راوی کا عمل اس کے خلاف نہیں ہے، اس سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔

ثانیاً: بالفرض کسی راوی کا عمل اس کے خلاف بھی ثابت ہو تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس راوی نے نفل سمجھ کر اپنی طرف سے کچھ رکعات زیادہ پڑھی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس نے گیارہ رکعات کی روایت بیان ہی نہیں کی۔ [1]

اس پوری بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ موطا امام مالک کی روایت بالکل صحیح ہے، بلکہ صحیحین کی شرط پر صحیح ہے اور اس پر کسی بھی طرح کے اعتراض کی کوئی گنجایش نہیں۔



[1] دیکھیں: انوار البدر (ص: ۳۹۵۔۳۹۷)

کیا محمد بن یوسف نے اپنی بیان کردہ تعداد ''گیارہ رکعات'' سے رجوع کر لیا تھا؟

محمد بن یوسف کی ایک روایت میں لفظی ومعنوی تحریف کی ناکام کوشش:

گذشتہ بحث میں محمد بن یوسف کی یہ روایت بھی گزری ہے کہ جب انھوں نے اپنے حلقۂ درس میں اپنے استاذ ابن السائب کی سند سے گیارہ رکعت کی روایت بیان کی تو ان کے ایک شاگرد نے دریافت کیا کہ ''یا اکیس؟'' جس پر محمد بن یوسف نے اکیس رکعات کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ اس طرح تو ابن خصیفہ نے سنا ہے۔ کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟ یعنی محمد بن یوسف فرماتے ہیں کہ جب میں نے کسی بھی درس میں اور کبھی اکیس کی تعداد بیان ہی نہیں کی تو مجھ سے یہ پوچھنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

ملاحظہ کریں! یہ روایت واضح ہے کہ محمد بن یوسف نے شاگرد کے استفسار پر اکیس کی تعداد کی سختی سے تردید وتغلیط کی اور اس کے لیے ابن خصیفہ کو ذمے دار ٹھہرایا کہ یہ ان ہی کے پردۂ سماعت کی کوتاہی ہے۔ چنانچہ جب محمد بن یوسف کا درس ختم ہوا تو ان کے مذکورہ شاگرد ابن خصیفہ کے پاس گئے اور ان سے اس تعداد کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو وہ تردد کا شکار ہو گئے اور کہنے لگے: مجھے لگتا ہے کہ ہمارے استاذ ابن السائب نے اکیس کہا تھا۔

یعنی جس اعتماد اور وثوق کے ساتھ محمد بن یوسف گیارہ کی تعداد ہی بیان کرتے تھے، ابن خصیفہ اپنے بیان میں اس اعتماد اور وثوق کا اظہار نہیں کر سکے اور اپنے حفظ میں تردد کا اظہار کیا، اس صورتِ حال کو دیکھنے کے بعد ایک معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی محمد بن یوسف ہی کے بیان کو ترجیح دے گا جو نہ صرف یہ کہ شک و تردد سے بالاتر ہے، بلکہ اپنے ساتھ مکمل اعتماد اور وثوق لیے ہوئے ہے۔

اس روایت پر مزید بحث کرنے سے پہلے ایک بار پھر سے اس کو سند و متن کے ساتھ اچھی طرح دیکھ لیں۔

پوری روایت مع سند و متن :

امام ابوبکر النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

”حدّثنا يوسف بن سعيد، ثنا حجاج، عن ابن جريج، حدثني إسماعيل بن أمية، أنّ محمد بن يوسف ابن أخت السّائب بن يزيد أخبره، أنّ السّائب بن يزيد أخبره قال: جمع عمر بن الخطاب الناس على أبي بن كعب وتميم الداري، فكانا يقومان بمائة في ركعة، فما ننصرف حتى نرى أو نشك في فروع الفجر. قال: فكنا نقوم بأحد عشر، قلت: أو واحد وعشرين؟! قال: لقد سمع ذلك من السائب بن يزيد، ابنُ خصيفة ـ فسألتُ يزيد بن خصيفة، فقال: حسبتُ أنّ السّائب قال: أحد وعشرين ـ قال محمد: أَوَ قلت لإحدى وعشرين؟“[1]

”سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اُبی

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے ساتھ تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر دیا، تو یہ دونوں ایک رکعت میں سو آیات پڑھاتے تھے۔ پھر جب ہم نماز سے فارغ ہوتے تھے تو ہم کو لگتا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے، سائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم گیارہ رکعات پڑھتے تھے۔ اس روایت کے راوی اسماعیل بن امیہ نے جب محمد بن یوسف سے یہ سنا تو پوچھا: یا اکیس رکعات؟ محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب رضی اللہ عنہ سے سنی ہے ۔اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یزید بن خصیفہ سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ سائب رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔ محمد بن یوسف نے کہا: کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟''

اس حدیث میں جس صفائی سے لفظی و معنوی تحریف کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، اس پر آگاہ ہونے کے لیے درج ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لیں:

روایت کے اصل راوی اور ان کے دو شاگردوں کے بیان میں اختلاف:

عہدِ فاروقی میں باجماعت تراویح کے واقعہ کو بیان کرنے والے اصل راوی سائب رضی اللہ عنہ ہیں، پھر ان سے ان کے دو شاگردوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے:

① محمد بن یوسف

② یزید بن خصیفہ

ان دونوں نے اپنے استاذ سائب رضی اللہ عنہ سے ہی تراویح کا یہ واقعہ نقل کیا ہے، لیکن تراویح کی رکعات نقل کرنے میں دونوں کے بیان میں اختلاف ہے۔

محمد بن یوسف نے سائب رضی اللہ عنہ سے گیارہ رکعات کی تعداد بیان کی ہے، جبکہ یزید بن خصیفہ نے سائب رضی اللہ عنہ سے اکیس رکعات کی تعداد بیان کی ہے۔ ظاہر ہے کہ

سائب رضی اللہ عنہ نے کوئی ایک ہی تعداد بیان کی ہے، اس لیے ان کے دونوں شاگردوں میں سے کسی ایک ہی کی بات صحیح ہے اور دوسرے کے حافظہ نے غلطی کی ہے۔

بہرحال یہ دونوں شاگرد جب خود استاد بن گئے اور حدیث کا درس دینے لگے تو یہ دونوں اپنے اپنے شاگردوں کو یہ واقعہ بیان کرتے رہے اور ہر ایک اپنی اپنی تعداد ہی کو بیان کرتا رہا۔ محمد بن یوسف ''گیارہ رکعات'' کی تعداد بیان کرتے رہے اور یزید بن خصیفہ ''اکیس رکعات'' کی تعداد بیان کرتے رہے۔

اسماعیل بن امیہ کی طرف سے جانچ پڑتال:

اسماعیل بن امیہ ایک ایسے راوی ہیں جنھوں نے مذکورہ دونوں حضرات یعنی محمد بن یوسف اور یزید بن خصیفہ، دونوں کا زمانہ پایا ہے اور آگے چل کر ان دونوں کی شاگردی بھی اختیار کی ہے، لیکن ابھی اسماعیل بن امیہ نے ان دونوں میں سے کسی سے بھی بذاتِ خود تراویح والی روایت نہیں سنی تھی کہ اسی دوران میں کسی نے غلط بیانی کر دی کہ محمد بن یوسف نے واقعہ تراویح بیان کرتے ہوئے ''اکیس رکعات'' کی تعداد بیان کی ہے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اس شخص کا حوالہ بھی دیا ہے۔ کما مضی۔ لیکن اس کا نام نہیں بتایا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شخص نہیں تھا۔ یہ بات اسماعیل بن امیہ تک بھی پہنچی، یعنی محمد بن یوسف سے براہِ راست یہ واقعہ سننے سے پہلے ہی ان تک یہ بات پہنچ گئی کہ محمد بن یوسف نے تراویح کے واقعہ میں اکیس کی تعداد بیان کی ہے۔

لیکن جب اسماعیل بن امیہ نے خود محمد بن یوسف کے حلقۂ درس میں ان کی زبانی یہ روایت سنی تو انھوں نے تراویح کے اس واقعے میں گیارہ کی تعداد بیان کی۔ ظاہر ہے اس پر اسماعیل بن امیہ کو حیرانی ہوگی۔

اگر یہ بات نہ بھی مانیں کہ اسماعیل بن امیہ کو محمد بن یوسف ہی سے نقل کی گئی اکیس والی بات پہنچی تھی تو بھی چونکہ بیس سے متعلق بھی کچھ روایات ہیں اس لیے ممکن ہے کہ انھیں روایات کے پیشِ نظر اسماعیل بن امیہ نے سوال کیا ہو۔ لیکن پہلی بات ہی زیادہ قرینِ صواب ہے، کیوں کہ محمد بن یوسف کے حوالے سے نامعلوم شخص نے ''اکیس کی تعداد'' نقل کی تھی اور اسی ''اکیس کی تعداد'' کا حوالہ دے کر اسماعیل بن امیہ نے سوال کیا تھا۔

محمد بن یوسف سے سوال:

چنانچہ اسماعیل بن امیہ نے فوراً سوال کیا جسے وہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قلت: أو واحد وعشرين؟!

''(اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں:) میں نے پوچھا: یا اکیس رکعات؟''

غور فرمائیں! یہاں سوال لفظ ''أوْ'' (یا) کے ذریعے ہو رہا ہے، جس کا مطلب واضح ہے کہ وہ محض استفسار کر رہے ہیں، لہٰذا یہاں کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے استاذ کو غلطی پر ٹوک رہے ہیں، یا ان کی اصلاح کر رہے ہیں۔ اگر غلطی پر ٹوکنے اور اصلاح کرنے کی صورت ہوتی تو وہ ''أوْ'' (یا) کے ذریعے اپنی بات نہ رکھتے، بلکہ سیدھا اکیس کی تعداد بتا کر اپنے استاذ کو بھی وہی بیان کرنے کے لیے بولتے، لیکن یہاں ایسا بالکل نہیں ہے، لہٰذا یہ جو کچھ ہے محض ایک استفسار اور سوال ہے۔ اگر اسے ٹوکنے سے تعبیر کیا جائے تو بھی اس کا مطلب یہی ہوگا کہ استفسار کے لیے ٹوکا تھا نہ کہ اصلاح کے لیے ایسا کہا تھا۔

محمد بن یوسف کا جواب:

اسماعیل بن امیہ کی طرف سے مذکورہ بالا استفسار پر محمد بن یوسف نے جو

جواب دیا، اسے اسماعیل بن امیہ نے یوں نقل کیا:

"قال: لقد سمع ذلك من السائب بن يزيد، ابنُ خصيفة، أو قلت: لإحدى وعشرين؟"

''محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔ کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟''

اس جواب میں محمد بن یوسف نے یہ بتایا کہ اکیس کی تعداد انھوں نے ہرگز نہیں سنی ہے، بلکہ اسے تو یزید بن خصیفہ نے ہی سنا ہے۔ یہاں جواب میں "لقد سمع" کے ذریعے جو تاکید ہے وہ سماع کی نسبت سے متعلق ہے، یعنی یہ سماع ہمارا نہیں، بلکہ یہ تو یزید بن خصیفہ ہی کا ہے، بالفاظِ دیگر اس طرح کی بات تو یزید بن خصیفہ ہی نے سنی ہے۔

اور محمد بن یوسف اپنی طرف سے اس کی نسبت کی نفی کر کے اس کی نسبت پوری تاکید کے ساتھ یزید بن خصیفہ کی طرف کر رہے ہیں جس کا واضح مفاد یہ ہے کہ وہ اس تعداد کے سننے میں یزید بن خصیفہ کو خطا کار ٹھہرا رہے ہیں، یعنی اکیس کی تعداد یزید بن خصیفہ ہی نے سنی ہے، لیکن ان سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح بولنے، لکھنے، پڑھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، اسی طرح سننے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ انسان جب غفلت کا شکار ہو، یا اس کا ذہن پوری طرح سے حاضر نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ سن لیتا ہے اور آج کے دور میں تو یہ چیز اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی انسان ہو، جس کے سامنے کبھی کوئی ایسا موقع نہ آیا ہو کہ اس کے سامنے کچھ کہا گیا ہو، لیکن اسے کچھ اور ہی سنائی نہ دیا ہو۔ بالخصوص جب کہی گئی چیز ایسی ہو کہ اس سے ملتی جلتی چیز پہلے بھی ذہن میں آتی رہی ہو، ایسے مواقع پر ذرا

سی غفلت بھی قوتِ سماعت کو دھوکا دے جاتی ہے۔

بعض راویانِ حدیث کے ساتھ بھی ایسا ہوا کہ ان سے سننے میں غلطی ہوئی ہے، اسی لیے ائمہ علل کے یہاں یہ بات مسلم ہے کہ سننے میں بھی غلطی ہوسکتی ہے، چنانچہ ایک روایت پر کلام کرتے ہوئے امام دارقطنی فرماتے ہیں:

"وهذا وهم فيه ابن عباد على الدراوردي، عَن حميد حين سمعه ابن عباد منه"[1]

''حمید کے طریق سے، الدراوردی سے اس روایت کو جس وقت ابن عباد نے سنا، اس وقت وہم کا شکار ہو گئے۔''

ملاحظہ فرمائیں! یہاں امام دارقطنی رحمہ اللہ راوی کو عین سنتے وقت ہی وہم کا شکار بتلا رہے ہیں، یعنی بقول دارقطنی ان سے سننے میں غلطی ہوگئی ہے۔ واضح رہے کہ اس حوالے سے صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ عین سنتے وقت راوی کا وہم کا شکار ہو جانا، یعنی سننے میں غلطی کر جانا، یہ محدثین کو مسلّم ہے، ورنہ امام دارقطنی رحمہ اللہ یہ تعبیر استعمال نہ کرتے۔

رہی یہ بات کہ اس حدیث کو سنتے وقت کیا واقعی ابن عباد سے غلطی ہوئی ہے؟ یہ الگ مسئلہ ہے۔ بعض محدثین نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اس قول سے اتفاق کیا ہے، لیکن بعض اہلِ علم نے عدمِ اتفاق کا اظہار کیا ہے، لیکن اس تعبیر پر کسی نے گرفت نہیں کی ہے کہ کوئی راوی سننے میں غلطی کیسے کرسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی غلطی کی نفی کی ہے، اس نے ابن عباد کی متابعات پیش کی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ زیرِ بحث روایت میں اکیس کی تعداد یزید بن خصیفہ ہی نے سنی ہے اور ان کے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

---

[1] الإلزامات والتتبع للدارقطني (ص٣٦١)

محمد بن یوسف نے جواب کے آخر میں جو کہا:

"أَوَ قلت: لِإحدی وعشرین؟"

''کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟''

یہاں "أَوَ" واؤ کے زبر کے ساتھ ہے جو استفہام کے لیے آتا ہے، جیسے قرآن میں درجنوں مقامات پر ہے:

﴿أَوَ لَمْ يَرَوْا﴾ [الرعد:٤١] ''کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں ...؟''

یہاں یہ استفہام، استفہام انکاری ہے اور "لِإحدی وعشرین؟" میں ''لام'' یہ زبر کے ساتھ لام تاکید نہیں ہے، کیوں کہ لام تاکید جس پر داخل ہوتا ہے اسے مجرور یا منصوب نہیں کرتا، جب کہ "إحدی و عشرین" یہاں لام کے سبب مجرور ہے۔ پتا چلا کہ یہ ''لام'' یہاں زیر کے ساتھ ہے اور لام جارہ ہے۔

الغرض محمد بن یوسف نے جواب میں اکیس کی تعداد کا سختی سے انکار کیا اور اسے یزید بن خصیفہ کا وہم قرار دیا ہے۔

یزید بن خصیفہ سے سوال:

اسماعیل بن امیہ نے جب یہ سنا کہ یزید بن خصیفہ ایسا بیان کرتے ہیں تو بعد میں تحقیق کی غرض سے ان کے پاس بھی پہنچے اور رکعات کی تعداد کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔

یزید بن خصیفہ کا جواب:

یزید بن خصیفہ نے جو جواب دیا اسے نقل کرتے ہوئے اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں:

" فسألتُ یزید بن خصیفة، فقال: حسبتُ أنّ السّائب قال: أحد وعشرین"

''اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یزید بن خصیفہ سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ سائب رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔''

صاف ظاہر ہے کہ یزید بن خصیفہ شک میں پڑ گئے اور کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے استاذ سائب رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔

ملاحظہ کریں کہ کہاں محمد بن یوسف کا بانگِ دہل اور پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ گیارہ کی تعداد بیان کرنا، اور ساتھ ہی اکیس کے عدد کی سختی سے تردید کرنا، اور کہاں یزید بن خصیفہ جن کی حالت یہ ہے کہ مخالف کی بیان کردہ تعداد پر انگلی اٹھانا تو دور کی بات خود اپنی بیان کردہ تعداد پر انھیں اطمینان نہیں ہے۔

اس صورتِ حال سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ سائب رضی اللہ عنہ سے جو تعداد محمد بن یوسف نے نقل کی ہے وہ درست ہے، اور یزید بن خصیفہ نے جو تعداد بیان کی ہے وہ ان کے حافظے کی کوتاہی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ بالخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یزید بن خصیفہ کی یہ صرف واحد غلطی نہیں ہے، بلکہ اور بھی متعدد روایات کے بیان میں ان سے سہو ہوا ہے، جس کی بنا پر بعض محدثین نے ان کے حافظے پر قدغن لگایا ہے اور انھیں وہم، سوئے حفظ اور اپنے شریک درس ساتھیوں سے الگ تھلگ روایات بیان کرنے سے متصف کیا ہے تو یہ بات قطعیت تک پہنچ جاتی ہے کہ اس روایت میں غلطی کا صدور انھیں کی طرف سے ہوا ہے اور محمد بن یوسف کا بیان سو فی صد درست ہے۔

تحقیق کے بعد اسماعیل بن امیہ کی طرف سے اس روایت کا بیان:

اسماعیل بن امیہ نے جب محمد بن یوسف سے تراویح کا یہ واقعہ سنا اور پھر یزید

بن خصیفہ سے بھی پوچھ تاچھ کر لی، تو اس کے بعد جب یہ اپنے شاگردوں سے اس واقعہ کو بیان کرتے، تو محمد بن یوسف ہی کی روایت بیان کرتے تھے، اور جب محمد بن یوسف سے اپنا سوال و جواب نقل کرتے، تو محمد بن یوسف کے جواب کے بیچ میں جملہ معترضہ کے طور پر یزید بن خصیفہ سے اپنی پوچھ تاچھ بھی شامل کر کے بیان کر دیتے تھے۔

چنانچہ جب اسماعیل بن امیہ نے اپنے استاذ محمد بن یوسف سے رکعات کی تعداد کی بابت دریافت کیا تھا تو محمد بن یوسف کا جواب یہ تھا:

"قال: لقد سمع ذلك من السائب بن يزيد، ابنُ خصيفة، أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟"[1]

"محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب رضی اللہ عنہ سے سنی ہے، کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟"

اس جواب میں یہ تھا کہ اکیس کی تعداد یزید بن خصیفہ نے ہی سنی ہے، جس کی بنا پر یزید بن خصیفہ سے بھی اسماعیل بن امیہ نے پوچھ تاچھ کی تھی، اس لیے اسماعیل بن امیہ، بعد میں جب محمد بن یوسف کا یہ جواب نقل فرماتے تو یزید بن خصیفہ کے احالے والے جملے کے بعد، یزید بن خصیفہ سے اپنی پوچھ تاچھ بھی شامل کر کے، محمد بن یوسف کا جواب اس طرح بیان کرتے:

قال: لقد سمع ذلك من السائب بن يزيد، ابنُ خصيفة ـ فسألتُ يزيد بن خصيفة، فقال: حسبتُ أنّ السّائب قال: أحد وعشرين ـ قال محمد: "أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟"[2]

---

[1] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

[2] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

’’محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔ اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یزید بن خصیفہ سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے اکیس کہا تھا۔ محمد بن یوسف نے کہا: کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟‘‘

یعنی اسماعیل بن امیہ، محمد بن یوسف کے جواب کے ابتدائی الفاظ جو یزید بن خصیفہ سے متعلق تھے، انھیں نقل کر کے فوراً ہی یزید بن خصیفہ سے اپنی پوچھ تاچھ بیان کر دیتے اور پھر محمد بن یوسف کے جواب کا بقیہ حصہ بھی یہ کہہ کر مکمل کرتے:

’’قال محمد: أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟‘‘

’’محمد بن یوسف نے کہا: کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟‘‘

یہ ہے اس روایت کی پوری تفصیل جس نے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کہ سائب رضی اللہ عنہ سے اکیس کی تعداد نقل کرنے میں یزید بن خصیفہ سے غلطی ہوئی ہے اور صحیح تعداد گیارہ ہی ہے جیسا کہ محمد بن یوسف نے نقل کیا۔

یہ روایت سامنے آنے کے بعد بعض احناف بری طرح بوکھلا گئے، اس لیے انھوں نے حسبِ عادت اس روایت میں بھی لفظی اور معنوی تحریف کرنے کی ناکام کوشش کی جس کی تردید ہم اگلی سطور میں پیش کرتے ہیں۔

محمد بن یوسف کی روایت میں لفظوی و معنوی تحریف کی کہانی

کیا اسماعیل بن امیہ نے اپنے استاذ محمد بن یوسف کو غلطی پر ٹوکا؟

اس روایت میں معنوی تحریف کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ جب

محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد بیان کی تو ان کے شاگرد اسماعیل نے ٹوک دیا!

اگر یہ ٹوکنا اس معنی میں لیا جائے کہ روک کر استفسار کیا تو یہ درست ہے، لیکن تحریف کرنے والے یہاں ٹوکنا بول کر یہ مراد لیتے ہیں کہ غلطی پر گرفت کی، جب کہ یہ سراسر خلافِ حقیقت ہے، کیوں کہ اسماعیل نے غلطی پر نہیں ٹوکا تھا، بلکہ صرف سوال کیا تھا جس کی وضاحت ماقبل میں ہو چکی ہے اور اس کی وجہ ہم بتلا چکے ہیں کہ محمد بن یوسف کے حوالے سے کسی نے یہ غلط بیانی کر دی کہ انھوں نے اکیس کی تعداد بیان کی ہے۔ اس شخص کا کسی نے نام نہیں بتایا ہے، امام عبدالرزاق کی روایت میں ''وغیرہ'' کے ذریعے محض اس کا حوالہ ہے۔ چونکہ محمد بن یوسف کے حوالے سے اکیس بیان کرنے والے کی کوئی خاص وقعت نہ تھی، اس لیے جب اسماعیل نے اس بارے میں محمد بن یوسف سے سوال کیا تو اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا، کیوں کہ وہ اس قابل نہیں تھا۔

''الاجماع'' کے مضمون نگار نے لکھا ہے:

> ''اور اس قدر یقینی طور پر پہنچا کہ اس کے خلاف سننے سے حیرانی ہو۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ان کے پاس معتبر ثقہ راوی سے محمد بن یوسف کی ۲۱ والی روایت پہنچی ہو۔''[1]

عرض ہے کہ حیرانی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ محمد بن یوسف نے گیارہ کیوں بیان کر دیا؟ بلکہ حیرانی کی وجہ یہ بات تھی کہ انھیں کے حوالے سے کسی نے اکیس کی تعداد کیوں بیان کی ہے؟ اور یہ بیان کرنے والے کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی اسی لیے اسماعیل بن امیہ نے اس کا حوالہ تک نہیں دیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ''معتبر ثقہ راوی سے محمد بن یوسف کی ۲۱ والی روایات پہنچی ہو'' محض خام خیالی ہے۔ ذرا کتبِ احادیث چھان

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱، ص:۶۱)

ماریے اور بتائیے کہ محمد بن یوسف سے کس ثقہ راوی نے اکیس کی تعداد نقل کی ہے؟ بالخصوص جب کہ محمد بن یوسف نے سختی کے ساتھ انکار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:

"أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟" "کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟"

مطلب انھوں نے اکیس کی تعداد کبھی بیان ہی نہیں کی۔ مزید یہ دیکھیں کہ محمد بن یوسف نے جب یہ کہا کہ اکیس کی تعداد تو یزید بن خصیفہ بیان کرتے ہیں تو اسماعیل ان کے پاس پہنچ گئے، لیکن جس بندے نے محمد بن یوسف کے حوالے سے اکیس کی تعداد بیان کی تھی، اس کا نہ نام لیا اور نہ اس کے پاس پوچھ تاچھ کے لیے گئے۔

یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ بیان کرنے والا کسی خاص مقام و مرتبے کا حامل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیل نے اپنے استاذ سے اکیس رکعات کی بابت استفسار ہی کیا ہے، نہ کہ ان کی اصلاح کے لیے ان کو ٹوکا ہے۔

کیا محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد کو یزید بن خصیفہ کی طرف منسوب کیا ہے؟

دوسری تحریف کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد کو یزید بن خصیفہ کی طرف منسوب کیا، چنانچہ تحریف کرنے والوں نے کہا کہ جب محمد بن یوسف کے شاگرد نے اکیس کی تعداد کا ذکر کیا تو اس پر محمد بن یوسف نے کہا کہ جو میں بیان کرتا ہوں، یعنی گیارہ کی تعداد، یہی تعداد یزید بن خصیفہ بھی بیان کرتے ہیں، جا کر ان سے پوچھ لو!

اس تحریف کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک بار پھر سے اسماعیل اور ان کے استاذ محمد بن یوسف کا سوال وجواب ملاحظہ کرلیں:

اسماعیل بن امیہ کا سوال تھا: "قلت: أو واحد وعشرين؟!"

''اسماعیل بن امیہ نے پوچھا: یا اکیس رکعات؟''

محمد بن یوسف کا جواب تھا: ''قال: لقد سمع ذلك من السائب بن یزید، ابنُ خصیفة''

''اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔''

ملاحظہ کریں! سوال میں صرف ''اکیس'' کی تعداد کا ذکر ہے اور محمد بن یوسف نے ''ذلك'' (اسے) کہہ کر اکیس کی تعداد ہی کو یزید بن خصیفہ کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن تحریف کرنے والوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ ''ذلك'' اسمِ اشارہ ہے، جو دور کے لیے آتا ہے، اس لیے ہم نے دور والے عدد یعنی گیارہ کو مراد لیا ہے۔

حالانکہ یہاں ''ذلك'' ایک سوال کے جواب میں کہا گیا ہے اور اس سوال میں صرف ایک ہی عدد ''واحد و عشرین'' یعنی ''اکیس'' کا ذکر ہے، جیسا کہ ہم اوپر سوال جواب نقل کر چکے ہیں، لہٰذا لازمی اور قطعی طور پر اس کا مشار الیہ بیس کی تعداد ہی ہے، کیوں کہ سوال میں کوئی دوسرا عدد سرے سے موجود ہی نہیں۔

اور تحریف کرنے والوں نے جو یہ کہا ہے:

''استاذ (محمد بن یوسف رحمہ اللہ) کا جملہ جو پہلے ہے، اس میں گیارہ ہے، اور شاگرد (اسماعیل بن امیہ رحمہ اللہ) کا جملہ جو بعد میں ہے، اس میں اکیس ہے (اور پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ ''ذلك'' سے دور کی طرف اشارہ ہوتا ہے) لہٰذا یہاں بھی گیارہ کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ وہ اکیس کے مقابلے میں دور ہے۔''[1]

یہ عربی زبان اور نحو کے قواعد سے نابلد ہونے کا ثبوت ہے، کیوں کہ قطع نظر

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱، ص: ۷۵)

اس کے کہ "ذلك"قریب کے لیے بھی آتا ہے، یہ جب کلام میں بعید (دور) ہی کے لیے بھی آتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ مشار الیہ اس لفظ "ذلك" کے بعد نہیں، بلکہ اس سے پہلے ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

﴿وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ [الأعراف: ٢٦]

"اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے۔"

اس آیت میں اسم اشارہ ﴿ذٰلِكَ﴾ ہے اور اس کا مشار الیہ ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ ہے جو اس سے پہلے ہے اور اس کے اتنا قریب ہے کہ بالکل اس سے جڑا ہوا ہے۔

اب یہاں کوئی کہے کہ ہم ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ کو ﴿ذٰلِكَ﴾ کا مشار الیہ نہیں مان سکتے، کیوں کہ وہ تو اس سے بالکل قریب ہے، بلکہ اس سے جڑا ہوا ہے، اس لیے ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ سے بھی پہلے جو چیز مذکور ہے اور دور ہے، وہ یہاں ﴿ذٰلِكَ﴾ کا مشار الیہ ہوگی، کیوں کہ ﴿ذٰلِكَ﴾ دور کے لیے آتا ہے! تو بتائیے اس شخص کے احمق اور جاہل ہونے میں کوئی شبہہ رہ جاتا ہے؟

دراصل ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ کا ﴿ذٰلِكَ﴾ سے پہلے آجانا ہی دور کے معنی میں ہے۔ اس لیے ﴿ذٰلِكَ﴾ سے پہلے جتنی بھی چیزیں ہوں گی، وہ سب دور کی مانی جائیں گی اور ﴿ذٰلِكَ﴾ سے مراد وہ چیز ہوگی جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہو گی۔ لیکن مضمون نگار کی جہالت دیکھیے کہ دور کا مطلب یہ بتا رہے ہیں کہ جو چیز ﴿ذٰلِكَ﴾ سے پہلے ذکر ہو کر بھی سب سے دور مذکور ہے۔ سبحان اللہ!

یہ خود ساختہ احتمال کہ محمد بن یوسف نے جس تعداد کو یزید بن خصیفہ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ گیارہ کی تعداد بھی ہو سکتی ہے، اسے سب سے پہلے دکتور بقالی صاحب کے ذہن نے تراشا ہے اور انھیں کے مضمون کو دیکھ کر تحریف کرنے والوں

نے پوری تحریفی کارروائی انجام دی ہے۔

لیکن یہی دکتور بقالی صاحب فرماتے ہیں:

”وإما أنه سمع ذلك العدد الذي ذكره إسماعيل بن أمية أي أحد وعشرين، وهذا أظهر للإشارة إلى أقرب مذكور“[1]

”اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محمد بن یوسف نے یزید بن خصیفہ کی طرف جس تعداد کے سننے کی نسبت کی ہے وہ وہی تعداد ہو جسے اسماعیل بن امیہ نے (اپنے سوال میں) ذکر کیا ہے اور وہ اکیس کی تعدد ہے، اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ یہ سب سے قریب مذکور ہے۔“

ملاحظہ فرمائیں! تحریف کرنے والوں کے مسیحا بھی اعلان فرما رہے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ محمد بن یوسف کی مراد اکیس کی تعدا د ہے، کیوں کہ یہ ”ذلك“ سے پہلے سب سے اقرب مذکور ہے۔

علاوہ بریں یہاں اقرب اور ابعد کی بات کرنی ہی فضول ہے، کیوں کہ محمد بن یوسف نے مذکورہ بات ایک سوال کے جواب میں ہی کہی ہے اور سوال میں صرف ایک ہی عدد ”اکیس“ کا ذکر ہے، اس لیے مشار الیہ قطعی و لازمی طور پر یہی عدد ہے۔

حیرت ہے کہ جب سوال میں سرے سے دوسرے کسی عدد کا ذکر ہی نہیں ہے تو نا جانے کس عقل و منطق سے اقرب و ابعد کی بحث چھیڑی جا رہی ہے۔

”الاجماع“ کے مضمون نگار نے اپنی اس تحریف کی اپنے زعم میں دو وجہیں بتائی ہیں: ایک اشارہ والی اور دوسری یہ کہ محمد بن یوسف نے یزید بن خصیفہ کو اپنا حمایتی بتایا ہے۔[2]

---

[1] دیکھیں: فصل الخطاب في بيان عدد ركعات صلاة التراويح في زمن عمر بن الخطاب.

[2] الاجماع (شمارہ:۱، ص:۷۵)

حالانکہ دوسری بات پہلی بات کا نتیجہ ہے، یعنی پہلے جب ''ذلك'' کا مشار الیہ طے کرنے میں غلطی کی تو اس غلطی کا وہی نتیجہ سامنے آیا جسے مضمون نگار نے دوسری وجہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس لیے جب پہلی بات باطل ثابت ہوگئی تو اس سے نکلا ہوا نتیجہ بھی باطل ہوگیا۔ والحمد للّٰہ

آگے مضمون نگار نے باطل بنیاد پر نکالے گئے باطل نتیجے کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ محمد بن یوسف نے قسم کھا کر تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ یہ بات یزید بن خصیفہ نے کہی ہے۔[1]

عرض ہے کہ محمد بن یوسف کے جملے میں قسم نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ بھی تحریف گروں کی تحریف کا حصہ ہے، مزید یہ کہ یہ قسم ہو یا تاکید ہو، یہ سب محض اس لیے کہ محمد بن یوسف کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بات میں نے نہیں بلکہ یزید بن خصیفہ نے کہی ہے، جیسا کہ پہلے ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

بلکہ ہم مضمون نگار ہی کے اسلوب میں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہاں محمد بن یوسف پوری تاکید کے ساتھ اپنی بات کہہ رہے ہیں جس کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ بیس رکعات کی تعداد کے انکاری ہیں اور خود پر یہ تہمت ناقابلِ برداشت سمجھتے ہیں، اور یہ دنیا جانتی ہے کہ جب کسی معصوم پر کوئی تہمت لگا دے تو وہ قسم کھا کر یا پوری تاکید سے براءت کا اظہار کرتا ہے۔

اس طرح اس تاکیدی اسلوب سے بھی یہی بات ثابت ہوئی کہ محمد بن یوسف کی طرف بیس رکعات کی نسبت محض ایک بہتان ہے اور انھوں نے سختی کے ساتھ اس سے براءت ظاہر کر دی ہے۔ والحمد للّٰہ

---

[1] الاجماع (شمارہ: ١، ص: ٧٦)

کیا محمد بن یوسف نے یزید بن خصیفہ کے سماع کو صحیح قرار دیا ہے؟

تحریف کرنے والوں نے خود تو یہ بات تسلیم نہ کی کہ محمد بن یوسف نے اکیس کی تعداد، یزید بن خصیفہ کی طرف منسوب کی ہے، لیکن چونکہ ہم یہی مانتے ہیں جیسا کہ الفاظِ حدیث بالکل صریح اور واضح ہیں، اس لیے تحریف نگاروں نے سینہ زوری کرتے ہوئے اس مفہوم میں بھی یہ دعویٰ کیا کہ محمد بن یوسف نے ''لقد سمع ...'' یعنی ''لام'' اور ''قد'' کی تاکید استعمال کرتے ہوئے پوری تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ یزید بن خصیفہ نے اکیس کی تعداد سنی ہے، یعنی محمد بن یوسف نے یزید بن خصیفہ کے سماع کو پوری تاکید کے ساتھ صحیح بتلایا ہے۔

عرض ہے کہ پیچھے یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ محمد بن یوسف نے سماع کی نسبت یزید بن خصیفہ کی طرف کی ہے اور اسی پر زور دیا ہے، لیکن ان کے سماع کو صحیح نہیں کہا، بلکہ اس کے غلط ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مضمون نگار نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ ہم نے ''لام'' اور ''قد'' کی تاکید کا ترجمہ کیوں نہیں کیا؟ عرض ہے کہ یہ ساری تاکید، یزید بن خصیفہ کی طرف اکیس کے سماع کی نسبت کے لیے ہے، نہ کہ نفسِ سماع کی صحت کے لیے ہے، یہاں ''لام'' اور ''قد'' کے بعد صرف ایک لفظ نہیں بلکہ پورا جملہ ہے۔ یعنی سارا زور اس پر ہے کہ یہ سماع یزید بن خصیفہ کا ہے، اس لیے ہم نے ترجمہ میں زور اور تاکید اسی نسبت کے ساتھ رکھا ہے اور یوں کہا ہے کہ ''اس طرح کی بات'' یزید بن خصیفہ نے سنی ہے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ تحریف کرنے والوں نے خود یہ معنی تراشا ہے کہ محمد بن یوسف نے جس تعداد کے سماع کی نسبت یزید بن خصیفہ کی طرف کی ہے وہ ''گیارہ'' ہے۔ لیکن جب اسماعیل نے یزید بن خصیفہ سے پوچھ تاچھ کی تو انھوں نے

اکیس کی تعداد کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ یعنی ان لوگوں کی نظر میں محمد بن یوسف نے جو بات ''لام'' اور ''قد'' کی تائید کے ساتھ کہی تھی وہ پوری کی پوری غلط ہے۔ سبحان اللہ!

ایک طرف تو یہ سینہ زوری کہ ''لام'' اور ''قد'' سمیت محمد بن یوسف کی پوری بات ہی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں اور دوسری طرف یہ کٹ حجتی کہ محمد بن یوسف نے ''لام'' اور ''قد'' کے ساتھ سماع کی نسبت، یزید بن خصیفہ کی طرف کی ہے، اس لیے وہ اس سماع کو بھی صحیح مان رہے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است!

اس کٹ حجتی کے بل بوتے پر مضمون نگار نے آگے لکھا ہے:

''اس سے صحابیِ رسول کے حافظے پر سوال اٹھنے لگے گا کہ انھوں نے حضرت عمر کے زمانہ میں پڑھی جانے والی نمازِ تراویح کی رکعات کی تعداد کسی کو گیارہ رکعت بتلائی اور کسی کو اکیس۔''[1]

عرض ہے کہ سوال صحابیِ رسول کے حافظے پر نہیں، بلکہ سوال یزید بن خصیفہ کے حافظے پر اٹھے گا کہ جب محمد بن یوسف نے پورے وثوق کے ساتھ صحابی سے گیارہ رکعت سنی ہے تو یزید بن خصیفہ نے اکیس کیسے سن لیا؟ ظاہر ہے کہ یہ تعداد سننے میں ان سے غلطی ہوئی اور ان کے حافظے نے کوتاہی کی ہے، اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر ان سے اس طرح کی چوک ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ باقاعدہ محدثین نے ان کے حافظہ پر سوال اٹھایا ہے اور انھیں وہم کا شکار ہونے والا اور منکر الحدیث کہا ہے۔ کما مضی

مضمون نگار نے آگے لکھا ہے:

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱،ص:۷۷)

”یہ معنی لینے کی وجہ سے جب کفایت اللہ صاحب پر یہ اعتراض ہوا کہ آپ صحابی کے حافظہ پر کلام کر رہے ہو تو کہنے لگے: محمد بن یوسف نے یہاں صرف یہ کہا ہے کہ ایسا ابن خصیفہ نے سنا ہے، لیکن یہ ہرگز نہیں کہا ہے کہ صحیح طور پر سنا ہے۔ عجیب بے تکی بات ہے! کیا جب بھی کوئی راوی کسی کے حدیث سننے کا تذکرہ کرتا ہے تو کیا یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے صحیح سنا ہے؟ کیا بخاری و مسلم کی سند میں ہر راوی اپنے استاذ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ انھوں نے فلاں سے سنا ہے اور صحیح سنا ہے؟!“[1]

عرض ہے کہ بخاری و مسلم کی سندوں میں جب کوئی راوی اپنے استاد کا سماع ذکر کرتا ہے تو اس سماع کو کسی دوسرے راوی کے سماع کے خلاف ذکر نہیں کرتا، لیکن یہاں محمد بن یوسف نے سائب رضی اللہ عنہ سے اپنا ایک سماع ذکر کیا ہے اور پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ ذکر کیا ہے، پھر اس کے خلاف یزید بن خصیفہ کا سماع ذکر کیا ہے۔ یہاں سیاق روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا ہے کہ محمد بن یوسف اپنے سماع کے خلاف یزید بن خصیفہ کے سماع کو غلط بتلا رہے ہیں اور ماقبل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح بولنے، لکھنے، پڑھنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سننے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، انسان جب غفلت کا شکار ہو یا اس کا ذہن پوری طرح سے حاضر نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ سن لیتا ہے اور آج کے دور میں تو یہ چیز اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی انسان ہو جس کے سامنے کبھی کوئی ایسا موقع نہ آیا ہو کہ اس کے سامنے کہا گیا ہو کچھ لیکن اسے کچھ اور ہی سنائی نہ دیا ہو۔ بالخصوص جب کہی گئی چیز ایسی ہو کہ اس سے ملتی جلتی چیز پہلے بھی ذہن میں آتی رہی ہو، ایسے مواقع پر ذرا سی غفلت بھی، قوتِ سماعت کو

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱، ص:۷۷)

دھوکا دے جاتی ہے۔

اس بات کو ہم امام دارقطنی کے ایک کلام سے بھی واضح کر چکے ہیں کہ ایک روایت پر کلام کرتے ہوئے امام دارقطنی نے کہا:

"وهذا وهم فيه ابن عباد على الدراوردي، عَن حميد حين سمعه ابن عباد منه"[1]

''حمید کے طریق سے، الدراوردی سے اس روایت کو جس وقت ابن عباد نے سنا، اس وقت وہم کا شکار ہو گئے۔''

ملاحظہ فرمائیں! یہاں امام دارقطنی رحمہ اللہ ، دراوردی سے ابن عباد کا سماع ذکر کر رہے ہیں اور پھر اسے غلط بتلا رہے ہیں۔ یہاں امام دارقطنی نے ابن عباد کے سماع کو غلط اسی وجہ سے کہا ہے، کیوں کہ ان کی نظر میں دوسرے رواۃ کا سماع ان کے سماع سے مختلف تھا۔

معلوم ہوا کہ راوی کا مطلق سماع ذکر کرنا ایک چیز ہے اور کسی کے مخالف کسی کا سماع ذکر کرنا دوسری چیز ہے۔ یہاں محمد بن یوسف نے اپنے سماع کے خلاف یزید بن خصیفہ کا سماع ذکر کیا ہے اور حفظ و ضبط میں محمد بن یوسف کا پلڑا بھاری ہے، اس لیے ان کے سماع ہی کو ترجیح دی جائے گی اور یزید بن خصیفہ کا سماع مردود قرار پائے گا۔ بالخصوص جب کہ خود یزید بن خصیفہ کو بھی اپنے سماع پر اطمینان اور شرح صدر نہیں ہے، کیوں کہ جب اسماعیل بن امیہ نے ان سے پوچھا تو انھوں نے "حسبت" کے ذریعے اظہارِ خیال فرمایا۔ یعنی یہ کہا کہ میرا گمان ہے کہ سائب نے اکیس کہا تھا۔ اب وثوق و یقین کے برخلاف ظن و تخمین والی بات کون سنے گا؟

---

[1] الإلزامات والتتبع للدارقطني (ص: ٣٦١)

''الاجماع'' کے مضمون نگار نے ابن خصیفہ کے قول ''حسبت'' (میرا خیال) سے متعلق یہ صفائی دی ہے کہ اور بھی کئی احادیث میں بعض رواۃ نے کسی جملے کو اسی طرح گمان کے صیغے سے بیان کیا ہے تو کیا ان کی احادیث بھی رد کر دی جائیں؟[1]

عرض ہے کہ یہ کس نے کہا کہ ہر گمان مردود ہو گا؟ بے شک ہر گمان رد نہیں ہو گا، لیکن بعض گمان نہ صرف یہ کہ قابلِ تردید ہوتا ہے، بلکہ بعض گمان گناہ بھی ہوتا ہے۔

معترض نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے کسی بھی مثال میں راویوں کے گمان کے خلاف کوئی بات نہیں کہی گئی، لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ یزید بن خصیفہ کا گمان محمد بن یوسف کے وثوق و یقین کے خلاف ہے، لہٰذا ایسا گمان جو یقین کے مقابل ہو وہ بلاشبہہ قابلِ رد ہو گا۔

آگے معترض کی ایک بے تکی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''اسماعیل بن امیہ جنھوں نے محمد بن یوسف کو ۱۱ رکعات بیان کرنے پر ٹوکا تھا، انھوں نے بھی یزید بن خصیفہ کو ''حسبت'' اور ''اکیس رکعات'' کہنے پر نہیں ٹوکا۔''[2]

اللہ کے بندے! جو شخص خود ہی ''حسبت'' کی زبان میں بات کر رہا ہے بھلا اسے ٹوکنے کی کیا ضرورت ہے؟

نیز اسماعیل بن امیہ ان کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر ان کی روایت نہیں سماعت فرما رہے تھے کہ انھیں ٹوکتے، بلکہ ان کے متعلق ایک بات سنی تھی وہی ان سے پوچھنے گئے تھے، جس کے جواب میں ان کے پاس جو کچھ تھا وہ ''حسبت'' کے لباس میں

---

[1] ماحصل از الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۷۷۔۸۱)

[2] الاجماع (شمارہ: ۱، ص: ۷۷۔۸۱)

باہر آیا، اب بھلا اس میں ٹوکنے کی حاجت ہی کیا ہے؟

یادرہے کہ ماقبل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اسماعیل بن امیہ نے اپنے استاذ محمد بن یوسف کو بھی غلطی پر نہیں ٹوکا تھا، بلکہ محض استفسار کے لہجے میں سوال کیا تھا۔

مضمون نگار نے دوسرے طرق سے یزید بن خصیفہ کی روایت کا حوالہ دے کر یہ بتایا ہے کہ یزید بن خصیفہ نے بھی دوسرے مواقع پر بغیر شک کے بیان کیا ہے۔ عرض ہے کہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ یزید بن خصیفہ یا محمد بن یوسف روایت بیان کرتے وقت شک کا اظہار کرتے تھے، بلکہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کی بیان کردہ تعداد کے بارے میں جب دونوں سے سوال ہوا تو ان دونوں میں سے صرف یزید بن خصیفہ نے اپنی بیان کردہ تعداد پر شک کا اظہار کیا، جب کہ محمد بن یوسف نے سوال کرنے پر بھی کسی طرح کے شک وشبہہ کا اظہار نہیں کیا، اس لیے محمد بن یوسف کی بات ہی معتبر ہے۔

بعض نے لکھا ہے:

> ’’اصل بات تو یہ ہے کہ ابن خصیفہ خود کوئی حدیث بیان نہیں کر رہے تھے، بلکہ جب ابن امیہ نے محمد بن یوسف سے ۱۱ رکعت والی حدیث ان کو بتائی اور سوال کیا تو انھوں نے محمد بن یوسف کے بارے میں گمان لگایا اور کہا: ’’حسبت أن السائب قال:إحدى وعشرين‘‘ ’’میرا خیال ہے کے سائب (رضی اللہ عنہ) نے (ابن یوسف سے) فرمایا: ۲۱ رکعت۔‘‘

عرض ہے کہ یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ یزید بن خصیفہ نے حدیث بیان کرتے وقت شک کا اظہار کیا ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ جب اس بارے میں یزید بن خصیفہ سے سوال ہوا تو انھوں نے یقین کے ساتھ جواب نہیں دیا، بلکہ شک کے ساتھ جواب

دیا۔ ان کا اس موقع پر شک کے ساتھ جواب دینے ہی کو دلیل بناتے ہوئے اہلِ حدیث کہتے ہیں کہ یزید بن خصیفہ کو اپنی بیان کردہ تعداد پر پوری طرح سے وثوق نہیں تھا۔ جب کہ محمد بن یوسف سے بھی رکعات کے بارے میں سوال ہوا، لیکن انھوں نے جواب میں کسی شک کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ پورے وثوق کے ساتھ گیارہ رکعات کی تعداد بتلائی ہے۔

بالفاظِ دیگر یہ کہہ لیں کہ احادیث بیان کرتے وقت دونوں میں سے کسی نے شک کا اظہار نہیں کیا، لیکن جب تعدادِ رکعات کے بارے میں دونوں سے سوال ہوا تو ان دونوں میں صرف یزید بن خصیفہ نے شک کا اظہار کیا، جب کہ محمد بن یوسف نے کسی شک کا اظہار نہیں کیا، بلکہ پورے وثوق و یقین اور اعتماد سے گیارہ رکعات ہی کی تعداد بتلائی ہے۔ اس لیے یہ بھی ایک وجہ ہے جس کی بنا پر محمد بن یوسف کے مقابلے میں یزید بن خصیفہ کا بیان نا قابلِ اعتبار ہے۔

کیا اسماعیل نے یزید بن خصیفہ کے جواب سے محمد بن یوسف کو آگاہ کیا؟

تحریف کرنے والوں نے یہ کہانی بھی بنائی ہے کہ اسماعیل نے جب یزید بن خصیفہ سے سوال کیا اور ان کا جواب معلوم کیا تو واپس آکر محمد بن یوسف کو بھی اس سے آگاہ کیا۔

اس من گھڑت کہانی کا روایت کے اندر دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ہے، بلکہ ماقبل میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ اسماعیل بن امیہ بعد میں جب اپنے شاگردوں کو یہ روایت سناتے تو روایت کے بعد آخر میں اپنے دونوں استاذوں سے اپنے سوال و جواب کا بھی ذکر کرتے۔ لیکن یہ بات کسی جھوٹی روایت میں بھی نہیں ہے کہ اسماعیل بن امیہ نے یزید بن خصیفہ سے کیے گئے سوال و جواب کا تذکرہ بعد

میں محمد بن یوسف سے کیا تھا۔

بھلا محمد بن یوسف کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیوں کہ انھیں تو پہلے سے معلوم ہے کہ یزید بن خصیفہ اس روایت میں غلطی کر کے اکیس کی تعداد بیان کرتے ہیں، بلکہ محمد بن یوسف کا یہ بیان سن کر ہی ان کے شاگرد اسماعیل، یزید بن خصیفہ کے پاس گئے تھے۔

دراصل یہ کہانی اس لیے بنائی گئی ہے تا کہ محمد بن یوسف کے رجوع والی بات گھڑی جا سکے جس کی وضاحت آگے ملاحظہ کریں۔

کیا محمد بن یوسف نے اپنی بیان کردہ تعداد سے رجوع کر لیا تھا؟

اسماعیل بن امیہ جب اس روایت کو بیان کرتے تو اپنے استاد محمد بن یوسف کے جواب کے بیچ میں بطور جملہ معترضہ، یزید بن خصیفہ سے اپنی پوچھ تاچھ بھی بتاتے تھے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

تحریف کرنے والوں نے اس روایت میں لفظی تحریف یہ کی ہے کہ محمد بن یوسف کے جواب کے آخری ٹکڑے کو ابتدائی حصے سے لفظاً اور معناً بالکل الگ کر دیا، چنانچہ محمد بن یوسف کے جواب کا آخری ٹکڑا استفہام انکاری (سوال انکاری) کی شکل میں یہ تھا:

"أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟" "کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟"

یہاں "أَوَ" واؤ کے زبر کے ساتھ ہے جو استفہام (سوال) کے لیے آتا ہے۔ جیسے قرآن میں درجنوں مقامات پر ہے:

﴿اَوَ لَمۡ یَرَوۡا﴾ [الرعد: ۴۱] "کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں ....؟"

یہاں اس کے ذریعے جو استفہام (سوال) ہے وہ انکاری سوال ہے، جسے عربی میں استفہام انکاری کہا جاتا ہے۔ یعنی محمد بن یوسف بیس رکعات والی بات کی

سختی سے تردید کرنے کے لیے فرما رہے ہیں کہ ''کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟'' یعنی میں نے ایسا ہرگز بیان نہیں کیا ہے۔

یہاں مقصود کوئی سوال پوچھنا نہیں ہے، بلکہ سوال کے انداز میں ایک چیز کا سختی سے انکار کرنا مقصود ہے۔ ہم لوگ بھی اردو زبان میں اس طرح کے ''انکاری سوال'' کا استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ بات بالکل عام فہم ہے۔

لیکن ''الاجماع'' کے مضمون نگار کا مبلغِ علم دیکھیے۔ فرماتے ہیں:

''اگر یہ ''أَوَ'' ہو تو اس صورت میں یہ سوال کے لیے ہوتا ہے .... اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاں سوال ہو گا وہاں یقین نہیں ہو گا، اس لیے کہ سوال ہوتا ہی وہاں ہے جہاں شک ہو، یقینی بات معلوم نہ ہو۔ اگر کوئی بات یقینی طور پر معلوم ہو تو وہاں سوال کے کیا معنی؟''[1]

اس بے تکی بات پر مضمون نگار کو اتنا ناز تھا کہ اسے بولڈ کر کے لکھا ہے۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ سوال کی ایک قسم سوال انکاری بھی ہے، جسے استفہام انکاری کہا جاتا ہے، اور اس طرح کے سوال کے انداز میں پورے یقین کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔ یہاں سوال کی جو نوعیت ہے وہ سوال انکاری یعنی استفہام انکاری ہے، نہ کہ کسی طرح کا استفسار یا اضافہ علم کے لیے کوئی سوال ہے۔ مضمون نگار سے گذارش ہے کہ ذرا وقت نکال کر عربی قواعد کی کتابوں میں ''استفہام انکاری'' کی بحث پڑھ لیجیے۔

افسوس ہے کہ مضمون نگار نے سوال کی مذکورہ بالا بے تکی تشریح کرنے کے بعد اسی کے بل بوتے پر یہاں ''أَوَ'' کے سوالیہ ہونے سے انکار کیا اور لفظی تحریف کرتے ہوئے یہاں ''أَوَ'' کو واؤ پر زبر پڑھنے کے بجائے ساکن پڑھا، پھر اسے ''بل''

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱، ص:۸۲)

(بلکہ) کے معنی میں لے لیا، حالانکہ یہاں اس معنی کا سابقہ کسی بھی جملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔خود ''الاجماع'' کے مضمون نگار نے لکھا ہے:

''اور کہاں پر یہ ''أَوَ''اور کہاں پر ''أَوْ'' پڑھنا ہے، اس کو آگے پیچھے کا سیٹنیس (جملہ) دیکھ کر معلوم کیا جاتا ہے۔''[1]

عرض ہے کہ آگے اور پیچھے کے تمام الفاظ کے ساتھ محمد بن یوسف کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

قال: لقد سمع ذلك من السائب بن يزيد، ابنُ خصيفة، أَوَ قلت: لإحدى وعشرين؟''[2]

''محمد بن یوسف نے کہا: اس طرح کی بات یزید بن خصیفہ نے ہی سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے سنی ہے، کیا میں نے اکیس رکعات کہا؟''

واضح رہے کہ اس جواب کے بیچ میں جملہ معترضہ کے طور پر اسماعیل بن امیہ نے جو بات بیان کی ہے وہ محمد بن یوسف کی نہیں ہے، جب کہ ''أَوَ'' یہ محمد بن یوسف کا کلام ہے، اس لیے اس کو صرف محمد بن یوسف ہی کے کلام سے جوڑ کر دیکھا جائے گا۔ اس بنا پر محمد بن یوسف کا پورا کلام حاضر ہے، کوئی بھی عقل مند انسان اسے ایک نظر ہی دیکھ کر بتا دے گا کہ یہاں ''أَوَ'' استفہام انکاری ہے، یعنی محمد بن یوسف اکیس کی تعداد بیان کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

اس کے برخلاف اگر یہاں ''أَوَ'' کو ''أَوْ'' پڑھیں تو ماقبل اور مابعد کا کوئی بھی لفظ اس مفہوم کا ساتھ نہیں دے گا، اسی لیے مضمون نگار کو یہ کہانی بنانی پڑی کہ اسماعیل

---

[1] الاجماع (شمارہ:١،ص:٨٢)

[2] فوائد أبي بكر النيسابوري (ق١٣٥/ب)

بن امیہ نے واپس آ کر محمد بن یوسف کو یزید بن خصیفہ کا جواب بتایا تو انھوں نے رجوع کیا، جب کہ اس بات کے لیے اس روایت میں ایک حرف بھی موجود نہیں ہے۔

اسی طرح "لإحدى وعشرين" میں ''لام'' کو زیر کے ساتھ پڑھنے کے بجائے زبر کے ساتھ پڑھا گیا اور اسے لام تاکید بتلایا گیا ہے، حالانکہ یہاں اگر لام تاکید ہوتا تو ''عشرین'' کو ''عشرون'' ہونا چاہیے، کیوں کہ لام تاکید جر کا عمل نہیں کرتا ہے، لیکن مخطوطہ میں ''عشرین'' مجرور ہے۔ یہ زبردست دلیل ہے کہ یہاں لام تاکید ہرگز نہیں ہے۔

''الاجماع'' کے مضمون نگار کی ڈھٹائی بھی قابلِ دید ہے، ایک تو خود لام جارہ کو لام تاکید پڑھ لیا، پھر اس چوری پر سینہ زوری دیکھیں، فرماتے ہیں:

''اس طرح کے ترجمہ سے بچنے کے لیے کفایت اللہ صاحب نے لام تاکید کا ترجمہ ہی اڑا دیا۔''[1]

محترم! پہلے یہاں لام تاکید کا وجود تو ثابت کیجیے! ترجمہ کا مطالبہ بعد میں کرنا!

مضمون نگار نے ایک سوال بار بار کیا ہے کہ علامہ البانی نے اور ناچیز نے پہلے جب یہ روایت نقل کی تھی تو اس جملے کو کیوں نقل نہیں کیا تھا؟

محترم اس کی وجہ صاف ہے کہ ہمارا مقصود صرف یہ تھا کہ محمد بن یوسف کی روایت اور ان کا موقف بتلائیں اور اس کے لیے صرف اتنا حصہ ہی کافی تھا جتنا ہم نے نقل کیا۔

تنبیہ: ''الاجماع'' کے مضمون نگار نے محمد بن یوسف کی طرف باطل طور پر رجوع کی بات منسوب کرنے کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ دکتور کمال نے بھی یہی بات کہی ہے کہ محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد بیان کرنے سے رجوع کر لیا ہے۔

حالانکہ دکتور قالمی پر یہ صریح بہتان ہے، انھوں نے ہرگز ایسی کوئی بات نہیں

---

[1] الاجماع (شمارہ:۱، ص:۸۳)

کہی ہے، البتہ انھوں نے صرف یہ احتمال پیش کیا تھا کہ ہوسکتا ہے محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد بتانے میں یزید بن خصیفہ کو اپنا ہم نوا ظاہر کیا ہو، لیکن اس احتمال کو بھی انھوں نے آگے خود ہی مرجوح قرار دے دیا ہے اور دوسرے احتمال کے بارے میں "وهذا أظهر" کہہ کر اسے ہی ترجیح دی ہے۔

الغرض محمد بن یوسف کا یہ جملہ ان کے مکمل جواب کا آخری حصہ ہے اور اس میں رجوع کی بات تو درکنار، سختی سے اکیس رکعات کی تعداد کا انکار ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیجیے کہ محمد بن یوسف سے امام مالک سمیت چھے ثقہ شاگردوں نے صحیح سند سے گیارہ رکعات ہی نقل کی، بلکہ ایک اور شاگرد ابن اسحاق نے بھی معنوی طور پر یہی نقل کیا ہے۔ یہ ساری روایات پیش کی جا چکی ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ محمد بن یوسف کی طرف رجوع کی نسبت محض ایک افترا اور بہتان ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ اس روایت میں محمد بن یوسف نے گیارہ کی تعداد بیان کی ہے اور پورے وثوق کے ساتھ بیان کی ہے اور ساتھ ہی یزید بن خصیفہ کی بیان کردہ تعداد کی تردید بھی کر دی ہے، اور خود یزید بن خصیفہ بھی اپنی بیان کردہ تعداد پر اطمینان کا اظہار نہیں کر سکے۔ لہٰذا محمد بن یوسف کی گیارہ کی تعداد والی روایت اعلیٰ درجے کی صحیح روایت ہے۔ والحمد للہ



کیا باجماعت نمازِ تراویح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے؟

ماہِ رمضان میں اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ تراویح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایجاد کی ہے اور اسی پر بس نہیں، بلکہ بعض لوگ یہ بات کہہ کر اس سے بدعتِ حسنہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ جماعت کے ساتھ تراویح عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے اور سچائی یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ تراویح عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی ہوتی تھی، بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بھی جماعت کے ساتھ تراویح ہوتی تھی، بلکہ اس سے بھی قبل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی باجماعت تراویح ہوتی تھی۔

اس بات کی دلیل کہیں اور نہیں بلکہ عین اسی حدیث میں موجود ہے جسے پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ باجماعت تراویح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے۔ یہ بخاری کی حدیث ہے، آیئے پوری حدیث دیکھتے ہیں:

”عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدٍ القَارِيِّ، أَنَّهُ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رضي الله عنه لَيْلَةً فِي رَمَضَانَ إِلَى المَسْجِدِ، فَإِذَا النَّاسُ أَوْزَاعٌ مُتَفَرِّقُونَ، يُصَلِّي الرَّجُلُ لِنَفْسِهِ، وَيُصَلِّي الرَّجُلُ فَيُصَلِّي بِصَلَاتِهِ الرَّهْطُ، فَقَالَ عُمَرُ:

إِنِّيْ أَرَى لَوْ جَمَعْتُ هٰؤُلَاءِ عَلَى قَارِئٍ وَاحِدٍ لَكَانَ أَمْثَلَ، ثُمَّ عَزَمَ فَجَمَعَهُمْ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، ثُمَّ خَرَجْتُ مَعَهُ لَيْلَةً أُخْرَى، وَالنَّاسُ يُصَلُّونَ بِصَلَاةِ قَارِئِهِمْ، قَالَ عُمَرُ: نِعْمَ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ، وَالَّتِيْ يَنَامُوْنَ عَنْهَا أَفْضَلُ مِنَ الَّتِيْ يَقُوْمُوْنَ، يُرِيْدُ آخِرَ اللَّيْلِ وَكَانَ النَّاسُ يَقُومُونَ أَوَّلَهُ"[1]

''عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا: میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ رمضان کی ایک رات کو مسجد میں گیا۔ لوگ متفرق اور منتشر تھے، کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا تھا، اور کوئی اس طرح نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک جماعت نماز پڑھ رہی تھی۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ اگر میں تمام لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں تو زیادہ اچھا ہو گا، چنانچہ آپ نے یہی ٹھان کر اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ان کا امام بنا دیا۔ پھر ایک رات جو میں ان کے ساتھ نکلا تو دیکھا کہ لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز (تراویح) پڑھ رہے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نیا طریقہ بہتر اور مناسب ہے اور (رات کا) وہ حصہ جس میں یہ لوگ سو جاتے ہیں اس حصے سے بہتر اور افضل ہے جس میں یہ نماز پڑھتے ہیں۔ آپ کی مراد رات کے آخری حصے (کی فضیلت) سے تھی، کیوں کہ لوگ یہ نماز رات کے شروع ہی میں پڑھ لیتے تھے۔''

اس حدیث میں غور کیجیے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب پہلی رات عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کے ساتھ مسجد میں آئے تو مسجد میں یہ منظر دیکھا:

---

[1] صحيح البخاري (٤٥/٣) كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان (٢٠١٠)

"فَإِذَا النَّاسُ أَوْزَاعٌ مُتَفَرِّقُونَ، يُصَلِّي الرَّجُلُ لِنَفْسِهِ"

''لوگ متفرق اور منتشر تھے، کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا تھا۔''

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی رات مسجد میں یہ منظر بھی دیکھا:

"وَيُصَلِّي الرَّجُلُ فَيُصَلِّي بِصَلَاتِهِ الرَّهْطُ"

''اور کوئی اس طرح نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک جماعت نماز پڑھ رہی تھی۔''

صحیح بخاری کی شرح کرنے والے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس جملے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَحَاصِلُهُ أَنَّ بَعْضَهُمْ كَانَ يُصَلِّي مُنْفَرِدًا وَبَعْضَهُمْ يُصَلِّي جَمَاعَةً" [1]

''اس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اکیلے نماز پڑھ رہے تھے اور بعض جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔''

غور کریں! بخاری کی اسی روایت میں صاف دلیل موجود ہے کہ لوگ شروع ہی سے جماعت کے ساتھ نماز تراویح پڑھ رہے تھے، یعنی اس رات مسجد میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آمد سے قبل ہی لوگ جماعت سے نمازِ تراویح پڑھ رہے تھے اور لوگوں کا یہی عمل عہدِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بھی تھا، بلکہ عہدِ رسالت سے ہی یہ عمل جاری تھا۔

ایسی صورت میں یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ باجماعت نمازِ تراویح عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے؟

اب رہا سوال یہ کہ پھر اس رات عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا تھا وہ کیا تھا؟

---

[1] فتح الباري لابن حجر (٢٥٢/٤)

تو عرض ہے کہ اس رات عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ تھا کہ جو لوگ اکیلے اکیلے نماز پڑھ رہے ہیں انھیں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے، یعنی مسجد میں باجماعت نماز کی شکل باقی رکھی جائے اور جو لوگ اکیلے اکیلے نماز پڑھ رہے ہیں ان سب کو پابند کیا جائے کہ وہ بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔

چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم صادر کر دیا کہ سب لوگ جماعت میں شامل ہو کر ایک ہی امام کے ساتھ اکٹھے ہو کر نماز پڑھیں۔

یہ ہے تراویح سے متعلق عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کی حقیقت، جس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ جماعت سے تراویح کی نماز عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایجاد کی ہے، بلکہ اس کے برعکس اس میں اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ جماعت کے ساتھ تراویح شروع ہی سے ہو رہی تھی اور یہ سلسلہ عہدِ رسالت ہی سے چلا آ رہا تھا۔

واضح رہے کہ بعض احادیث میں جو یہ منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رات جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی اس کے بعد آپ نے تراویح کی امامت نہیں کروائی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے قبل یا اس کے بعد جماعت سے تراویح کا کوئی ثبوت ہی نہیں تھا، بلکہ کئی احادیث سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان تین راتوں کے علاوہ بھی صحابہ کرام جماعت کے ساتھ تراویح پڑھتے تھے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمایا تھا۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

”أخبرنا أبو يعلىٰ، قال: حدثنا عبد الأعلىٰ بن حماد النرسي، قال: حدثنا يعقوب القمي، قال: حدثنا عيسى بن جارية، قال: حدثنا جابر بن عبد الله، قال: جاء أبي بن

كعب إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! كان مني الليلة شيء في رمضان، قال: وما ذاك يا أبي؟ قال: نسوة في داري قلن: إنا لا نقرأ القرآن، فنصلي بصلاتك، قال: فصليت بهن ثماني ركعات، ثم أوترت، قال: فكان شبه الرضا، ولم يقل شيئا"[1]

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اللہ کے نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! گذشتہ رات رمضان میں مجھ سے ایک چیز سرزد ہوئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: اے اُبی! وہ کیا چیز ہے؟ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے گھر میں خواتین نے مجھ سے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتیں، لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ کی اقتدا میں نماز پڑھیں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے انھیں آٹھ رکعات تراویح جماعت سے پڑھائی پھر وتر پڑھایا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اسے منظور فرمایا اوراس پر کوئی نکیر نہ کی۔''

یہ واقعہ ان تین راتوں کا نہیں ہے جن میں اللہ کے نبی ﷺ نے باجماعت نمازِ تراویح پڑھائی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت میں ہی جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے پر صحابہ کرام کا عمل تھا اور اسے اللہ کے نبی ﷺ کی منظوری حاصل تھی۔

بلکہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے پر عمل پیرا تھے، چنانچہ امام ابوداود رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح ابن حبان (الإحسان: ٦/٢٩٠) رقم (٢٥٤٩) وإسناده صحيح.

"حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ سَعِيدٍ الْهَمْدَانِيُّ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي مُسْلِمُ بْنُ خَالِدٍ، عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَإِذَا أُنَاسٌ فِي رَمَضَانَ يُصَلُّونَ فِي نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ، فَقَالَ: مَا هَؤُلَاءِ؟، فَقِيلَ: هَؤُلَاءِ نَاسٌ لَيْسَ مَعَهُمْ قُرْآنٌ، وَأُبَيُّ ابْنُ كَعْبٍ يُصَلِّي، وَهُمْ يُصَلُّونَ بِصَلَاتِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَصَابُوا، وَنِعْمَ مَا صَنَعُوا" [1]

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دیکھا کہ لوگ رمضان میں مسجد کی ایک جانب میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہا گیا کہ ان لوگوں کو قرآن یاد نہیں ہے اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے ہیں تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انھوں نے درست کیا اور بہت خوب کیا۔"

یہ واقعہ بھی ان تین راتوں کا نہیں ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت نمازِ تراویح پڑھائی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت میں باجماعت تراویح پر صحابہ کرام کا عمل تھا اور یہ عمل عہدِ رسالت کے بعد عہدِ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور تک بھی جاری تھا جیسا کہ بخاری کی حدیث سے واضح کیا جا چکا ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باجماعت تراویح کی بنیاد ڈالی۔

البتہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو حکم صادر کیا تھا اس میں خاص بات یہ تھی کہ آپ

[1] سنن أبي داود (۲/۵۰، رقم: ۱۳۷۷) وهو حسن

نے مسجد میں فرداً فرداً تراویح پڑھنے سے منع کیا تھا اور مسجد میں صرف جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا، اور یہ طریقہ بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اپنا ایجاد کردہ نہیں تھا بلکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے صرف جاری کیا تھا اور طریقہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ چنانچہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رات تراویح کی جماعت اس طرح کرائی تھی کہ ان تین راتوں میں سب کے سب جماعت میں شریک تھے اور اکیلے پڑھنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اگلے دن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر یہ عمل روک دیا کہ کہیں یہ نماز فرض نہ ہو جائے۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین مکمل ہو گیا اور اب اس نماز کے فرض ہونے کا امکان نہیں تھا، اس لیے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقے کو جاری کر دیا، کیوں کہ اس کے بند کرنے کی جو وجہ تھی وہ اب باقی نہیں رہ گئی تھی۔

الغرض عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو طریقہ جاری کیا تھا وہ ان کا اپنا ایجاد کردہ نہیں تھا بلکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ تھا۔

یہاں ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر یہ طریقہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اپنا ایجاد کردہ نہیں تھا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے ”نِعْمَ الْبِدْعَةُ هَذِهِ“ ”یعنی یہ نیا طریقہ بہت اچھا ہے“ کیوں کہا؟

تو عرض ہے کہ یہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ”بدعت“ کا لفظ شرعی و اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کیا، بلکہ لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ دراصل شریعت میں ”بدعت“ اس طریقے کو کہتے ہیں جو ایجاد کے اعتبار سے نیا ہو نہ کہ عمل کے اعتبار سے۔ یعنی کسی طریقے کی ایجاد عہدِ رسالت کے بعد ہوئی ہے تو وہی طریقہ شریعت میں ”بدعت“ قرار پائے گا، لیکن اگر کسی طریقے کی ایجاد عہدِ رسالت میں ہی ہوئی ہو، لیکن اس پر عمل بعد

میں شروع ہوا تو اس طریقے کو شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' نہیں کہیں گے، کیوں کہ یہ عمل ایجاد کے اعتبار سے نیا نہیں، بلکہ صرف عمل کے اعتبار سے نیا ہے۔ لیکن لغت میں بدعت ہر طرح کی نئی چیز کو کہتے ہیں، یعنی لغت کے اعتبار سے ہر نئے طریقے کو بدعت کہہ سکتے ہیں خواہ وہ ایجاد کے اعتبار سے نیا ہو یا عمل کے اعتبار سے۔

اس کو مثال سے یوں سمجھیں کہ مغرب سے قبل دو رکعت سنت پڑھنے کا طریقہ نبی ﷺ کے دور کا طریقہ ہے اور آج کے دور میں بہت ساری مساجد میں اس طریقے پر عمل نہیں ہو رہا۔ اب اگر کوئی شخص ایسی کسی مسجد میں اس طریقے پر عمل جاری کرا دے تو یہ طریقہ عمل کے اعتبار سے نیا ہوگا، اس لیے لغوی اعتبار سے اسے ''بدعت'' یعنی نیا طریقہ کہہ سکتے ہیں، لیکن ایجاد کے اعتبار سے یہ نیا نہیں ہے، اس لیے شرعی اعتبار سے اسے ''بدعت'' نہیں کہہ سکتے۔

دوسری مثال یوں سمجھیں کہ کسی کمپنی ایریا میں یا راستے میں کوئی ایسی مسجد ہو جہاں فجر کے علاوہ بقیہ صرف چار وقت کی نماز ہوتی ہے اور فجر کی نماز نہیں ہوتی، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس مسجد کے آس پاس مسلمان آباد ہو جائیں اور اس مسجد میں فجر کی نماز بھی شروع کر دیں تو یہ طریقہ اس مسجد میں نیا طریقہ ہوگا اور لغوی اعتبار سے اسے ''بدعت'' یعنی نیا طریقہ کہہ سکتے ہیں، لیکن شرعی اعتبار سے اسے ''بدعت'' نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ یہ طریقہ ایجاد کے اعتبار سے نیا نہیں ہے، بلکہ صرف عمل کے اعتبار سے نیا ہے۔

ٹھیک اسی طرح کا معاملہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے جاری کردہ طریقے کا ہے۔ یہ طریقہ عمل کے اعتبار سے نیا تھا، اس لیے لغوی اعتبار سے اسے ''بدعت'' یعنی نیا طریقہ کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا، لیکن شرعی اعتبار سے اس طریقے کو ''بدعت'' نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ یہ طریقہ ایجاد کے اعتبار سے نیا نہیں ہے، بلکہ

صرف عمل کے اعتبار سے نیا ہے، کیوں کہ اس کی ایجاد عہدِ رسالت میں ہوئی ہے جیسا کہ ماقبل میں تفصیل پیش کی گئی ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بدعتِ حسنہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں، حالانکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بدعتِ حسنہ کی تائید نہیں، بلکہ تردید ہوتی ہے۔

غور کریں کہ ایک طریقے پر عمل کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے روک دیا تھا کہ کہیں اس میں اضافہ نہ ہو جائے، یعنی یہ فرض نہ ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، اس حقیقت پر ایمان ہی کی وجہ سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس طریقے کو جاری کر دیا، کیوں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اعتقاد تھا کہ عہدِ رسالت کے بعد دین میں اب نئی چیز کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے اس نبوی طریقے میں بھی اب کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا اسے جاری کرنے میں دین میں نئی چیز کے اضافے کی گنجایش نہیں ہے۔

گویا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے میں یہ اعلان موجود ہے کہ دین میں اب کسی نئی چیز کی گنجایش نہیں ہے، لیکن افسوس کہ عین اس کے برعکس عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسی فیصلے سے بدعتِ حسنہ کے جواز پر استدلال کیا جا رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں: تفسیر القول بما لا یرضی به قائله.



باب 3

آٹھ رکعاتِ تراویح اور اہلِ علم کا موقف

آٹھ رکعاتِ تراویح اور اجماعِ امت:

بعض حضرات عوام کو یہ بتاتے ہیں کہ بیس رکعات ہی تراویح ہے اور اسی پر سب کا اجماع ہے۔ پھر وہ بعض اہلِ علم کے اقوال یا اعمال پیش کرتے ہیں، حالانکہ امت میں اگر کسی نے بیس پر عمل کیا ہے یا اسے درست جانا ہے تو بھی اس نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ تعداد سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے، بلکہ بعض نے عام نفل سمجھ کر اور بعض سلف سے منقول ہونے کے سبب اختیار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سب نے بیس پر اتفاق نہیں کیا، بلکہ بعض نے سنت کے مطابق گیارہ رکعت ہی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے بیس سے بھی زائد تعداد اختیار کی ہے۔

لیکن اجماعی طور پر نہ تو امت نے کبھی بیس کی تعداد پر اتفاق کیا ہے اور نہ اسے مسنون کہا ہے، البتہ اس کے برعکس گیارہ رکعات پر عہدِ صحابہ میں قولاً وعملاً ہر طرح سے اتفاق واجماع رہا ہے۔

چنانچہ ماقبل میں گزر چکا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعات پڑھنے کا حکم دیا اور کسی ایک بھی صحابی نے اس کی مخالفت نہ کی، اسی طرح عملاً بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق صحابہ کرام نے گیارہ رکعات ہی تراویح پڑھی اور اسی پر عمل کیا، اس

کے خلاف قولاً یا عملاً کسی ایک بھی صحابی سے کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ صحابہ کا گیارہ رکعات تراویح پر قولاً وعملاً اجماع ہو گیا تھا اور اس سے زائد پڑھنے کی شروعات بعد میں ہوئی ہے۔

آٹھ رکعاتِ تراویح اور اقوالِ اہلِ علم

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا موقف:

شروع میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپ نے قیامِ رمضان یعنی تراویح سے متعلق سوال کرنے پر فرمایا کہ رمضان ہو یا غیر رمضان آپ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

اس روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اکثر تعداد کو حصر کے ساتھ بیان کرنا، گویا ان کی طرف سے یہ کہنا ہے کہ تراویح ہو یا عام دنوں میں رات کی نماز اس میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھنی چاہیے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا موقف:

موطا کی صحیح روایت گزر چکی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعات پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ یہ صریح دلیل ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ گیارہ رکعاتِ تراویح ہی کے قائل تھے۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف:

عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں جب گیارہ رکعات کا حکم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا تو کسی ایک بھی صحابی نے اس کی مخالفت نہ کی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام صحابہ اسی تعداد پر عمل پیرا تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا موقف:

امام اشہب بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۰۴) اپنے استاذ امام مالک سے نقل کرتے ہیں:

"الذي آخذ به لنفسي في قيام رمضان هو الذي جمع عمر ابن الخطاب عليه الناس إحدى عشرة وهي صلاة رسول الله ﷺ ولا أدري من أحدث هذا الركوع الكثير" [2]

''میں اپنے لیے رمضان میں رکعاتِ تراویح کی جو تعداد پسند کرتا ہوں وہ وہی تعداد ہے جس پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب کو جمع کیا تھا اور وہ گیارہ رکعات کی تعداد ہے، اس تعداد میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ نماز پڑھی ہے، اور میں نہیں جانتا کہ اتنی ساری رکعات (جن پر اہلِ مدینہ کا عمل ہے) وہ کس نے ایجاد کی ہے!!''

اس قول کو امام مالک سے ان کے شاگرد امام اشہب بن عبدالعزیز (المتوفی: ۲۰۴) نے نقل کیا ہے جو امام مالک کے زبردست ثقہ شاگرد اور صاحبِ تصنیفات ہیں، پھر ان کے حوالے سے یہ قول ابن مغیث نے ذکر کیا ہے اور یہ بھی صاحبِ تصنیف ہیں اور ابن مغیث کے حوالے سے عبدالحق الاشبیلی (المتوفی: ۵۸۱ھ) نے ذکر کیا ہے۔امام مالک کے ایک دوسرے شاگر ابن القاسم نے بھی امام مالک سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ كما سيأتي

ایک اعتراض کا جواب:

امام سیوطی نے امام جوری کے حوالے سے بھی امام مالک کا یہی قول نقل کر دیا

---

[1] الصلاة والتهجد،ت عادل (ص: ۲۸۷)

تو بعض مسلک پرستوں نے اس کے خلاف ابن القاسم کی روایت پیش کی کہ انھوں نے امام مالک سے یہ نقل کیا ہے:

"قال مالك: بعث إلي الأمير وأراد أن ينقص من قيام رمضان الذي كان يقومه الناس بالمدينة ـقال ابن القاسم: وهو تسعة وثلاثون ركعة بالوتر، ست وثلاثون ركعة، والوتر ثلاث۔ قال مالك: فنهيته أن ينقص من ذلك شيئا، وقلت له: هذا ما أدركت الناس عليه وهذا الأمر القديم الذي لم يزل الناس عليه"[1]

''امام مالک نے کہا کہ امیر نے میرے پاس یہ پیغام بھیجا کہ مدینہ میں لوگ جس تعدادِ رکعات پر عامل ہیں اس میں وہ کمی کروانا چاہتے ہیں۔ ابن القاسم کہتے ہیں یہ تعداد ۳۹ رکعات تھی، جن میں تین وتر تھی امام مالک نے کہا: میں نے اس میں کچھ بھی کمی کروانے سے منع کر دیا اور کہا: میں نے ان لوگوں کو ایسے ہی پڑھتے ہوئے پایا ہے اور یہ بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے، جس پر یہ لوگ جمع ہیں۔''

اس کے جواب میں حافظ زبیر علی زئی صاحب نے خواہ مخواہ امام مالک سے ابن القاسم کی روایات ہی کو مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔[2] حالانکہ موصوف اگر متن پر غور کر لیتے تو امام مالک سے ابن القاسم کے نقل کردہ اقوال کے انکار کا تکلف نہ کرتے۔

دراصل ابن القاسم نے جو امام مالک سے نقل کیا ہے، اس میں دور دور تک

---

[1] المدونة (۲۸۷/۱)

[2] قیامِ رمضان (ص: ۴۵، ایضاً ۴۶، ایضاً ۸۵)

اس بات کا نام ونشان نہیں ہے کہ امام مالک بھی اس تعداد کے قائل تھے، اس میں صرف یہ ہے کہ اس وقت اہلِ مدینہ کا عمل ۳۹ رکعات پر تھا اور وہاں کے امیر نے جبراً اسے کم کروانا چاہا، لیکن امام مالک نے منع فرما دیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے زیادہ پڑھنے والوں سے تعرض کرنا اور جبراً انھیں کم پڑھنے پر مجبور کرنا پسند نہیں فرمایا، لیکن خود امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے لیے سنتِ رسول اور سنتِ صحابہ والی تعداد ہی اختیار کی۔

یہی وجہ ہے کہ جن شاگردوں نے بھی امام مالک سے گیارہ کی تعداد نقل کی انھوں نے صراحت کی ہے کہ یہ تعداد امام مالک رحمہ اللہ نے خاص اپنے لیے اختیار کی تھی، جیسا کہ اوپر کے حوالے کے الفاظ ہیں: ''الذي آخذ به لنفسي'' یعنی امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو تعداد میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔

علامہ عینی نے بھی جب گیارہ رکعت کو امام مالک کا موقف بتلایا تو ان الفاظ میں ذکر کیا: ''وهو اختيار مالك لنفسه''

''اور امام مالک نے خود کے لیے یہی تعداد اختیار کی ہے۔''[1]

بلکہ غور کریں تو ابن القاسم کی یہ روایت بھی اشارہ کر رہی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سنت سے زائد رکعات پسند نہیں فرماتے، کیوں کہ امیر نے زائد رکعات کو کم کرنے کے لیے ان سے بات چیت کی جس سے اشارہ ملتا ہے کہ امیر کو امام مالک کا موقف پتا تھا اور امیر کی خواہش یہ تھی کہ جس طرح امام مالک نے اپنے لیے سنت کو اختیار کیا ہے، اسی طرح سب کو اس کا پابند بنا دیا جائے، لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے ایک زمانے سے جاری اس عمل کے خلاف سرکاری اقدام کرنے سے روک دیا، تا کہ اس

---

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١١/١٢٧)

سے کسی طرح کا فتنہ کھڑا نہ ہو۔

امام مالک سے ان کے شاگرد ابن القاسم نے بھی گیارہ کی تعداد نقل کی ہے:

ہم نے اوپر امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد امام ابن اشہب اور امام ابن القاسم کے بیانات میں جو تطبیق دی ہے، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ خود ابن القاسم رحمہ اللہ نے بھی امام مالک سے گیارہ کی تعداد نقل کی ہے، بلکہ عین وہی بات کہی ہے جو ہم نے مذکورہ تطبیق میں پیش کی ہے، چنانچہ عبدالحق الاشبیلی، ابن القاسم سے ہی نقل کرتے ہیں:

"وقال ابن القاسم: كره مالك أن ينقص الناس من عدد الركوع الذي جرى به العمل في مسجد رسول الله ﷺ وهو تسع وثلاثون ركعة بالوتر، والوتر ثلاث، واختار هو لنفسه إحدى عشرة ركعة"[1]

"ابن القاسم نے کہا: امام مالک نے اس بات کو ناپسند کیا کہ مسجدِ نبوی میں جس تعداد پر لوگوں کا عمل تھا اسے کم کروائیں اور یہ تعداد ۳۹ رکعات تھیں، جن میں تین وتر تھی، لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے خود اپنے لیے گیارہ رکعات ہی کو اختیار کیا۔"

ملاحظہ فرمائیں کہ اس حوالے سے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف:

امام بخاری رحمہ اللہ نے صلاۃ التراویح کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعات والی حدیث ذکر کی ہے اور اس ضمن بیس رکعات والی کوئی روایت تعلیقاً بھی ذکر نہیں کی نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے، جس کا سوائے اس کے کوئی مطلب

[1] الصلاة والتهجد، ت عادل (ص: ٢٨٧)

نہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ گیارہ رکعاتِ تراویح ہی کے قائل ہیں۔

امام ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ لکھتے ہیں:

"والصحيح أن يصلى إحدى عشر ركعة صلاة النبي عليه السلام وقيامة، فأما غير ذلك من الأعداد فلا أصل له" [1]

"صحیح یہ ہے کہ گیارہ رکعات پڑھی جائیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ پڑھتے تھے اور قیام کرتے تھے، اس کے علاوہ جو دوسری تعداد ہیں، ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔"

امام ابو العباس احمد بن عمر القرطبی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ لکھتے ہیں:

"وقال كثير من أهل العلم: إحدى عشرة ركعة، أخذا بحديث عائشة رضي الله عنها المتقدم" [2]

"اور بہت سے اہلِ علم نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کی بنا پر کہا ہے کہ (تراویح کی) گیارہ رکعات ہیں۔"

آٹھ رکعات تراویح اور علمائے احناف کی شہادت

❁ امام محمد بن الحسن الشیبانی (المتوفی ۱۸۹ھ) نے باب قائم کیا ہے: "باب: قيام شهر رمضان وما فيه من الفضل" "یعنی ماہِ رمضان میں قیام کا بیان اور اس کے بارے فضائل۔" اس پر تعلیق میں علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

---

[1] عارضة الأحوذي (١٩/٤)

[2] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم (٣٩٠/٢)

"ویسمی التراویح"[1]

''اور اسے یعنی قیامِ رمضان کو تراویح کے نام سے جانا جاتا ہے۔''

اس باب کے تحت امام محمد بن حسن نے تراویح سے متعلق احادیث، مثلاً: گیارہ رکعات سے متعلق حدیثِ عائشہ پیش کی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"وبهذا كله نأخذ، لا بأس بالصلاة في شهر رمضان أن يصلي الناس تطوعا بإمام، لأن المسلمين قد أجمعوا على ذلك ورأوه حسنا"[2]

''ہم ان تمام باتوں کو قبول کرتے ہیں، ماہِ رمضان کی نماز (تراویح) میں کوئی حرج نہیں ہے کہ لوگ ایک امام کے ساتھ ادا کریں، کیوں کہ مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے اور اسے بہتر جانا ہے۔''

❁ علامہ کمال الدین المعروف بابن الہمام حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"فتحصل من هذا كله أن قيام رمضان سنة إحدى عشرة بالوتر في جماعة فعله عليه الصلاة والسلام"[3]

''ان باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ گیارہ رکعات وتر سمیت تراویح، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔''

❁ علامہ زین الدین المعروف بابن نجیم المصری (المتوفی ۹۷۰ھ) فرماتے ہیں:

"وقد ثبت أن ذلك كان إحدى عشرة ركعة بالوتر كما ثبت في الصحيحين من حديث عائشة"[4]

---

[1] التعليق المُمَجَّد للكنوي (۳۵۱/۱)

[2] موطأ محمد بن الحسن الشيباني (ص: ۹۱)

[3] فتح القدير شرح الهداية (٤٦٨/۱)

[4] البحر الرائق شرح كنز الدقائق (۷۲/۲)

’’اور بے شک ثابت ہے کہ وہ (تراویح کی مسنون رکعات) وتر سمیت گیارہ رکعات ہیں جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے۔‘‘

❁ ملا علی القاری رحمہ اللہ (المتوفی:۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

"فتحصل من هذا كله أن قيام رمضان سنة إحدى عشرة بالوتر في جماعة فعله عليه الصلاة والسلام"[1]

’’ان باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ گیارہ رکعات وتر سمیت تراویح، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔‘‘

❁ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی:۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں:

’’اب رہا رمضان المبارک میں قیامِ شب جسے تراویح کہتے ہیں، تو اس کا بیان ان شاء اللہ روزے کے باب میں آئے گا، اور تحقیق یہ ہے کہ رمضان المبارک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز آپ کی عادتِ شریفہ ہی کے مطابق تھی اور وہ گیارہ رکعتیں تھیں، جسے تہجد میں پڑھا کرتے تھے جیسا کہ معلوم ہوا۔‘‘[2]

❁ علامہ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی المصری الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۰۶۹ھ) فرماتے ہیں:

"وصلاتها بالجماعة سنة كفاية، لما ثبت أنه ﷺ صلى بالجماعة إحدى عشر ركعة بالوتر"[3]

---

[1] مرقاة المفاتيح للملا القاري (۹۷۳/۳)

[2] مدارج النبوة (۴۸۰/۱) ترجمہ: غلام معین الدین

[3] مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح (ص: ۱۵۷)

''اور اس (تراویح) نماز کو جماعت سے پڑھنا سنتِ کفایہ ہے، کیوں کہ اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے باجماعت وتر سمیت گیارہ رکعات پڑھیں۔''

❀ محدث شاہ ولی اللہ دہلوی (المتوفی: ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

''از فعل آنحضرت صلعم یازدہ رکعت ثابت شدہ در قیام رمضان۔''[1]

''آپ ﷺ کے فعل سے قیامِ رمضان (تراویح) میں گیارہ رکعات ثابت ہیں۔''

❀ علامہ طحطاوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۲۳۱) فرماتے ہیں:

''وقت ثبت أن ذلك كان إحدى عشرة ركعة بالوتر''[2]

''اور یہ بات ثابت ہے کہ وہ (تراویح کی مسنون رکعات) وتر سمیت گیارہ ہے۔''

❀ مولانا محمد قطب الدین خان دہلوی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۲۸۹ھ) لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ سے چونکہ گیارہ رکعتیں پڑھنی ثابت ہوئی ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک سے مشابہت کے قصد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض راتوں میں گیارہ رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔''[3]

نوٹ: بعض راتوں میں نہیں، بلکہ تمام راتوں میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہی حکم تھا، اس کے برخلاف عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کچھ ثابت نہیں ہے۔

❀ مولانا عبدالحی لکھنوی (المتوفی: ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں:

---

[1] مصفیٰ ومسویٰ شرح موطا (ص: ۱۷۵)

[2] حاشية الطحطاوي على الدر المختار (۲۹۵/۱)

[3] مظاہرِ حق (۸۲۱/۱)

"وأمّا العدد فروى ابن حبّان وغيره أنّه صلى بهم في تلك الليالي ثمان ركعات، وثلاث ركعات وتراً" [1]

"جہاں تک (مسنون رکعاتِ تراویح کی) تعداد کی بات ہے تو ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ان راتوں میں آٹھ رکعات اور تین رکعات وتر پڑھی تھیں۔"

❁ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۱۲ھ) لکھتے ہیں:

"لأن النبي ﷺ لم يصلها عشرين بل ثماني" [2]

"کیوں کہ نبی ﷺ نے (تراویح) بیس رکعات نہیں پڑھیں بلکہ آٹھ رکعات پڑھیں۔"

❁ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۲۳ھ) لکھتے ہیں:

"ازاں جملہ ایک دفعہ گیارہ رکعات پڑھنا ہے، چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شب میں گیارہ رکعت تراویح بجماعت پڑھی۔" [3]

❁ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۴۶ھ) صاحب لکھتے ہیں:

"اور سنتِ موکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو بالاتفاق ہے۔" [4]

❁ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۵۳ھ) لکھتے ہیں:

"ولا مناص من تسليم أن تراويحه كانت ثمانية ركعات" [5]

---

[1] عمدة الرعاية بتحشية شرح الوقاية (١٦٦/١)

[2] حاشية كنز الدقائق (١٢٢/١) مطبوعة مكتبة البشري.

[3] تالیفاتِ رشیدیہ (ص: ۳۱۵)، الرأي النجيح (ص: ۱۳)

[4] براہینِ قاطعہ (ص: ۱۹۵)

[5] العرف الشذي للكشميري (٢٠٨/٢)

”یہ ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ نبی ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات ہی تھیں۔“

❁ مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۸۱ھ) لکھتے ہیں:

”اگرچہ نبی ﷺ سے آٹھ رکعت تراویح مسنون ہے۔“[1]

❁ مولانا محمد یوسف بنوری (المتوفی: ۱۳۹۷ھ) نے علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا قول برضا و رغبت نقل کرتے ہوئے لکھا:

”ولا بد من تسليم أنه ﷺ صلى التراويح أيضا ثماني ركعات“[2]

”یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے تراویح بھی آٹھ رکعات ہی پڑھیں۔“

اس کے بعد آگے بنوری صاحب نے صحیح ابن حبان سے حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کو نقل کر کے اس کی پرزور تائید کی ہے۔[3]

رب العالمین باقی احناف حضرات کو بھی توفیق دے کہ وہ بھی اس حقیقت کا اعتراف اور اس کا اظہار کریں کہ تراویح کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کی سنت گیارہ رکعات ہی تھی۔



---

[1] علم الفقہ (ص: ۱۹۸)

[2] معارف السنن (۵/۵۴۳)

[3] معارف السنن (۵/۵۴۴)

حصہ دوم

مخالفین کے دلائل کا جائزہ

باب 1

کیا بیس رکعات تراویح قرآن سے ثابت ہے؟

کچھ لوگوں نے بہت ہی عجیب و غریب دعویٰ کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن مجید سے بیس رکعات تراویح کا ثبوت ملتا ہے۔ بریلویوں کے مفتی احمد یار گجراتی لکھتے ہیں:

''ہم بفضلہٖ تعالیٰ اس کا ثبوت قرآن پاک کی ترتیب، احادیثِ صحیحہ، اقوالِ علما، عقلی دلائل سے دیتے ہیں۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''دیکھنا یہ ہے قرآنی رکوع کو رکوع کیوں کہتے ہیں؟ کتبِ قراءت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما تراویح میں جس قدر قرآن پڑھ کر رکوع فرماتے تھے، اس حصے کا نام رکوع رکھا گیا، چونکہ تراویح بیس رکعات پڑھی جاتی تھی اور ستائیسویں رمضان کو ختم ہوتا تھا، اس لحاظ سے قرآن پاک کے کل پانچ سو چالیس رکوع ہونے چاہئیں، لیکن چونکہ ختم کے دن بعض رکعتوں میں چھوٹی چھوٹی دو سورتیں پڑھ لی جاتی تھیں، اس لیے قرآن کریم کے پانچ سو ستاون رکوع ہوئے۔

''اگر تراویح آٹھ رکعت ہوتی تو رکوع دو سو سولہ ہونے چاہئیں تھے۔ قرآنی رکوعات کی تعداد بتا رہی ہے کہ تراویح بیس رکعت چاہئیں۔ کیا

کوئی وہابی صاحب آٹھ رکعت تراویح مان کر رکوعاتِ قرآنی کی وجہ بتا سکیں گے؟''[1]

مذکورہ بالا عبارت میں مفتی صاحب نے قرآن مجید کے رکوعات سے بیس رکعات تراویح ثابت کی ہے اور عوام کو یہ تاثر دیا ہے کہ قرآن مجید سے بیس رکعات تراویح کا ثبوت ملتا ہے۔

مفتی صاحب نے اپنے استدلال کی عمارت اس بنیاد پر قائم کی ہے کہ عمر بن الخطاب و عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں ایک ہی بار قرآن ختم ہوتا تھا اور ہر رکعت میں ایک رکوع کی تلاوت کی جاتی تھی۔

عرض ہے کہ ہمیں ان باتوں کا سرے سے کوئی ثبوت ملا ہی نہیں کہ صحابہ تراویح میں صرف ایک بار قرآن ختم کرتے تھے اور ہر رکعت میں ایک رکوع کی تلاوت فرماتے تھے۔ البتہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ میں قرآن کریم ختم کرنے کا عمومی حکم دیا ہے، چنانچہ امام ابوداود رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

''حدثنا سليمان بن حرب، ثنا حماد، عن عطاء بن السائب، عن أبيه، عن عبد الله بن عمرو، قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: صم من كل شهر ثلاثة أيام، واقرأ القرآن في شهر، فناقصني وناقصته، فقال: صم يوما، وأفطر يوما. قال عطاء: واختلفنا عن أبي فقال بعضنا: سبعة أيام، وقال بعضنا: خمسا''[2]

---

[1] جاء الحق (ص: ۴۳۹)

[2] سنن أبي داود (١/٤٤٢، رقم: ١٣٨٩) وإسناده صحيح

''صحابیِ رسول عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مہینے میں تین روزے رکھا کرو اور مہینا بھر میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔ پھر روزوں کی تعداد اور ختمِ قرآن کی مدت میں میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اختلاف ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا تو پھر ایک دن روزہ رکھ لے اور ایک دن چھوڑ دے۔ عطا کہتے ہیں کہ میرے والد سے لوگوں نے روایت کرنے میں اختلاف کیا ہے، بعض نے ختمِ قرآن کی آخری مدت سات دن بتائی ہے اور بعض نے پانچ دن۔''

لہٰذا ممکن ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ماہِ رمضان میں کم از کم ایک بار ختمِ قرآن کا اہتمام کرتے ہوں، البتہ اس کی کوئی صریح دلیل نہیں ملی ۔ واللہ أعلم۔ لیکن جہاں تک مفتی صاحب کی دوسری بات ہے کہ ہر رکعت میں ایک رکوع کی تلاوت ہوتی تھی تو یہ بالکل غلط ہے، کیوں کہ پہلی بات تو یہ کہ کسی بھی مستند روایت میں اس کا ثبوت نہیں، بلکہ یہ مسلمہ بات ہے کہ قرآن کی رکوعاتی تقسیم عہدِ صحابہ کے بعد کی ہے۔ آج بھی عربوں کے یہاں قرآن کے جو عام نسخے ہیں ان میں رکوعات کا کوئی نام ونشان نہیں ہوتا، اس لیے یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ صحابہ ایک رکعت میں ایک رکوع پڑھتے تھے اور اسی لیے اس مجموعہ آیات کا نام رکوع پڑا۔

دوسری بات یہ کہ صحیح روایت میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک رکعت میں ایک رکوع میں شامل آیات سے زیادہ آیات کی تلاوت کرتے تھے، مثلاً: سو یا ساٹھ یا پچاس یا تیس وغیرہ، بلکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایک رکعت میں جتنی آیات پڑھی جاتی تھی اس سے متعلق مفتی صاحب کا اصول بروئے کار لایا جائے تو ثابت ہو گا کہ قرآنی آیات سے بیس رکعاتِ تراویح

کے بجائے آٹھ رکعات تراویح کا ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ مفتی صاحب کی یہ بات ذہن میں رکھیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں صرف ایک بار قرآن ختم ہوتا تھا اور وہ بھی کچھ دن قبل ہو جاتا تھا، اب ذیل کی روایت ملاحظہ فرمائیں جس میں یہ ذکر ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قرائے کرام کو ایک ایک رکعت میں کتنی آیات پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

”حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، عَنْ عَاصِمٍ، عَنْ أَبِي عُثْمَانَ، قَالَ: دَعَا عُمَرُ الْقُرَّاءَ فِي رَمَضَانَ، فَأَمَرَ أَسْرَعَهُمْ قِرَاءَةً أَنْ يَقْرَأَ ثَلَاثِينَ آيَةً، وَالْوَسَطَ خَمْسًا وَعِشْرِينَ آيَةً، وَالْبَطِيءَ عِشْرِينَ آيَةً“[1]

”ابو عثمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلایا اور تیز رفتار میں قراءت کرنے والے کو حکم دیا کہ ایک رکعت میں تیس آیات پڑھے اور متوسط رفتار میں قراءت کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ ایک رکعت میں پچیس آیات پڑھے اور سست رفتار میں قراءت کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ ایک رکعت میں بیس آیات پڑھے۔“

یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ اس صحیح روایت کے مطابق تینوں رفتار میں پڑھنے والے قراء اگر آٹھ رکعاتِ تراویح پڑھیں گے، تبھی رمضان میں صرف ایک بار قرآن ختم ہو گا، نیز اختتامِ رمضان سے کچھ دن قبل ہی ختم ہو گا، جیسا کہ مفتی صاحب نے کہا: ”اور ستائیسویں رمضان کو ختم ہوتا تھا...“[2]

تفصیل ملاحظہ ہو:

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١٦٢/٢) وإسناده صحيح على شرط الشيخين

[2] جاء الحق (ص: ۴۳۹)

تیز رفتار قاری کی قراءت اور رکعاتِ تراویح:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تیز رفتار قاری کو ایک رکعت میں تیس آیات پڑھنے کا حکم دیا، چنانچہ اگر یہ قاری آٹھ رکعات میں تیس تیس آیات پڑھے گا تو ایک دن میں کل ۲۴۰ آیات پڑھی جائیں گی اور تیس دن میں ۷۲۰۰ آیات پڑھی جائیں گی اور آخری دنوں میں آیات بہت مختصر ہوتی ہیں، اس لیے ظاہر ہے ان دنوں میں مزید آیات پڑھی جائیں گی اور قرآن میں کل ۶۲۳۶ آیات ہیں۔

یعنی ہر رکعت میں تیس آیات کی تلاوت کی جائے اور اسی طرح پورے ماہ تک آٹھ رکعات پڑھی جائے تو اس حساب سے رمضان میں کچھ دن قبل ایک بار قرآن ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ مفتی صاحب کا دعویٰ ہے۔

متوسط رفتار قاری کی قراءت اور رکعاتِ تراویح:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے متوسط رفتار قاری کو ایک رکعت میں پچیس آیات پڑھنے کا حکم دیا، چنانچہ اگر یہ قاری آٹھ رکعات میں پچیس پچیس آیات پڑھے گا تو ایک دن میں کل ۲۰۰ آیات پڑھی جائیں گی اور تیس دن میں ۶۰۰۰ آیات پڑھی جائیں گی۔ آخری دنوں میں آیات بہت مختصر ہوتی ہیں اس لیے ظاہر ہے ان دنوں میں مزید آیات پڑھی جائیں گی اور قرآن میں کل ۶۲۳۶ آیات ہیں۔

یعنی ہر رکعت میں پچیس آیات کی تلاوت کی جائے اور اسی طرح پورے ماہ تک آٹھ رکعات پڑھی جائیں تو اس حساب سے بھی رمضان میں کچھ دن قبل ایک بار قرآن ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ مفتی صاحب کا دعویٰ ہے۔

سست رفتار قاری کی قراءت اور رکعاتِ تراویح:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سست رفتار قاری کو ایک رکعت میں بیس آیات پڑھنے کا حکم

دیا، چنانچہ اگر یہ قاری آٹھ رکعات میں بیس بیس آیات پڑھے گا تو ایک دن میں کل ۱۶۰ آیات پڑھی جائیں گی اور تیس دن میں ۴۸۰۰ آیات پڑھی جائیں گی۔ آخری دنوں میں آیات بہت مختصر ہوتی ہیں، اس لیے ظاہر ہے ان دونوں میں مزید آیات پڑھی جائیں گی اور قرآن میں کل ۶۲۳۶ آیات ہیں۔

یعنی ہر رکعت میں بیس آیات کی تلاوت کی جائے اور اسی طرح پورے ماہ تک آٹھ رکعات پڑھی جائیں تو اس حساب سے بھی رمضان میں کچھ دن قبل ایک بار قرآن ختم ہوجاتا ہے، جیسا کہ مفتی صاحب کا دعویٰ ہے۔

اس کے برخلاف اگر اکیس رکعات پڑھی جائیں تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق تیز رفتار اور متوسط رفتار سے پڑھنے والے قاری کے یہاں دو بار قرآن مکمل ختم ہو جائے گا اور تیسری بار بھی شروع ہو جائے گا۔

اسی طرح سست رفتار پڑھنے والے کے یہاں ایک بار مکمل ختم ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری بار نصف سے زائد حصہ پڑھا جائے گا، جب کہ مفتی صاحب کا دعویٰ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن ایک ہی بار ختم ہوتا تھا وہ بھی ماہ کے اختتام سے قبل ہوتا تھا، ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب تراویح میں صرف آٹھ رکعات ہوں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیات یا رکوعات سے بیس رکعات تراویح کا قطعاً ثبوت نہیں، بلکہ اگر مفتی صاحب کے اصول پر بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ قرآنی آیات سے آٹھ رکعاتِ تراویح ہی کا ثبوت ملتا ہے۔



باب 2

بیس رکعات سے متعلق مرفوع روایات کا جائزہ

ذخیرہ احادیث میں صرف دو مرفوع روایات ملتی ہیں جن سے بیس رکعات تراویح کی دلیل لی جاتی ہے، ذیل میں ان دونوں مرفوع روایات کا جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

پہلی مرفوع روایت: حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما:

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

”حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُوْنَ، قَالَ: أَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ عُثْمَانَ، عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ مِقْسَمٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ (فِيْ غَيْرِ جَمَاعَةٍ) عِشْرِينَ رَكْعَةً وَالْوِتْرَ“ [1]

”صحابیِ رسول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ رمضان میں بغیر جماعت کے بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔“

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٢/١٦٤)، وأخرجه أيضا عبد بن حميد في المنتخب من المسند (ص: ٢١٨، رقم: ٦٥٣) و الطبراني في المعجم الكبير (:١١/٣٩٣، رقم: ١٢١٠٢) وفي الأوسط (١/٢٤٤، رقم: ٧٩٨) وفيه أيضا (٥/٣٢٤، رقم: ٥٤٤٠) و ابن عدي في الكامل في ضعفاء الرجال (١/٣٩١) و البيهقي في السنن الكبرىٰ (٢/٤٩٦)، و الخطيب في موضح أوهام الجمع والتفريق (١/٣٨٧) وتاريخ بغداد (١٣/٥٠١) و ابن عبد البر في التمهيد لابن عبد البر (٨/١١٥) وغيره، كلهم من طريق أبي شيبة إبراهيم بن عثمان به، والزيادة عند ابن عدي و البيهقي، وإسناده موضوع.

اس روایت کی سند میں ایک راوی ''ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان'' ہے، جس پر محدثین نے سخت جرحیں کی ہیں، قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان پر محدثین کی جرح:

❁ امام شعبہ بن الحجاج رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۶۰ھ) فرماتے ہیں:

''كَذبَ وَاللّٰه'' [1] ''اللہ کی قسم اس نے جھوٹ بولا۔''

❁ امام ابن سعد رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں:

''ضَعِيفُ الْحَدِيثِ'' [2] ''یہ ضعیف الحدیث ہے۔''

❁ امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

''لَيْسَ بِثِقَةٍ'' [3] ''یہ ثقہ نہیں ہے۔''

❁ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

''مُنكر الْحَدِيثِ'' [4] ''یہ منکر الحدیث ہے۔''

❁ امام جوزجانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۹ھ) فرماتے ہیں:

''أَبُو شَيبَةَ إِبْرَاهِيمُ بْن عُثمَانَ سَاقِطٌ'' [5]

''ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان ساقط ہے۔''

❁ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں:

''ضَعِيفٌ'' [6] ''ضعیف ہے۔''

---

[1] العلل ومعرفة الرجال (٢٨٧/١) وإسناده صحيح

[2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد(٣٨٤/٦)

[3] تاريخ ابن معين، رواية الدارمي(ص: ٢٤٢)

[4] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١١٥/٢) وإسناده صحيح

[5] أحوال الرجال للجوزجاني (ص: ٩)

[6] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١١٥/٢)

❁ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

"ضَعِيفُ الْحَدِيْثِ، سَكتُوا عَنْهُ وَتَرَكُوْا حَدِيثَه"[1]

"یہ ضعیف الحدیث ہے۔ لوگوں نے اس کی توثیق سے خاموشی اختیار کی ہے اور اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔"

❁ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"سكتوا عَنْهُ"[2]

"لوگوں نے اس کی توثیق سے خاموشی اختیار کی ہے۔"

❁ امام ابن عدی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۶۵ھ) فرماتے ہیں:

"وَلأَبِيْ شَيبَةَ أَحَادِيْثُ غَيرُ صَالِحَة غير مَا ذكرت عَنِ الْحكم وَعَنْ غَيرِهِ، وَهُوَ ضَعِيفٌ عَلىٰ مَا بينته"[3]

"ابو شیبہ کی حکم وغیرہ سے مذکورہ احادیث کے علاوہ بھی کئی غیر درست احادیث ہیں اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔"

❁ امام ترمذی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

"إِبْرَاهِيْمُ بنُ عُثمَانَ هُوَ أَبُو شَيبَة الوَاسِطِي مُنكر الْحَدِيْث"[4]

"ابراہیم بن عثمان، یہ ابو شیبہ الواسطی ہے اور یہ منکر الحدیث ہے۔"

❁ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"إِبْرَاهِيم بن عُثْمَان أَبُو شيبَة مَتْرُوك الحَدِيث كُوفِي"[5]

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (۱۱۵/۲)]

[2] التاريخ الكبير للبخاري (۳۱۰/۱)

[3] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (۳۹۲/۱)

[4] سنن الترمذي، ت شاكر (۳۳۷/۳)

[5] الضعفاء والمتروكون للنسائي (ص: ۱۲)

”ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ، یہ متروک الحدیث ہے، کوفی ہے۔“

❁ امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵ھ) نے بھی اسے متروکین میں ذکر کیا ہے۔[1]

❁ امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

”تفرد به أبو شيبة إبراهيم بن عثمان العبسي الكوفي وهو ضعيف“[2]

”اسے بیان کرنے میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے۔“

❁ امام ابن القیسرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۰۷ھ) فرماتے ہیں:

”وإبراهيم متروك الحديث“[3]

”ابراہیم یہ متروک الحدیث ہے۔“

❁ امام نووی رحمہ اللہ (المتوفی: ٦٧٦ھ) فرماتے ہیں:

”وَأَبُو شَيْبَةَ هُوَ إِبْرَاهِيمُ بْنُ عُثْمَانَ وَكَانَ قَاضِي وَاسِط وَهُوَ ضَعِيفٌ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ“[4]

”ابوشیبہ، یہ ابراہیم بن عثمان ہے۔ یہ واسط کا قاضی تھا، یہ ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔“

یہاں اس بات پر دھیان دیں کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کے ضعف پر اتفاق نقل کیا ہے۔

❁ امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] الضعفاء والمتروكين للدارقطني (ص: ٤)

[2] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٤٩٦/٢)

[3] ذخيرة الحفاظ لابن القيسراني (٥٤٨/١)

[4] شرح النووي على مسلم (٦٤/١)

"ترك حديثه"[1] ''اس کی حدیث چھوڑ دی گئی ہے۔''

❁ امام ہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"إبراهيم بن عثمان أبو شيبة وهو متروك"[2]

''ابراہیم بن عثمان، ابوشیبہ یہ متروک الحدیث ہے۔''

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"متروك الحديث"[3] ''متروک الحدیث ہے۔''

فائدہ: احناف میں سے بھی بہت سے حضرات نے اس راوی کو ضعیف یا جھوٹا قرار دیا ہے، مثلاً:

❁ مولانا تقی عثمانی صاحب ایک حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے۔''[4]

❁ علامہ احمد بن محمد بن جعفر قدوری حنفی نے ایک روایت سے متعلق کہا ہے:

"ولأن أبا شيبة إبراهيم بن عثمان قاضي واسط كذاب"[5]

''کیوں کہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان، واسط کا قاضی بہت بڑا جھوٹا ہے۔''

علمائے احناف کے مزید حوالے آگے بھی آرہے ہیں۔

راوی مذکور کی کسی بھی امام نے توثیق یا تعدیل نہیں کی:

راوی مذکور سے متعلق بہت سے ناقدین کی جرحیں ملتی ہیں، لیکن ہم نے اوپر

---

[1] الكاشف للذهبي (١/٢١٩)

[2] مجمع الزوائد للهيثمي (٤/١٨٠)

[3] تقريب التهذيب لابن حجر، رقم (٢١٥)

[4] درسِ ترمذی (۳/۳۰۴)

[5] كتاب التجريد للقدوري (ص: ٢٠٣)

صرف ان جروح کو پیش کیا ہے جو اپنے قائلین سے ثابت ہیں، ان ناقدین کے برخلاف کسی ایک بھی ناقد سے راوی مذکور کی توثیق سرے سے منقول ہی نہیں، توثیق تو درکنار اس بدنصیب راوی کی تعدیل بھی کسی امام سے کہیں نہیں ملتی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ بعض حضرات جو ان جروح کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور مفسر اور متشدد وغیرہ کی بحث شروع کرتے ہیں، یہ سب لایعنی ہے، کیوں کہ ان پر بحث کی نوبت تب آتی ہے جب مقابل میں توثیق بھی ثابت ہو اور اس کا پلڑا بھاری ہو، لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جرح کے مقابلے میں توثیق سرے سے ثابت ہی نہیں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ سے ضعف پر اتفاق کا قول گذر چکا ہے، اس کے علاوہ امام سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی: ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں:

”مَعَ أَنَّ هَذَيْنِ الْإِمَامَيْنِ الْمُطَّلِعَيْنِ الْحَافِظَيْنِ الْمُسْتَوْعِبَيْنِ حَكَيَا فِيهِ مَا حَكَيَا وَلَمْ يَنْقُلَا عَنْ أَحَدٍ أَنَّهُ وَثَّقَهُ وَلَا بِأَدْنَى مَرَاتِبِ التَّعْدِيلِ“[1]

”ان دونوں حفاظ، باخبر اور واسع العلم ائمہ نے اس کے بارے میں جو نقل کیا وہ کیا، اس کے ساتھ کسی ایک سے بھی منقول نہیں ہے کہ اس نے اسے ثقہ کہا ہے اور اس کی ادنیٰ درجے کی بھی تعدیل کی ہو۔“

لیکن کچھ لوگ مغالطہ دینے کے لیے امام ابن عدی اور یزید بن ہارون کا غیر متعلق قول پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس راوی کی تعدیل کی گئی ہے اور یہ دیندار راوی ہے، حالانکہ ان دونوں اماموں نے بھی نہ تو اس راوی کی توثیق کی ہے اور نہ ہی تعدیل۔ ذیل میں ان اماموں کے کلام کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

---

[1] الحاوي للفتاوى (٤١٤/١)

امام ابن عدی کا قول:

امام ابن عدی سے نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا:

"ولأبي شيبة أحاديث صالحة غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره"[1]

''ابو شیبہ کی حکم وغیرہ سے مذکورہ احادیث کے علاوہ بھی کئی درست احادیث ہیں اور یہ ضعیف ہے، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔''

عرض ہے:

أولاً: یہ عبارت الکامل کے جس نسخے سے نقل کی گئی ہے اس میں اس عبارت کے اندر ایک لفظ ساقط ہے اور وہ ہے "صالحة" سے قبل "غير" کا لفظ، یعنی اصل عبارت "غير صالحة" کے الفاظ کے ساتھ ہے، جیسا کہ الکامل کے درج ذیل نسخے میں ہے:

"ولأبي شيبة أحاديث غير صالحة غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره"[2]

یعنی اس نسخے میں "صالحة" سے قبل لفظ "غير" موجود ہے اور یہی صحیح ہے، اس کی دو دلیلیں ہیں:

1. الکامل کے کئی مخطوطات میں اس مقام پر لفظ "غير" موجود ہے۔ انھیں میں سے وہ مخطوطہ بھی ہے جو دکتور بشار عواد کے زیرِ مطالعہ تھا جیسا کہ انھوں نے تہذیب الکمال کے حاشیے میں وضاحت کی ہے، ان کے الفاظ آگے آرہے

---

[1] الكامل لابن عدي (٢٤١/١)

[2] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (٣٩٢/١) تحقيق عادل ورفقاءه

ہیں۔ اسی طرح تین محققین کی تحقیق سے بیروت سے الکامل کا جو نسخہ طبع ہوا ہے اس میں بھی متعلقہ عبارت لفظ "غیر" کے اثبات کے ساتھ ہے، جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا۔

اس نسخے کے محققین نے کل گیارہ مخطوطوں سے اس کتاب کی تحقیق کی ہے، لیکن حاشیے میں اس مقام پر نسخوں کا کوئی اختلاف نہیں بتایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس تمام مخطوطوں میں موجود یہ عبارت لفظ "غیر" کے اثبات ہی کے ساتھ تھی، ورنہ محققین حاشیے میں نسخوں کا اختلاف ضرور بتلاتے جیسا کہ دیگر مقامات پر انھوں نے نسخوں کے اختلافات کو بتلایا ہے۔

2 عبارت کا سیاق وسباق بھی اس لفظ "غیر" کے اثبات پر شاہد ہے۔

غور کریں کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے اس راوی کی غیر درست احادیث پیش کی ہیں، اس کے بعد کہا کہ مذکورہ غیر درست احادیث کے علاوہ بھی اس کی مزید غیر درست احادیث ہیں، چنانچہ ابن عدی رحمہ اللہ کا پورا کلام یہ ہے:

"ولأبي شيبة أحاديث غير صالحة غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره"[1]

"ابو شیبہ کی حکم وغیرہ سے مذکورہ احادیث کے علاوہ بھی کئی غیر درست احادیث ہیں اور یہ ضعیف ہے، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔"

اس عبارت میں "غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره" پر غور کیجیے، یعنی امام ابن عدی رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کہ اوپر میں نے اس کی جو چند غیر درست

[1] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (١/٣٩٢)

احادیث پیش کی ہیں اس کے علاوہ بھی اس سے غیر درست احادیث مروی ہیں۔ یہ سیاق صاف بتلاتا ہے کہ ابن عدی نے راوی مذکور کی جن احادیث کو گنایا ہے اور جن کی طرف اشارہ کیا ہے دونوں کی نوعیت ایک ہی ہے، مزید یہ کہ اس کے فوراً بعد اپنے اس فیصلے کی یہ علت بھی بتلائی ہے:

"وهو ضعيف على ما بينته"[1]

"اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔"

یعنی ایسا اس وجہ سے ہے، کیوں کہ یہ ضعیف راوی ہے۔ دکتور بشار عواد نے بھی مذکورہ دونوں دلائل کی بنیاد پر اپنا یہی موقف پیش کیا ہے کہ اس عبارت میں لفظ "غیر" بھی موجود ہے۔ موصوف تہذیب الکمال کے حاشیے میں فرماتے ہیں:

"الذي في نسختي المصورة من الكامل لابن عدي: غير صالحة. وهو الأصوب فيما أرى لقول ابن عدي قبل هذا بعد أن أورد لإبراهيم جملة من الأحاديث غير الصالحة: ولابي شَيْبَة أحاديث غير صالحة غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره، وهو ضعيف على ما بينته. والظاهر لنا من المقارنات الكثيرة أن المزي اعتمد رواية أخرى من الكامل لابن عدي غير التي عندي، لكثرة ما أجد من الاختلاف بين الذي في الكامل، وبين الذي ينقله المزي عنه، وهذا ليس من عادته فهو دقيق في النقل في الأغلب الأعم"[2]

---

[1] الكامل فى ضعفاء الرجال لابن عدي (٣٩٢/١)

[2] حاشيه (رقم: ٤) تهذيب الكمال للمزي (١٥١/٢)

''میرے پاس موجود کامل کے مصور نسخہ میں ''غیر صالحة'' (اس کی احادیث درست نہیں ہیں) ہے اور میری نظر میں یہی صحیح ہے، کیوں کہ اس سے قبل امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اس کی چند غیر درست احادیث پیش کر کے کہا: ''اور ابوشیبہ کی حکم وغیرہ سے مذکورہ احادیث کے علاوہ بھی کئی غیر درست احادیث ہیں اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔'' اور کئی مقامات پر مقارنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام مزی نے کامل کے کسی اور نسخے پر اعتماد کیا ہے جو میرے پاس موجود نسخے سے الگ ہے، کیوں کہ میں نے اپنے پاس موجود نسخے اور امام مزی کے نسخے میں کافی اختلاف پایا ہے، اور یہ ان کی عادت نہیں ہے، کیوں کہ وہ نقل کرنے میں عام طور سے بہت باریک بین ہیں۔''

دکتور بشار کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام مزی رحمہ اللہ کے سامنے بھی وہی مخطوطہ تھا جس میں مذکورہ عبارت ادھوری تھی۔

ثانیاً: اگر اس عبارت میں ''غیر'' کا اثبات نہ بھی مانیں، تب بھی اس عبارت میں راوی مذکور کی نہ تو توثیق ہے اور نہ ہی تعدیل، اس میں صرف یہ ہے کہ اس کی بعض مرویات درست ہیں۔ اب اگر کسی راوی نے چند درست باتیں نقل کر دیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ راوی معتبر یا دیندار ہے۔ ایک روایت کے مطابق تو شیطان نے بھی آیۃ الکرسی سے متعلق درست بات کہی اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق بھی کی، لیکن ساتھ میں اسے جھوٹا بھی قرار دیا، چنانچہ فرمایا: ((أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ))[1]

---

[1] صحيح ابن خزيمة، رقم (٢٤٢٤) صحيح البخاري معلقاً (١٠١/٣) رقم (٢٣١١)

''اس نے تم سے سچ کہا ہے لیکن یہ جھوٹا ہے۔''

معلوم ہوا کہ کذاب لوگ بھی کبھی کبھی صحیح بات بیان کر دیتے ہیں، لیکن اس سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ ایسی چند روایات بیان کر کے وہ قابلِ اعتبار ہو گئے۔ نیز امام ابن عدی رحمہ اللہ نے مذکورہ کلام کے بعد فوراً کہا:

"وهو ضعيف على ما بينته"[1]

''اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔''

یہ اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ اسے بہر صورت ضعیف ہی مانتے ہیں، لہٰذا قائل کی منشا کے خلاف اس کے قول کی تشریح کرنا بہت بڑی خیانت ہے۔

تنبیہ: امام ابن عدی نے ابو شیبہ کو ضعیف کہنے کے بعد آگے اسے "إبراهيم بن أبي حية" سے بہتر بتایا ہے۔ پوری عبارت ایک ساتھ یہ ہے:

"ولأبي شيبة أحاديث غير صالحة غير ما ذكرت عن الحكم وعن غيره، وهو ضعيف على ما بينته، وهو وإن كان نسب إلى الضعف، فإنه خير من إبراهيم بن أبي حية الذي تقدم ذكره"[2]

''اور ابو شیبہ کی حکم وغیرہ سے مذکورہ احادیث کے علاوہ بھی کئی غیر درست احادیث ہیں اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، تاہم یہ اگرچہ ضعیف ہے، لیکن ابراہیم بن ابی حیہ سے بہتر ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔''

---

[1] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (١/٣٩٢)

[2] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي، ت عادل وعلي (١/٣٩٢)

مولانا طاہر گیاوی صاحب نے امام ابن عدی کی عبارت کا صرف آخری حصہ ''یہ اگرچہ ضعیف ہے لیکن ابراہیم بن ابی حیہ سے بہتر ہے'' پیش کیا، اس کے بعد ابراہیم بن ابی حیہ کی توثیق میں امام ابن معین سے ''شيخ ثقة كبير'' کے الفاظ نقل کرنے کے بعد کہا:

''لہٰذا جب ابراہیم بن ابی حیہ ثقہ کبیر ہیں تو جو ان سے بہتر ہوگا وہ تو بدرجہ اولیٰ بہت زیادہ ثقہ ہوگا، اس لیے اس بات کے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ ابن عدی نے ابوشیبہ کو ابراہیم بن ابی حیہ سے بہتر بتا کر ان کی زبردست توثیق کر دی۔''[1]

عرض ہے:

أولاً: ابوشیبہ کو ابراہیم بن ابی حیہ سے بہتر جس نے کہا ہے وہ امام ابن عدی ہیں نہ کہ امام ابن معین، اس لیے امام ابن عدی کے اس تقابل کو سمجھنے کے لیے خود ابن عدی کی نظر میں ابراہیم بن ابی حیہ کی حیثیت دیکھنی ہوگی۔ امام ابن عدی نے ابوشیبہ سے پہلے ابراہیم بن ابی حیہ ہی کا تذکرہ کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا:

"وضعف إبراهيم بن أبي حية بين على أحاديثه ورواياته، وأحاديث هشام بن عروة التي ذكرتها كلها مناكير"[2]

''ابراہیم بن ابی حیہ کا ضعف اس کی احادیث و روایات پر واضح ہے، ہشام بن عروۃ (سے اس) کی جو احادیث میں نے ذکر کی ہیں وہ سب کی سب منکر ہیں۔''

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ١٥٦)

[2] الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي، ت عادل وعلي (٣٨٩/١)

امام ذہبی رحمہ اللہ نے امام ابن عدی کی اسی تضعیف کے پیشِ نظر ابراہیم بن ابی حیہ کے بارے میں لکھا: "ضعفه ابن عدي"[1] "ابن عدی نے اسے ضعیف کہا ہے۔"

ملاحظہ فرمائیں کہ امام ابن عدی کی نظر میں ابراہیم بن ابی حیہ بھی ضعیف ہی ہے، اس لیے اس کے مقابلے میں ابو شیبہ کو ابن عدی کا بہتر بتانا ابو شیبہ کی توثیق ہرگز نہیں ہے، بلکہ تضعیف میں ان کا درجہ بتلانا مقصود ہے۔

ثانیاً: امام ابن عدی نے پہلے ابوشیبہ کی پوری صراحت کے ساتھ تضعیف کی ہے اور اس کے بعد تقابل پیش کیا ہے، چنانچہ تقابل سے قبل ابن عدی نے صاف طور سے لکھا ہے: "وهو ضعيف على ما بينته"[2]

"اور یہ ضعیف ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔"

لہٰذا جب خود ابن عدی رحمہ اللہ تقابل کے بعد بھی ابو شیبہ کو ضعیف ہی بتلا رہے ہیں تو مولانا گیاوی صاحب کا اس تقابل سے خود ساختہ مفہوم نکالنا غلط ہے۔

واضح رہے کہ ابراہیم بن ابی حیہ کے بارے میں ابن معین کی توثیق مرجوح ہے اور قولِ راجح میں یہ بھی ضعیف ہی ہے، جیسا کہ امام ابن عدی نے کہا ہے۔[3]

یزید بن ہارون کا قول:

امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

"قال يزيد بن هارون: ما قضى على الناس رجل يعني في زمانه أعدل في قضائه منه"[4]

---

1. تاريخ الإسلام، ت بشار (٧٩٦/٤)
2. الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي (٣٩٢/١)
3. مزید اقوال کے لیے دیکھیں: لسان الميزان لابن حجر، ت أبي غدة (٢٧١/١)
4. تاريخ ابن معين، رواية الدوري (٥٢٣/٣)

”یزید بن ہارون نے کہا: اپنے زمانے میں اس سے بہتر کسی نے فیصلہ نہیں کیا۔“

عرض ہے کہ یزید کے اس قول میں محض درست فیصلہ کرنے کی بات ہے اور درست فیصلہ کرنے سے کسی کی دینداری قطعاً ثابت نہیں ہوتی۔ مسلمان تو درکنار کتنے غیر مسلمین ہیں جو درست فیصلے کرتے ہیں تو کیا ان کو دیندار اور متقی مان لیا جائے؟

علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”عدل فی القضاء تو بعض غیر مسلموں کا بھی ضرب المثل ہے، نوشیرواں عادل کا نام آپ نے بھی سنا ہوگا، بقول شیخ سعدی مرحوم: نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت۔“[1]

اس کے بعد علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ نے شریح رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کی ہے کہ حالتِ کفر میں یہ اتنے درست فیصلے کرتے تھے کہ ابوالحکم سے مشہور ہو گئے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے فیصلے کی تحسین کی، لیکن ان کی کنیت تبدیل کر دی۔[2]

اس کے بعد علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”سوچنے کی بات ہے کہ جب عدل فی القضاء سے کسی شخص کا مسلمان ہونا لازمی نہیں تو بھلا تدین اور تقویٰ، حفظ اور ضبط کا وہ مرتبہ جو قبولِ روایت کے لیے محدثین کے نزدیک معتبر ہے اس کا ثبوت صرف اتنی سی شہادت سے کیسے ہو جائے گا؟!“[3]

یاد رہے کہ یزید کے اس قول کے ناقل ابن معین رحمہ اللہ بکثرت دینداری کے

---

[1] أنوار مصابيح (ص: ١٨١، ١٨٢)

[2] سنن أبي داود، (رقم: ٤٩٥٥) وإسناده صحيح

[3] أنوار المصابيح (ص: ١٨١، ١٨٢)

اعتبار سے بھی رواۃ کو ثقہ کہتے رہتے ہیں اور دوسرے مقام پر انھیں رواۃ کی حفظ و ضبط کے اعتبار سے تضعیف بھی کرتے ہیں، لیکن زیرِ تذکرہ راوی کو ابن معین رحمہ اللہ نے صرف ضعیف کہا اور کسی بھی موقع پر اسے ثقہ نہیں کہا، جس سے معلوم ہوا کہ ابن معین رحمہ اللہ کی نظر میں بھی یزید کے اس قول سے زیرِ تذکرہ راوی کی دینداری ثابت نہیں ہوتی۔

اس روایت کے مردود ہونے پر اجماع ہے:

بیس رکعات والی یہ روایت محدثین کے یہاں بالاتفاق مردود، یعنی نا قابلِ قبول ہے، البتہ اسے رد کرتے ہوئے کسی نے ضعیف کہا، کسی نے سخت ضعیف کہا، کسی نے منکر کہا، کسی نے معلول کہا تو کسی نے موضوع کہا، لیکن بہرحال اسے مردود قرار دینے پر تمام کے تمام محدثین متفق ہیں، ذیل میں ہم چند محدثین کی تصریحات پیش کرتے ہیں:

حدیث مذکور کی تضعیف کرنے والے محدثین:

- امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

"تفرد به أبو شيبة إبراهيم بن عثمان العبسي الكوفي وهو ضعيف"[1]

''اسے روایت کرنے میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے۔''

- امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

"وروي عن النبي ﷺ أنه كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر إلا أنه حديث يدور على أبي شيبة إبراهيم بن عثمان جد بني أبي شيبة وليس بالقوي"[2]

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٤٩٦/٢)

[2] التمهيد لابن عبد البر (١١٥/٨)

''اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے، مگراس حدیث کا دار و مدار ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان پر ہے اور یہ قوی نہیں ہے۔''

❁ امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

"ومن مناكير أبي شيبة ما روى البغوي، أنبأنا منصور بن أبي مزاحم، أنبأنا أبو شيبة، عن الحكم، عن مقسم، عن ابن عباس: كان رسول الله ﷺ يصلي في شهر رمضان في غير جماعة بعشرين ركعة والوتر"[1]

''اور ابوشیبہ کی منکر روایات میں سے اس کی یہ روایت بھی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں جماعت کے بغیر بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔''

❁ امام ہیثمی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"عن ابن عباس قال: كان النبي ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر. رواه الطبراني في الكبير والأوسط وفيه أبو شيبة إبراهيم وهو ضعيف"[2]

'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔ اسے طبرانی نے ''کبیر'' اور ''اوسط'' میں روایت کیا ہے اوراس میں ''ابوشیبہ، ابراہیم'' ہے اور یہ ضعیف ہے۔''

❁ امام بوصیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۴۰ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] ميزان الاعتدال للذهبي (٤٨/١)

[2] مجمع الزوائد للهيثمي (٢٢٤/٣)

"وَمَدَارُ أَسَانِيدِهِمْ عَلَى إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ أَبِي شَيْبَةَ، وَهُوَ ضَعِيفٌ، وَمَعَ ضَعْفِهِ مُخَالِفٌ لِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِي صَحِيحِهِ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِاللَّيْلِ فِي رَمَضَانَ وَغَيْرِهِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً مِنْهَا رَكْعَتِي الْفَجْرِ" [1]

''ان کی سندوں کا دارومدار ابراہیم بن عثمان، ابو شیبہ پر ہے اور یہ ضعیف ہے۔ ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اس حدیث کے خلاف بھی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: اللہ کے رسول ﷺ کی رات کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعات ہوتی تھیں اور ان میں فجر کی دو رکعات بھی شامل ہوتی تھیں۔''

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"وأما ما رواه ابن أبي شيبة من حديث ابن عباس: كان رسول الله ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر فإسناده ضعيف وقد عارضه حديث عائشة هذا الذي في الصحيحين مع كونها أعلم بحال النبي ﷺ ليلا من غيرها" [2]

''اور ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے جو یہ روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے تو اس کی سند ضعیف ہے اور یہ حدیث صحیحین میں موجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] إتحاف الخيرة المهرة للبوصيري (٣٨٤/٢)

[2] فتح الباري لابن حجر (٢٥٤/٤)

کی اس حدیث کے خلاف بھی ہے، مزید یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی رات کی نماز سے متعلق دوسروں سے زیادہ جانکار ہیں۔"

❁ علامہ احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیتمی (المتوفی: ۹۷۴ھ) فرماتے ہیں:

"وَأَمَّا مَا وَرَدَ مِنْ طُرُقٍ أَنَّهُ ﷺ كَانَ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَالْوِتْرَ، وَفِي رِوَايَةٍ زِيَادَةُ: فِي غَيْرِ جَمَاعَةٍ، فَهُوَ شَدِيْدُ الضَّعْفِ، اشْتَدَّ كَلَامُ الْأَئِمَّةِ فِي أَحَدِ رُوَاتِهِ تَجْرِيحًا وَذَمًّا" [1]

"اور بعض طرق سے جو یہ وارد ہے کہ آپ ﷺ رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ بغیر جماعت کے پڑھتے تھے تو یہ سخت ضعیف ہے، اس کے ایک راوی کے بارے میں ائمہ نے سخت جرح اور مذمت کی ہے۔"

❁ امام سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی: ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں:

"هَذَا الْحَدِيثُ ضَعِيفٌ جِدًّا لَا تَقُومُ بِهِ حُجَّةٌ" [2]

"یہ حدیث بہت زیادہ ضعیف ہے اور اس سے حجت قائم نہیں ہوسکتی۔"

حدیثِ مذکور کی تضعیف کرنے والے حنفی اکابر:

❁ امام زیلعی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۶۲ھ) فرماتے ہیں:

"وَهُوَ مَعْلُولٌ، بِأَبِي شَيْبَةَ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ، جَدِّ الْإِمَامِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ، وَهُوَ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ، وَلَيَّنَهُ ابْنُ عَدِيٍّ

[1] الفتاوى الفقهية الكبرىٰ (١/١٩٤)

[2] الحاوي للفتاوىٰ (١/٤١٣)

فِيُ الْكَامِلِ، ثُمَّ إِنَّهُ مُخَالِفٌ لِلْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ عَنْ أَبِيُ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّهُ سَأَلَ عَائِشَةَ: كَيْفَ كَانَتْ صَلَاةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ؟ قَالَتْ: مَا كَانَ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ، وَلَا فِيْ غَيْرِهِ، عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً" [1]

''یہ روایت ابن ابی شیبہ کے دادا ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے معلول ہے۔ یہ بالاتفاق ضعیف ہے اور ابن عدی نے ''الکامل'' میں اسے ضعیف قرار دیا ہے، نیز یہ اس صحیح حدیث کے خلاف بھی ہے جس میں ہے کہ ابوسلمہ بن عبدالرحمان نے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رمضان میں اللہ کے رسول ﷺ کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ تو اماں عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: رمضان ہو یا غیر رمضان آپ ﷺ گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

❁ علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

"كذبه شعبة وضعفه أحمد وابن معين والبخاري والنسائي وغيرهم، و أورد له ابن عدي هذا الحديث في الكامل في مناكيره" [2]

''اسے امام شعبہ رحمہ اللہ نے جھوٹا قرار دیا ہے اور امام احمد، امام ابن معین، امام بخاری اور امام نسائی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عدی نے اس حدیث کو الکامل میں اس کی منکر احادیث میں گنایا ہے۔''

❁ علامہ ابن الہمام حنفی (المتوفی: ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] نصب الراية للزيلعي (۱۵۳/۲)

[2] عمدة القاري (۱۸۲/۱۱)

"وَأَمَّا مَا رَوَى ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ فِي مُصَنَّفِهِ وَالطَّبَرَانِيُ وَ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ ﷺ كَانَ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشْرِينَ رَكْعَةً سِوَى الْوِتْرِ فَضَعِيفٌ بِأَبِي شَيْبَةَ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ جَدِّ الْإِمَامِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ مَعَ مُخَالَفَتِهِ لِلصَّحِيحِ" [1]

''جسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اورطبرانی نے روایت کیا ہے اور جو بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھتے تھے،تو یہ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے، اس کے ساتھ یہ صحیح حدیث کے خلاف بھی ہے۔''

❁ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (المتوفی:۱۳۵۳ھ) کہتے ہیں:

"وأما النبي ﷺ فصح عنه ثمان ركعات، وأما عشرون ركعة فهو عنه بسند ضعيف وعلى ضعفه اتفاق" [2]

''اور جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے آٹھ رکعات پڑھی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس رکعات والی روایت ضعیف سند سے ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔''

یہاں غور کریں کہ علامہ کشمیری نے اس روایت کے ضعیف ہونے پر اتفاق نقل کیا ہے۔

---

[1] فتح القدير للكمال ابن الهمام (١/٤٦٧)

[2] العرف الشذي للكشميري (٢/٢٠٨)

❁ **علامہ ابو الطیب محمد بن عبدالقادر سندھی حنفی نے کہا:**

"و ورد عن ابن عباس قال: كان رسول الله ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر، رواه ابن أبي شيبة و إسناده ضعيف، وقد عارضه حديث عائشة هذا وهو في الصحيحين فلا تقوم به الحجة"[1]

"ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے اور یہ حدیث اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف ہے جو صحیحین میں ہے، لہٰذا بیس رکعات والی روایت سے حجت قائم نہیں ہوسکتی۔"

❁ **مولانا محمد زکریا "فضائلِ اعمال" والے کہتے ہیں:**

"لا شك أن تحديد التراويح في عشرين ركعة لم يثبت مرفوعا عن النبي ﷺ بطريق صحيح على أصول المحدثين وما ورد فيه من رواية ابن عباس فمتكلم فيها على أصولهم"[2]

"اس میں کوئی شک نہیں کہ بیس رکعات کی تحدید کرنا یہ اللہ کے نبی ﷺ سے مرفوعاً محدثین کے اصول کے مطابق صحیح سند سے ثابت نہیں ہے اور اس سلسلے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت ہے تو محدثین کے اصول کے مطابق اس میں کلام ہے۔"

---

[1] شرح الترمذي (٤٢٣/١)

[2] أوجز المسالك (٣٩٧/١)

- مولانا حبیب الرحمان اعظمی حنفی کہتے ہیں:

''بہرحال ہم کو اتنا تسلیم ہے کہ ابراہیم ضعیف راوی ہے اور اس کی وجہ سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔''[1]

- مولانا عبدالشکور لکھنوی نے کہا:

''اگرچہ نبی ﷺ سے آٹھ رکعت تراویح مسنون ہے اور ایک ضعیف روایت میں ابن عباس سے بیس رکعت بھی ....''[2]

- مولانا غلام حبیب دیوبندی لکھتے ہیں:

''ولکنهما ضعیفان''[3] ''لیکن یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔''

موصوف نے یہ بات بیس والی روایت کو دو کتابوں سے نقل کرنے کے بعد لکھی ہے۔

حدیث مذکور صحیح حدیث کے خلاف اور بالاتفاق مردود ہے:

بعض لوگ بے بسی میں یہ تو تسلیم کر لیتے ہیں کہ حدیثِ مذکور ضعیف ہے، لیکن پھر کہتے ہیں کہ اسے تلقی بالقبول حاصل ہے، اس لیے یہ حدیث ضعیف ہونے کے باوجود مقبول ہے۔

عرض ہے کہ یہ دعویٰ سراسر غلط ہے اور اس کے برعکس سچائی یہ ہے کہ اس حدیث کو امت نے قبول کرنے کے بجائے صحیح حدیث کے خلاف بتلا کر رد کر دیا ہے۔

- امام بوصیری رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۴۰ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] رکعاتِ تراویح، (ص: ۵۹) بحوالہ انوار مصابیح (ص: ۱۷۳)

[2] علم الفقہ (ص: ۱۹۸)

[3] ضياء المصابيح في مسئلة التراويح (ص: ۵)

”وَمَدَارُ أَسَانِيدِهِمْ عَلَى إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ أَبِي شَيْبَةَ، وَهُوَ ضَعِيفٌ، وَمَعَ ضَعْفِهِ مُخَالِفٌ لِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِي صَحِيحِهِ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ قَالَت:كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِاللَّيْلِ فِي رَمَضَانَ وَغَيْرِهِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً مِنْهَا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ“[1]

”ان کی سندوں کا دار و مدار ابراہیم بن عثمان، ابوشیبہ پر ہے اور یہ ضعیف ہے۔ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اس حدیث کے خلاف بھی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعات ہوتی تھیں جن میں فجر کی دو رکعات بھی شامل ہوتی تھیں۔“

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی:۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

”وأما ما رواه ابن أبي شيبة من حديث ابن عباس: كان رسول الله ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر فإسناده ضعيف، وقد عارضه حديث عائشة هذا الذي في الصحيحين مع كونها أعلم بحال النبي ﷺ ليلا من غيرها“[2]

”ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے جو یہ روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے تو اس کی

[1] إتحاف الخيرة المهرة للبوصيري (٣٨٤/٢)

[2] فتح الباري لابن حجر (٢٥٤/٤)

سند ضعیف ہے اور یہ حدیث صحیحین میں موجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف بھی ہے، مزید یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز سے متعلق دوسروں سے زیادہ جانکار ہیں۔‘‘

امام سیوطی رحمہ اللہ (المتوفی: ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں:

’’مَعَ تَصْرِيحِ الْحَافِظَيْنِ الْمَذْكُورَيْنِ نَقْلًا عَنِ الْحُفَّاظِ بِأَنَّ هَذَا الْحَدِيثَ مِمَّا أُنْكِرَ عَلَيْهِ، وَفِي ذَلِكَ كِفَايَةٌ فِي رَدِّهِ، وَهَذَا أَحَدُ الْوُجُوهِ الْمَرْدُودِ بِهَا‘‘[1]

’’مذکورہ دونوں حفاظ کا حفاظ کے حوالے سے یہ صراحت کرنا کہ یہ حدیث ابو شیبہ کی منکر حدیث ہے، اتنی بات اس حدیث کے مردود ہونے کے لیے کافی ہے اور یہ اسبابِ رد میں سے ایک سبب ہے۔‘‘

حنفیوں کے امام علامہ زیلعی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۶۲ھ) فرماتے ہیں:

’’وَهُوَ مَعْلُولٌ بِأَبِي شَيْبَةَ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ، جَدِّ الْإِمَامِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ، وَهُوَ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ، وَلَيَّنَهُ ابْنُ عَدِيٍّ فِي ”الْكَامِلِ“، ثُمَّ إِنَّهُ مُخَالِفٌ لِلْحَدِيثِ الصَّحِيحِ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّهُ سَأَلَ عَائِشَةَ: كَيْفَ كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي رَمَضَانَ؟، قَالَتْ: مَا كَانَ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ، وَلَا فِي غَيْرِهِ، عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً‘‘[2]

’’یہ روایت ابن ابی شیبہ کے دادا ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے

[1] الحاوي للفتاوى (١/٤١٤)

[2] نصب الراية للزيلعي (٢/١٥٣)

معلول ہے اور یہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ ابن عدی نے ''الکامل'' میں اسے ضعیف قرار دیا ہے، نیز یہ اس صحیح حدیث کے خلاف بھی ہے جس میں ہے کہ ابوسلمہ بن عبدالرحمان نے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رمضان میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: رمضان ہو یا غیر رمضان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

❀ علامہ ابن الہمام حنفی (المتوفی: ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"وَأَمَّا مَا رَوَى ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ فِي مُصَنَّفِهِ وَالطَّبَرَانِيُّ وَعِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ ﷺ كَانَ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشْرِينَ رَكْعَةً سِوَى الْوِتْرِ فَضَعِيفٌ بِأَبِي شَيْبَةَ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عُثْمَانَ جَدِّ الْإِمَامِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ مُتَّفَقٌ عَلَى ضَعْفِهِ مَعَ مُخَالَفَتِهِ لِلصَّحِيحِ"[1]

''اور جسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور جو بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھتے تھے تو یہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے، اس کے ساتھ یہ بات صحیح حدیث کے خلاف بھی ہے۔''

❀ علامہ ابوالطیب محمد بن عبدالقادر سندھی حنفی نے کہا ہے:

"و ورد عن ابن عباس قال: كان رسول الله ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر، رواه ابن أبي شيبة و إسناده

---

[1] فتح القدير للكمال ابن الهمام (٤٦٧/١)

ضعيف، وقد عارضه حديث عائشة هذا وهو في الصحيحين فلا تقوم به الحجة"[1]

"ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے اور یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کے خلاف ہے اور یہ صحیحین میں ہے، لہٰذا بیس رکعات والی روایت سے حجت قائم نہیں ہوسکتی۔"

ان حوالوں کی روشنی میں بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ احناف کا یہ دعویٰ کہ "بیس رکعات والی اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے" محض ایک مغالطہ ہے۔

رہی یہ بات کہ پھر جن لوگوں نے بیس رکعات تراویح پڑھی ہے ان لوگوں کی کیا دلیل ہے؟ تو عرض ہے کہ صرف بیس ہی نہیں، بلکہ بعض نے بیس سے بھی زائد پڑھی ہے، سوال یہ ہے کہ بیس سے زائد والوں کی کیا دلیل ہے؟

دراصل آٹھ سے زائد جن لوگوں نے پڑھی ہے، ان لوگوں نے اسے سنتِ رسول سمجھ کر نہیں، بلکہ عام نفل سمجھ کر پڑھی ہے۔ بعض نے جو بیس کی تعداد اختیار کی ہے وہ اسی قبیل سے ہے اور بعض نے سلف کے بعض آثار کے پیشِ نظر بیس کی تعداد اختیار کی، لیکن کسی بھی ثقہ اور معتبر عالم نے بیس رکعات والی ضعیف اور مرفوع روایت کو بنیاد نہیں بنایا۔

حدیثِ مذکور موضوع (من گھڑت) ہے:

مذکورہ حدیث کے مردود ہونے پر تو اہلِ علم کا اتفاق ہے، لیکن یہ حدیث مردود

[1] شرح الترمذي (١/٤٢٣)

ہونے میں کس درجے کی ہے؟ اس بابت اہلِ فن کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے اسے ضعیف کہا ہے تو کسی نے "ضعیف جداً" کہا، تو کسی نے معلول کہا، تو کسی نے منکر کہا اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے موضوع کہا۔[1] یہی آخری بات ہی راجح ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان نامی جھوٹا راوی موجود ہے اور یہ صحیح روایت کے مخالف بھی ہے۔

- امام شعبہ بن الحجاج رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۶۰ھ) فرماتے ہیں:

"كذب وَاللّٰه"[2] "اللہ کی قسم اس نے جھوٹ بولا۔"

- علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۵ھ) نے امام شعبہ کی اس جرح کو برضا و رغبت نقل کرتے ہوئے کہا:

"كذبه شعبة وضعفه أحمد وابن معين والبخاري والنسائي وغيرهم، و أورد له ابن عدي هذا الحديث في الكامل في مناكيره"[3]

"اسے امام شعبہ رحمہ اللہ نے جھوٹا قرار دیا ہے، اور امام احمد، امام ابن معین، امام بخاری اور امام نسائی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن عدی نے اس حدیث کو الکامل میں اس کی منکر احادیث میں گنایا ہے۔"

- امام سیوطی نے بھی امام شعبہ رحمہ اللہ کی اس جرح کو برضا و تسلیم نقل کرتے ہوئے کہا: "وَمَنْ يُكَذِّبُهُ مِثْلُ شُعْبَةَ فَلَا يُلْتَفَتُ إِلَى حَدِيثِهِ"[4]

---

[1] الضعيفة (٥٦٠)

[2] العلل ومعرفة الرجال (٢٨٧/١) وإسناده صحيح

[3] عمدة القاري (١٨٢/١١)

[4] الحاوي للفتاوى (٤١٤/١)

''اور جسے امام شعبہ رحمہ اللہ جیسے محدث جھوٹا کہہ دیں، اس کی حدیث ناقابلِ التفات ہے۔''

دو شبہات کا ازالہ:

1 کہا جاتا ہے کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے ابراہیم بن عثمان کو جو جھوٹا کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم بن عثمان نے الحکم سے یہ روایت بیان کی کہ جنگِ صفین میں ستر بدری صحابہ نے شرکت کی، لیکن امام شعبہ رحمہ اللہ نے خود الحکم سے اس موضوع پر مذاکرہ کیا تو الحکم کے ساتھ اس مذاکرہ میں خزیمہ بن ثابت کے علاوہ کسی اور کی شرکت معلوم نہ ہوسکی، حالانکہ یہ معروف بات ہے کہ جنگِ صفین میں متعدد صحابہ نے شرکت کی۔ اسی لیے امام ذہبی رحمہ اللہ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''قلت: سبحان الله، أما شهدها علي! أما شهدها عمار''[1]

''میں کہتا ہوں: سبحان اللہ! کیا علی رضی اللہ عنہ اس میں شریک نہیں تھے؟ کیا عمار رضی اللہ عنہ اس میں شریک نہیں تھے؟''

عرض ہے کہ جنگِ صفین میں کتنے لوگ شریک تھے؟ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ الحکم نے کتنی تعداد بتلائی ہے۔

امام عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۰ھ) فرماتے ہیں:

''حَدثنِيُ أبيُ قَالَ حَدثنَا أُمَيَّةُ بنُ خَالِد قَالَ: قلت لشعبة: إِنَّ أَبَا شيبَةَ حَدثنَا عَن الحكم عَن عبد الرَّحْمَن بن أبيُ ليلى أَنه قَالَ: شهد صفّين من أهل بدر سَبْعُونَ رجلا. قَالَ: كذب

[1] ميزان الاعتدال للذهبي (٤٧/١)

وَاللّٰه لقد ذاكرت الحكم ذَاكَ وَذَكَرْنَاهُ فِيْ بَيته فَمَا وجدنَا شهد صفّين أحد من أهل بدر غير خُزَيْمَة بن ثَابت“[1]

”امیہ بن خالد کہتے ہیں: میں نے امام شعبہ سے کہا: ابو شیبہ نے مجھ سے بیان کیا: ”حكم عن عبد الرحمن بن أبي ليلى“ کی سند سے کہ عبدالرحمان بن ابی لیلی نے کہا: صفین میں ستر بدری صحابہ نے شرکت کی تو امام شعبہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کی قسم! ابو شیبہ نے جھوٹ کہا، میں نے تو حکم سے اس سلسلے میں مذاکرہ کیا اور ان کے گھر میں اس بارے میں بات ہوئی تو ہم نے نہیں پایا کہ اہلِ بدر میں سے خزیمہ بن ثابت کے علاوہ کسی نے صفین میں شرکت کی۔“

یعنی ابراہیم بن عثمان نے الحکم کے حوالے سے ستر کی تعداد بتلائی، لیکن امام شعبہ نے الحکم سے مذاکرہ کیا تو الحکم کو صرف ایک ہی صحابی کی شرکت کی بات معلوم تھی۔ یعنی امام شعبہ رحمہ اللہ نے ابراہیم بن عثمان کو اصحابِ صفین کی تعداد نقل کرنے میں جھوٹا نہیں کہا، بلکہ یہ تعداد الحکم کے حوالے سے نقل کرنے پر جھوٹا کہا، کیوں کہ الحکم کو اس تعداد کا علم ہی نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ابراہیم بن عثمان نے الحکم پر جھوٹ بولا تھا۔

رہا امام ذہبی رحمہ اللہ کا اظہارِ تعجب تو محض الحکم کی معلومات پر ہے، یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں کہ الحکم کو اصحابِ صفین میں سے صرف ایک ہی نام کا علم کیسے رہا، جب کہ اور لوگ بھی اس میں شریک تھے، یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ کا اظہارِ تعجب الحکم کی معلومات پر ہے نہ کہ ابراہیم بن عثمان کو جھوٹا کہے جانے پر، ایسی صورت میں امام ذہبی رحمہ اللہ کا یہ اظہار تعجب تو ابراہیم بن عثمان کے

---

[1] العلل ومعرفة الرجال لأحمد رواية ابنه عبد الله (٢٨٧/١) وإسناده صحيح

کذاب ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیوں کہ جس شخص کو صرف ایک صحابی کی شرکت معلوم ہو، عین اسی شخص سے ستر صحابہ کی شرکت نقل کرنا بہت بڑا جھوٹ ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مذاکرہ میں الحکم نے یہ تو نہیں کہا کہ میں نے ابراہیم سے یہ تعداد نہیں بیان کی۔ تو عرض ہے کہ مذاکرہ میں الحکم کے سامنے اس بات کا تذکرہ ہی کہاں ہوا کہ ان کے حوالے سے ابراہیم بن عثمان ستر صحابہ کی شرکت بیان کر رہا ہے۔ مذاکرہ تو اس بات پر تھا کہ جنگِ صفین میں کتنے بدری صحابہ نے شرکت کی اور اس مذاکرہ میں خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اور نام سامنے نہ آ سکا، تو اسی بات کو امام شعبہ رحمہ اللہ نے دلیل بنایا ہے کہ جب الحکم کو صرف ایک ہی صحابی کا نام معلوم تھا تو انھیں کے حوالے سے ابراہیم بن عثمان نے ستر صحابہ کا نام کیسے بتا دیا؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیم بن عثمان نے الحکم پر جھوٹ بولا ہے۔[1]

2 بعض لوگ کہتے ہیں: کذب کا اطلاق غلطی پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا امام شعبہ نے جو کذب کی بات کہی ہے وہ غلطی کرنے کے معنی میں ہے۔ عرض ہے:

أولاً: تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کہ ابراہیم بن عثمان کو کثیر الغلط کے معنی میں جھوٹا کہا گیا ہے، کیوں کہ مطلقاً جب کسی کے کذب کی بات کہی جائے تو حقیقی معنی ہی مراد ہوگا، اِلا یہ کہ کوئی قرینہ مل جائے اور یہاں کوئی قرینہ نہیں۔

ثانیاً: امام شعبہ رحمہ اللہ کے دیگر اقوال اس بات پر زبردست شاہد ہیں کہ انھوں نے ابراہیم بن عثمان کو حقیقی معنوں میں جھوٹا قرار دیا ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: علامہ نذیر احمد املوی رحمہ اللہ کی کتاب: أنوار المصابیح (ص: ۱۷۳۔۱۷۷)

”أخبرنا محمد بن أحمد بن رزق، أخبرنا جعفر بن محمد ابن نصير الخالدي، حدثنا محمد بن عبد اللّٰه بن سليمان الحضرمي، حدثنا محمد بن موسى، حدثنا المثنى هو ابن معاذ حدثنا أبي قال: كتبت إلى شعبة وهو ببغداد أسأله عن أبي شيبة القاضي أروي عنه؟ قال: فكتب إلي: لا ترو عنه فإنه رجل مذموم، وإذا قرأت كتابي فمزقه“[1]

”معاذ کہتے ہیں کہ میں نے امام شعبہ کو خط لکھا وہ بغداد میں تھے۔ میں ان سے ابو شیبہ قاضی کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ کیا میں اس سے روایت کروں؟ تو امام شعبہ رحمہ اللہ نے جواباً مجھے لکھا: تم اس سے روایت مت کرو، کیوں کہ وہ برا شخص ہے اور اس خط کو پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ دینا۔“

امام شعبہ رحمہ اللہ کے اس قول پر غور کیجیے! اس میں امام شعبہ، ابراہیم کو برا آدمی کہہ رہے ہیں۔ غور کریں کہ اگر امام شعبہ کی نظر میں ابراہیم بن عثمان دیندار شخص ہوتا اور اس کے تعلق سے امام شعبہ نے کذب، غلطی کے معنی میں استعمال کیا ہوتا تو اسے رجل مذموم (برا آدمی) نہ کہتے۔ معلوم ہوا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے حقیقی معنی میں کذب کا اطلاق کیا ہے۔

تنبیہ: بعض احناف نے کہا ہے کہ ابو شیبہ سے امام شعبہ نے روایت کی ہے، اس لیے یہ ثقہ ہے، کیوں کہ امام شعبہ صرف ثقہ ہی سے روایت کرتے تھے۔ عرض ہے:

أولا: گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے ابو شیبہ کو نہ صرف جھوٹا کہا

---

[1] تاريخ بغداد (١٠/٦) وإسناده صحيح، وأخرجه أيضا ابن حبان في المجروحين (١٠٤/١) من طريق المثنى به.

ہے، بلکہ اس سے روایت لینے سے بھی دوسروں کو منع کر رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ نے اس شخص سے روایت لینا ترک کر دیا تھا اور دوسروں کو بھی اس سے روایت لینے سے منع کرتے تھے۔

ثانیاً: بالفرض مان بھی لیں کہ امام شعبہ رحمہ اللہ اس کی تکذیب کرنے کے بعد بھی اس سے روایت لیتے تھے تو بھی اس سے شعبہ کی روایت، اس کی توثیق ہرگز نہیں بن سکتی، کیوں کہ شعبہ نے خود اسے صراحتا جھوٹا قرار دیا ہے، لہٰذا امام شعبہ کی اس خاص صراحت کی روشنی میں، اس کا معاملہ امام شعبہ کے عام طرزِ عمل سے مستثنیٰ قرار پائے گا۔

معلوم ہوا کہ اس روایت میں موجود ابو شیبہ، ابراہم بن عثمان نامی راوی پر جھوٹ بولنے کی جرح ہے اور اس کا جھوٹ بولنا ثابت بھی ہے، لہٰذا اس کی بیان کردہ یہ روایت موضوع و من گھڑت ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ احمد بن محمد بن جعفر قدوری حنفی نے ایک روایت سے متعلق کہا ہے:

”ولأن أبا شيبة إبراهيم بن عثمان قاضي واسط كذاب“[1]

”کیوں کہ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان، واسط کا قاضی بہت بڑا جھوٹا ہے۔“



[1] كتاب التجريد للقدوري (ص: ٢٠٣)

دوسری مرفوع روایت (حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ)

ابو القاسم حمزہ بن یوسف بن ابراہیم السہمی القرشی الجرجانی (المتوفی: ۴۲۷ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا أَبُو الْحَسَنِ عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ أَحْمَدَ الْقَصْرِيُّ الشَّيْخُ الصَّالِحُ رَحِمَهُ اللّٰهُ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ الْعَبْدُ الصَّالِحُ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ حُمَيْدٍ الرَّازِيُّ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ هَارُونَ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْحنازِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عَتِيكٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: خَرَجَ النبي ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فِي رَمَضَانَ فَصَلَّى النَّاسَّ أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ رَكْعَةً وَأَوْتَرَ بِثَلَاثَةٍ"[1]

"جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رمضان میں ایک رات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور لوگوں کو چوبیس رکعات اور تین رکعات وتر پڑھائے۔"

یہ روایت موضوع و من گھڑت ہے، اس میں درج ذیل علتیں ہیں:

پہلی علت:

اس کی سند میں "عبد الرحمان بن عطاء بن أبي لبيبة" ہے، اس

---

[1] تاریخ جرجان (ص: ۳۱۷)

کے بارے میں ناقدین کے اقوال ملاحظہ ہوں:

❁ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

”فِيهِ نَظَرٌ“[1] ”اس میں نظر ہے۔“

❁ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

”ممن لا يحتج به فيما ينفرد به فكيف فيما خالفه فيه من هو أثبت منه“[2]

”اگر یہ منفرد ہو تو بھی حجت نہیں، پھر جس میں اس نے اپنے سے اوثق کی مخالفت کی ہو اس کا کیا حال ہوگا۔“

نیز کہا:

”ليس عندهم بذلك، وترك مالك الرواية عنه وهو جاره، وحسبك بهذا“[3]

”یہ محدثین کے نزدیک ثقہ نہیں ہے۔ امام مالک نے اس سے روایت ترک کر دی ہے، جب کہ امام مالک اس کے پڑوسی تھے، یہی بات کافی ہے“

دوسری علت:

اس کی سند میں ”عمر بن ہارون“ بھی ہے اس کے بارے میں ناقدین کے اقوال ملاحظہ ہوں:

❁ امام عبد الرحمان بن مہدی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں:

”لَمْ تكن لَهُ قيمة عندي“[4]

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (۳۳۶/۵)

[2] الاستذكار (۸۳/٤)

[3] التمهيد لابن عبد البر (۲۲۸/۱۷)

[4] الكامل لابن عدي (۵۷/٦) وإسناده صحيح

”میرے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔“

❀ امام ابن سعد رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں:

”تَرَكوا حَدِيثه“[1] ”محدثین نے اس کی حدیث چھوڑ دی ہے۔“

❀ امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

”عمر بن هارون كذاب“[2] ”عمر بن ہارون بہت بڑا جھوٹا ہے۔“

❀ امام ابن حبان نے ابن معین کی تائید کرتے ہوئے کہا:

”والمناكير في روايته تدل على صحة ما قال يحيى بن معين فيه“[3]

”اس کی روایات میں مناکیر کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ امام ابن معین نے اس کے بارے میں جو (کذاب) کہا ہے وہ صحیح ہے۔“

❀ امام صالح بن محمد جزرہ رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

”كان كذابا“[4] ”یہ بہت بڑا جھوٹا تھا۔“

❀ امام ابن المبارک رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

”هو كذاب“[5] ”یہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔“

نوٹ: امام صالح بن محمد اور ابن مبارک رحمہما اللہ کے اقوال کی سند ضعیف ہے، لیکن ابن معین کا قول بسند صحیح ثابت ہے اور ابن حبان نے بھی ان کی تائید کی ہے۔

---

(1) الطبقات الكبير لابن سعد (۳۷۸/۹)

(2) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (۱٤۱/٦) وإسناده صحيح

(3) المجروحين لابن حبان (۹۱/۲)

(4) تاريخ بغداد للخطيب البغدادي (۱۳/۱۵) وإسناده ضعيف

(5) تاريخ بغداد للخطيب البغدادي (۱۳/۱۵) وإسناده ضعيف

❁ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

"لا أروي عنه شيئا"[1] "میں اس سے کچھ بھی روایت نہیں کرتا۔"

❁ امام جوزجانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۹ھ) فرماتے ہیں:

"عمر بن هارون: لم يقنع الناس بحديثه"[2]

"عمر بن ہارون کی حدیث سے محدثین راضی نہیں ہیں۔"

❁ امام عجلی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"عمر بن هارون بن يزيد الثقفى ضعيف"[3]

"عمر بن ہارون الثقفی ضعیف ہے۔"

❁ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں:

"الناس تركوا حديثه"[4]

"لوگوں نے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔"

❁ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

"ضعيف الحديث"[5] "یہ ضعیف الحدیث ہے۔"

❁ امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"عمر بن هَارُون الْبَلْخِيُ مَتْرُوك الحَدِيث بَصرِيُ"[6]

"عمر بن ہارون البلخی، یہ متروک الحدیث ہے، بصری ہے۔"

---

[1] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١٤١/٦) وإسناده صحيح

[2] أحوال الرجال للجوزجاني (ص: ٣٥٥)

[3] تاريخ الثقات للعجلي (١٧١/٢)

[4] الجرح والتعديل(١٤١/٦) وإسناده صحيح

[5] الجرح والتعديل لابن أبي حاتم (١٤١/٦)]

[6] الضعفاء والمتروكون للنسائي (ص: ٨٤)

۞ امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"كان ممن يروي عن الثقات المعضلات ويدعي شيوخا لم يرهم"[1]

''یہ ثقہ رواۃ سے معضلات بیان کرتا تھا اور ایسے اساتذہ کا دعویٰ کرتا تھا جن کو دیکھا بھی نہیں تھا۔''

۞ امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

"عمر بن هارون البلخي، ضعيف"[2]

''عمر بن ہارون البلخی ضعیف ہے۔''

۞ امام ابو نعیم رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں:

" لَا شَيْءُ"[3] ''اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

۞ امام ابن القیسرانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۰۷ھ) فرماتے ہیں:

"عمر بن هارون البلخى ليس بشيئ في الحديث"[4]

''عمر بن ہارون کی حدیث میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

۞ امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

"واه اتهمه بعضهم"[5]

''یہ سخت ضعیف ہے اور بعض نے اسے متہم کہا ہے۔''

---

[1] المجروحين لابن حبان (۹۰/۲)

[2] كتاب الضعفاء والمتروكين للدارقطني (ص: ١٦)

[3] الضعفاء لأبي نعيم (ص: ١١٣)

[4] معرفة التذكرة لابن القيسراني (ص: ١٧٦)

[5] الكاشف للذهبي (٧٠/٢)

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"متروك وكان حافظا"[1] "یہ متروک ہے اور حافظ تھا۔"

تیسری علت:

محمد بن حمید الرازی یہ کذاب اور بہت بڑا جھوٹا راوی ہے، جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "یزید بن معاویہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ" (ص: ۴۰۶) میں ثابت کیا ہے۔ اس کے بارے میں بعض محدثین کے اقوال ملاحظہ ہوں:

❁ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"فِيهِ نَظَرٌ"[2] "اس میں نظر ہے۔"

❁ امام جوزجانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۹ھ) فرماتے ہیں:

"محمد بن حميد الرازي: كان ردئ المذهب، غير ثقة"[3]

"محمد بن حمید الرازی، یہ بدمذہب اور غیر ثقہ تھا۔"

❁ ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی، (المتوفی: ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

"هذا كذاب"[4] "یہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔"

❁ امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"كان ممن ينفرد عن الثقات بالأشياء المقلوبات"[5]

"یہ ثقات سے الٹ پلٹ باتیں بیان کرنے میں منفرد ہوتا تھا۔"

---

(1) تقريب التهذيب لابن حجر، (رقم: ٤٩٧٩)

(2) التاريخ الكبير للبخاري (٦٩/١)

(3) أحوال الرجال للجوزجاني (ص: ٣٥٠)

(4) الضعفاء لأبي زرعة الرازي (٧٣٩/٢)

(5) المجروحين لابن حبان (٣٠٣/٢)

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"محمد بن حميد بن حيان الرازي حافظ ضعيف"[1]

''محمد بن حمید بن حیان الرازی، یہ حافظ اور ضعیف ہے۔''

❁ مولانا خان بادشاہ بن چاندی گل دیوبندی لکھتے ہیں:

''کیوں کہ یہ کذاب اور اکذب اور منکر الحدیث ہے۔''[2]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت:

جابر رضی اللہ عنہ سے منقول مذکورہ روایت موضوع اور من گھڑت ہونے کے ساتھ ساتھ جابر رضی اللہ عنہ ہی سے منقول صحیح حدیث کے خلاف بھی ہے، کیوں کہ جابر رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعاتِ تراویح پڑھائیں۔ كما مضى[3]



[1] تقريب (رقم: ٥٨٣٤)

[2] القول المبين في إثبات التراويح العشرين والرد على الألباني المسكين (ص: ٣٣٤)
نیز دیکھیں: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ نماز، از: مفتی جمیل (ص: ۳۰۱)

[3] اسی کتاب کا صفحہ (۱۱۹) دیکھیں۔

باب 3

بیس رکعات سے متعلق بعض آثارِ صحابہ کا جائزہ

بیس رکعاتِ تراویح سے متعلق پیش کردہ احادیث کی دوسری قسم موقوف روایات ہیں، یعنی وہ روایات جو صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں۔ یہ کل پانچ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں:

- عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا اثر۔
- علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اثر۔
- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر۔
- ابی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کا اثر۔
- عبدالرحمان بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کا اثر۔

1 عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا اثر

یہ اثر تین طرق سے مروی ہے:

پہلا طریق از اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ:

امام ضیاء المقدسی رحمہ اللہ (المتوفی: ٦٤٣ھ) فرماتے ہیں:

”أخبرنا أبو عبد الله محمود بن أحمد بن عبد الرحمن الثقفي بأصبهان أن سعيد بن أبي الرجاء الصيرفي

أخبرهم قراءة عليه، أنا عبد الواحد بن أحمد البقال، أنا عبيد الله بن يعقوب بن إسحاق، أنا جدي إسحاق بن إبراهيم بن محمد بن جميل، أنا أحمد بن منيع، أنا الحسن ابن موسى، نا أبو جعفر الرازي عن الربيع بن أنس عن أبي العالية عن أبي بن كعب أن عمر أمر أبيا أن يصلي بالناس في رمضان، فقال: إن الناس يصومون النهار ولا يحسنون أن (يقرؤا) فلو قرأت القرآن عليهم بالليل، فقال: يا أمير المؤمنين هذا (شيئ) لم يكن، فقال قد علمت ولكنه أحسن فصلى بهم عشرين ركعة"[1]

''عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو نماز پڑھائیں اور کہا: لوگ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور اچھی طرح قرآن نہیں پڑھ سکتے، تو اگر رات میں تم انھیں قرآن پڑھ کر سنا دو تو بہتر رہے گا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیرالمومنین! یہ چیز پہلے نہیں ہوئی ہے۔ تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے معلوم ہے، لیکن یہ بہتر ہے۔ پھر انھوں نے لوگوں کو بیس رکعات پڑھائیں۔''

یہ روایت ضعیف ہے، اس کی سند میں موجود ''ابوجعفرالرازی'' کے حافظے پر کلام ہے۔

❁ امام ابوزرعہ الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں:

"شيخ يهم كثيرا"[2] ''یہ شیخ ہے بہت زیادہ وہم کا شکار ہوتا ہے۔''

---

[1] الأحاديث المختارة للضياء المقدسي (٨٦/٢)

[2] الضعفاء لأبي زرعة الرازي (٤٤٣/٢)

امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"كان ممن ينفرد بالمناكير عن المشاهير لا يعجبني الاحتجاج بخبره إلا فيما وافق الثقات"[1]

"یہ مشہور لوگوں سے منکر روایات کے بیان میں منفرد ہوتا تھا، اس کی حدیث سے حجت پکڑنا مجھے پسند نہیں اِلا یہ کہ ثقہ رواۃ سے اس کی تائید مل جائے۔"

اس کے حافظے پر کلام ہونے کے ساتھ ساتھ خاص الربیع بن انس سے اس کی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

امام ابن حبان نے یہ بھی فرمایا:

"والناس يتقون حديثه ما كان من رواية أبي جعفر عنه لأن فيها اضطراب كثير"[2]

"لوگ الربیع بن انس سے ابوجعفر کی روایات سے بچتے ہیں، کیوں کہ ان میں بہت اضطراب ہوتا ہے۔"

اور زیرِ بحث روایت اسی طریق سے ہے، لہٰذا ضعیف ہے۔ یاد رہے کہ متعدد حنفی حضرات نے بھی اس راوی کو ضعیف تسلیم کیا ہے۔[3]

تنبیہ بلیغ: امام ابو داود رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا شُجَاعُ بْنُ مَخْلَدٍ، حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ، أَخْبَرَنَا يُونُسُ بْنُ

---

[1] المجروحين لابن حبان (١٢٠/٢)

[2] الثقات لابن حبان، ط العثمانية (٢٢٨/٤)

[3] دیکھیں: الجوهرالنقي (ج٢/٢٠١)، آثارالسنن (٢٢١)، أوجز المسالك (١٢٣/٢)، نیز دیکھیں: غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم (٣٢٧/٢)

عُبَيْدٍ، عَنِ الْحَسَنِ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ جَمَعَ النَّاسَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، فَكَانَ يُصَلِّي لَهُمْ عِشْرِينَ لَيْلَةً، وَلَا يَقْنُتُ بِهِمْ إِلَّا فِي النِّصْفِ الْبَاقِي، فَإِذَا كَانَتِ الْعَشْرُ الْأَوَاخِرُ تَخَلَّفَ فَصَلَّى فِي بَيْتِهِ، فَكَانُوا يَقُولُونَ: أَبَقَ أُبَيٌّ" [1]

"سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع فرما دیا۔ وہ انھیں بیس رات نماز پڑھاتے تھے اور قنوت نہ کرتے تھے، مگر نصف اخیر میں قنوت کرتے تھے اور جب آخری عشرہ آ جاتا تو جماعت کرانا چھوڑ دیتے اور اپنے گھر میں پڑھتے تھے تو لوگ کہتے کہ اُبی بھاگ گئے۔"

اس روایت میں بیس رات کا ذکر ہے، لیکن افسوس کچھ لوگوں نے اس میں تحریف کر کے اسے بیس رکعت بنا دیا ہے۔

سنن ابی داود کے کسی بھی معتبر نسخے میں رات کی جگہ رکعت کا لفظ نہیں ہے۔ احناف کے پسندیدہ محقق محمد عوامہ نے بھی سنن ابی داود کی تحقیق کی ہے اور اس روایت پر حاشیہ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لهم عشرين ليلة من الأصول كلها" [2]

"یعنی اصل تمام مخطوطات میں بیس رات ہی کا ذکر ہے۔"

جب تمام مخطوطات میں رات ہی کا ذکر ہے تو رات کو رکعت بنا دینا تحریف نہیں تو اور کیا ہے؟!

رہی یہ بات کہ بعض اہلِ علم نے ابو داود ہی سے یہ روایت نقل کی ہے اور

---

[1] سنن أبي داود (٤٥٤/١، رقم: ١٤٢٩)

[2] سنن أبي داود بتحقيق عوامة (٢٥٦/٢)

رات کی جگہ رکعت کا لفظ نقل کیا ہے تو عرض ہے کہ اہلِ علم کی اکثریت نے تو ابوداود ہی سے اس روایت کو رات کے لفظ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے، جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اصل روایت رات کے لفظ کے ساتھ ہے اور جن کتابوں میں رکعت کے لفظ کے ساتھ نقل ہو گیا وہ کتابت کی غلطی یا وہم ہے۔

بالخصوص جب کہ بیس رکعت کا پروپیگنڈہ خوب کیا گیا ہے اس لیے تراویح کی بحث میں عشرین کا لفظ دیکھتے ہیں، اس کے ساتھ رکعت لکھنے کے وہم میں پڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اصل کتاب کے نسخوں میں رکعت کے لفظ کا ثبوت دکھایا جائے اور پھر ان نسخوں کی اس بات کی ترجیح بھی دلائل کے ساتھ ثابت کی جائے۔[1]

اس کے ساتھ یہ روایت ضعیف ہی ہے، کیوں کہ حسن بصری مدلس ہیں اور روایت عن سے ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ابن حجر نے طبقات المدلسین میں اسے مدلسین کے دوسرے طبقے میں رکھا ہے جن کی معنعن روایت مقبول ہوتی ہے، عرض ہے کہ حسن بصری کو دوسرے طبقے میں رکھنا درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ کثیر التدلیس ہیں اور جو مدلس کثیر التدلیس ہو وہ تیسرے طبقے کا ہوتا ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۸) نے کہا:

”كان الحسن كثير التدليس، فإذا قال في حديث: عن فلان، ضعف سماعه، ولا سيما عمن قيل: إنه لم يسمع منهم“[2]

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ”نعم الشهود على تحريف الغالين في سنن أبي داود للشيخ سلطان محمود. نیز دیکھیں: قرآن و حدیث میں تحریف (ص: ۲۱۰۔۲۴۲)

[2] میزان الاعتدال، ن مؤسسة الرسالة (۴۸۱/۱)

''حسن بصری کثیر التدلیس ہیں، لہٰذا جب یہ کسی حدیث میں عن فلاں کہیں تو ان کا سماع ضعیف ہوگا، بالخصوص جب یہ ایسے لوگوں سے عن سے روایت کریں جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے ان سے نہیں سنا ہے۔''

یہ دونوں باتیں اس روایت میں ہیں، کیوں کہ حسن بصری نے یہاں عن سے روایت کیا ہے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جن سے ان کا سماع ہی ثابت نہیں ہے۔

رہی بات یہ کہ اگر یہ کثیر التدلیس ہیں اور ان کا عنعنہ مضر ہے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں دوسرے طبقے میں کیوں رکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا تسامح ہے اور خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی دوسرے مقام پر کہا:

"وهو مع ذلك كثير الإرسال فلا تحمل عنعنته على السماع"[1]

''حسن بصری اس کے ساتھ کثیر الارسال ہیں اس لیے ان کا عنعنہ سماع پر محمول نہیں۔''

لیجیے خود ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی فیصلہ کر دیا کہ حسن بصری کا عنعنہ سماع پر محمول نہیں ہوگا۔ علاوہ بریں حسن بصری کی ملاقات عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہیں۔ علامہ عینی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

"إن فيه انقطاعًا، فإن الحسن لم يدرك عمر بن الخطاب"[2]

''اس میں انقطاع ہے، کیوں کہ حسن بصری نے عمر بن الخطاب کا زمانہ نہیں پایا۔''

---

[1] فتح الباري لابن حجر، ط السلفية (۱/۱۰۹)

[2] شرح أبي داود للعيني (۵/۳۴۳)

دوسرا طریق از سائب بن یزید رضی اللہ عنہ:

اس طریق سے تین لوگوں نے روایت کیا ہے:

1 پہلی روایت از حارث بن عبدالرحمان۔ امام عبد الرزاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۱۱ھ) فرماتے ہیں:

"عَنِ الْأَسْلَمِيِّ، عَنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي ذُبَابٍ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ: كُنَّا نَنْصَرِفُ مِنَ الْقِيَامِ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ، وَقَدْ دَنَا فُرُوعُ الْفَجْرِ، وَكَانَ الْقِيَامُ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ ثَلَاثَةً وَعِشْرِينَ رَكْعَةً"[1]

2 دوسری روایت از یزید بن خصیفہ۔ علی بن الجعد بن عبید البغدادی (المتوفی: ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں:

"أَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ:كَانُوا يَقُومُونَ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ بِعِشْرِينَ رَكْعَةً، وَإِنْ كَانُوا لَيَقْرَءُونَ بِالْمِئِينَ مِنَ الْقُرْآنِ"[2]

3 تیسری روایت از محمد بن یوسف۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۱۱ھ) فرماتے ہیں:

"عَنْ دَاوُدَ بْنِ قَيْسٍ، وَغَيْرِهِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، أَنَّ عُمَرَ جَمَعَ النَّاسَ فِي رَمَضَانَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَعَلَى تَمِيمٍ الدَّارِيِّ عَلَى إِحْدَى وَعِشْرِينَ

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٢٦١/٤) یہ روایت موضوع ہے اور اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اسی کتاب کا صفحہ (۱۷۶) دیکھیں۔

[2] مسند ابن الجعد (ص: ٤١٣) یہ روایت شاذ یعنی ضعیف ہے اور اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اسی کتاب کا صفحہ (۱۸۱) دیکھیں۔

رَكْعَةً يَقْرَءُونَ بِالْمِئِينَ وَيَنْصَرِفُونَ عِنْدَ فُرُوعِ الْفَجْرِ"[1]

تیسرا طریق از محذوف راوی:

اس طریق سے تین لوگوں نے روایت کیا ہے:

1 **پہلی روایت از یزید بن رومان۔ امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں:**

"عَنْ يَزِيدَ بْنِ رُومَانَ أَنَّهُ قَالَ: كَانَ النَّاسُ يَقُومُونَ فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي رَمَضَانَ بِثَلَاثٍ وَعِشْرِينَ رَكْعَةً"[2]

"یزید بن رومان سے مروی ہے کہ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان میں تئیس رکعات پڑھتے تھے۔"

یہ روایت منقطع ہے۔ یزید بن رومان نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔

❁ امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

"وَيَزِيدُ بْنُ رُومَانَ لَمْ يُدْرِكْ عُمَرَ"[3]

"یزید بن رومان نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔"

❁ علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

"قَالَ الْبَيْهَقِيُّ: وَالثَّلَاثُ هُوَ الْوتر، وَيَزِيد لم يدْرك عمر فَفِيهِ انْقِطَاع"[4]

"امام بیہقی نے کہا: اور تین رکعات وتر ہیں۔ یزید بن رومان نے عمر

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٤/٢٦٠) یہ روایت ضعیف ومنکر ہے اور اس کی تفصیل گزر چکی ہے، اسی کتاب کا صفحہ (۲۲۲) دیکھیں۔

[2] موطأ مالك، ت عبد الباقي (١/١١٥)

[3] نصب الراية للزيلعي (٢/١٥٤) نقله من كتابه معرفة السنن والآثار

[4] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (٥/٢٦٧)

فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے اس میں انقطاع ہے۔‘‘

عینی موصوف نے اسی کتاب میں دوسرے مقام پر اس روایت کو منقطع قرار دیتے ہوئے کہا:

”رَوَاهُ مَالك فِيْ (الْمُوَطَّأ) بِإِسْنَاد مُنْقَطع“[1]

’’اسے مالک نے موطا میں منقطع سند سے روایت کیا ہے۔‘‘

❁ نیموی حنفی اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں:

”يزيد بن رومان لم يدرك عمر بن الخطاب“[2]

’’یزید بن رومان نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔‘‘

2 دوسری روایت از یحییٰ بن سعید۔ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

”حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَمَرَ رَجُلًا يُصَلِّي بِهِمْ عِشْرِينَ رَكْعَةً“[3]

’’یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔‘‘

یہ روایت بھی منقطع ہے۔ یحییٰ بن سعید نے عمر بن الخطاب کو نہیں پایا ہے۔

❁ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۴ھ) فرماتے ہیں:

”لا أعلمه سمع من صحابي غير أنس“[4]

’’میں نہیں جانتا کہ انھوں نے انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو پایا ہے۔‘‘

---

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١٢٧/١١)

[2] آثار السنن (٢٥٣)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١٦٣/٢، رقم: ٧٦٨٢)

[4] تهذيب التهذيب (١٩٥/١١) نقله من كتابه العلل

❁ امام ابن حزم رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"وَعَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ وَلَمْ يُولَدْ إِلَّا بَعْدَ مَوْتِ عُمَرَ بِنَحْوِ خَمْسٍ وَعِشْرِينَ سَنَةً"[1]

''یحییٰ بن سعید سے مروی ہے اور یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے پچیس سال بعد پیدا ہوئے۔''

❁ نیموی حنفی اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں:

"يحيىٰ بن سعيد الأنصاري لم يدرك عمر"[2]

''یحییٰ بن سعید نے عمر فاروق کا زمانہ نہیں پایا۔''

3 تیسری روایت از محمد بن کعب القرظی۔ امام مروزی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۴ھ) فرماتے ہیں:

"وقال محمد بن كعب القرظي: كان الناس يصلون في زمان عمر بن الخطاب رضي الله عنه في رمضان عشرين ركعة يطيلون فيها القراءة ويوترون بثلاث"[3]

''محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں: لوگ عمر بن الخطاب کے زمانے میں رمضان میں بیس رکعات پڑھتے تھے، اس میں قراءت لمبی کرتے تھے اور تین رکعات وتر پڑھتے تھے۔''

یہ روایت بھی منقطع ہے۔ محمد بن کعب القرظی نے بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ محمد بن کعب القرظی کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی اور انھوں نے اسّی سال کی عمر

---

[1] المحلیٰ لابن حزم (۲۰۷/۹)

[2] آثار السنن (۲۵۳)

[3] قیام رمضان لمحمد بن نصر المروزي (ص: ۲۱)

پائی۔[1] اس حساب سے موصوف کی تاریخ پیدائش ۴۰ھ ہے اور اس سے قبل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت ۲۳ھ ہی میں ہو چکی تھی۔

تنبیہ بلیغ: مذکورہ روایات جو منقطع ہیں، ان روایات کو پیش کرتے ہوئے احناف ایک چالاکی کرتے ہیں جسے کم لوگ بھانپ پاتے ہیں، وہ یہ کہ احناف ان منقطع روایات کو ''منقطع'' کے بجائے ''مرسل'' کہہ کر پیش کرتے ہیں اور پھر مرسل حدیث کے بارے میں اہلِ علم میں جو اختلاف ہے وہ یہاں نقل کر دینا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس مرسل حدیث کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے وہ اصطلاحی مرسل ہے جس سے مراد ایسی روایت ہے جسے کسی تابعی نے ڈائریکٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہو اور تابعی تک سند صحیح ہو۔

لیکن یہاں جو روایات ہیں وہ اس معنی میں مرسل ہرگز نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں ہے، لہٰذا یہ روایات منقطع ہیں اور منقطع روایات پر ارسال کا اطلاق لغوی معنی میں ہوتا ہے، لیکن اصطلاحی معنی میں نہیں، لہٰذا ان منقطع روایات کو اصطلاحی معنی میں ''مرسل'' باور کرا کر پھر اصطلاحی ''مرسل'' کی یہاں بحث چھیڑنا مغالطہ آمیز چالاکی ہے، لہٰذا قارئین اس سے ہوشیار رہیں۔

2 علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اثر

یہ اثر دو سندوں سے مروی ہے:

پہلا طریق از ابوعبدالرحمان السلمی:

امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

[1] تهذيب الكمال للمزي (٣٤٧/٢٦)

”أخبرنا أبو الحسن بن الفضل القطان ببغداد أنبأ محمد بن أحمد بن عيسى بن عبدك الرازي ثنا أبو عامر عمرو بن تميم، ثنا أحمد بن عبد الله بن يونس، ثنا حماد بن شعيب عن عطاء بن السائب عن أبي عبد الرحمن السلمي عن علي رضی اللہ عنہ قال :دعا القراء في رمضان فأمر منهم رجلا يصلي بالناس عشرين ركعة. قال: وكان علي رضی اللہ عنہ يوتر بهم“[1]

”علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلوایا اور ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے اور علی رضی اللہ عنہ انھیں وتر پڑھاتے تھے۔“

یہ روایت سخت ضعیف ہے، اس میں درج ذیل علتیں ہیں:

پہلی علت:

عطاء بن السائب اخیر میں مختلط ہو گئے تھے اور ان سے یہ روایت اختلاط کے بعد نقل کی گئی ہے، کیوں کہ اختلاط سے قبل جن رواۃ نے ان سے روایت کی ہے ان کی فہرست میں حماد بن شعیب کا نام نہیں جیسا کہ اہلِ فن نے صراحت کی ہے۔

❀ **امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۲۱ھ) فرماتے ہیں:**

”وَإِنَّمَا حَدِيثُهُ الَّذِي كَانَ مِنْهُ قَبْلَ تَغَيُّرِهِ يُؤْخَذُ مِنْ أَرْبَعَةٍ لَا مِمَّنْ سِوَاهُمْ، وَهُمْ شُعْبَةُ، وَالثَّوْرِيُّ وَحَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، وَحَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ“[1]

”عطاء بن السائب کی روایات جو ان کے اختلاط سے قبل کی ہیں وہ

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (۲/۴۹۶)

[2] شرح مشكل الآثار (۲۹۳/٦)

صرف اور صرف چار لوگوں سے مروی ہیں اور وہ یہ ہیں: شعبہ، ثوری، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید۔‘‘

❀ علامہ زیلعی حنفی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷٦۲ھ) فرماتے ہیں:

’’جَمِیعُ مَنْ رَوَی عَنْهُ رَوَی عَنْهُ فِي الِاخْتِلَاطِ، إلَّا شُعْبَةَ، وَسُفْيَانَ‘‘[1]

’’ان سے تمام لوگوں نے اختلاط کے بعد روایت کیا ہے سوائے شعبہ اور سفیان ثوری کے۔‘‘

❀ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

’’من مشاهير الرواة الثقات إلا أنه اختلط فضعفوه بسبب ذلك، وتحصل لي من مجموع كلام الأئمة أن رواية شعبة وسفيان الثوري و زهير بن معاوية و زائدة وأيوب وحماد بن زيد عنه قبل الاختلاط، وأن جميع من روى عنه غير هؤلاء فحديثه ضعيف لأنه بعد اختلاطه‘‘[2]

’’یہ مشہور ثقہ رواۃ میں سے ہیں، لیکن یہ مختلط ہو گئے تھے، اس لیے محدثین نے اس کی وجہ سے انھیں ضعیف قرار دیا اور میرے نزدیک تمام ائمہ کے اقوال کا ماحصل یہ ہے کہ شعبہ، سفیان ثوری، زہیر بن معاویہ، زائدہ، ایوب اور حماد بن زید کی ان سے روایت اختلاط سے پہلے کی ہے اور ان لوگوں کے علاوہ جنھوں نے بھی ان سے روایت کیا ہے، انھوں نے اختلاط کے بعد ان سے روایت کیا ہے۔‘‘

---

[1] نصب الراية للزيلعي (٥٨/٣)

[2] مقدمة فتح الباري (ص: ٤٢٤)

دوسری علت:

اس کی سند میں موجود ''حماد بن شعیب'' پر محدثین نے سخت جرح کی ہے، مثلاً:

❁ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

" فيه نظر"[1] ''اس میں نظر ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ کا فیہ نظر کہنا سخت جرح ہے۔

❁ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۴ھ)

"واهي الحديث، حدث عن أبي الزبير وغيره بمناكير"[2]

''یہ سخت کمزور حدیث والا ہے، اس نے ابو الزبیر وغیرہ سے منکر روایات بیان کی ہیں۔''

اس کے علاوہ اور بھی محدثین نے حماد بن شعیب پر جرح کی ہے۔

❁ نیز نیموی حنفی فرماتے ہیں:

"قلت: حماد بن شعيب ضعيف"[3]

''میں کہتا ہوں: حماد بن شعیب ضعیف ہے۔''

دوسرا طریق از ابو الحسناء:

امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

"أنبأ أبو عبد الله بن فنجويه الدينوري ثنا أحمد بن محمد ابن إسحاق بن عيسى السني أنبأ أحمد بن عبد الله البزاز،

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (٣/ ٢٥)

[2] الضعفاء لأبي زرعة الرازي (٤٣٦/٢)

[3] آثار السنن (٧٨٥)

ثنا سعدان بن يزيد ثنا الحكم بن مروان السلمي، أنبأ أبو الحسن بن علي بن صالح عن أبي سعد البقال عن أبي الحسناء: أن على بن أبي طالب أمر رجلا أن يصلي بالناس خمس ترويحات عشرين ركعة، وفي هذا الإسناد ضعف، والله أعلم"[1]

"ابو الحسناء کہتے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحہ، یعنی بیس رکعات پڑھائے اور اس سند میں ضعف ہے۔"

یہ روایت بھی ضعیف ہے، کیوں کہ ابو الحسناء مجہول ہے۔

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"أبو الحسناء بزيادة ألف، قيل: اسمه الحسن، وقيل: الحسين، مجهول"[2]

"ابو الحسناء اس کا نام حسن اور حسین بھی بتایا جاتا ہے، یہ مجہول ہے۔"

مزید یہ کہ علی رضی اللہ عنہ سے اس کی ملاقات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔

❁ نیز نیموی حنفی اس روایت کے ضعیف ہونے کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قلت: ومدار هذا الأثر على أبي الحسناء وهو لايعرف"[3]

"میں کہتا ہوں: اس اثر کا دار و مدار "ابو الحسناء" پر ہے اور یہ غیر معروف ہے۔"

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"روى عن الحكم بن عتيبة عن حنش عن علي في

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي (٢/٤٩٧)

[2] تقريب التهذيب (٨٠٥٣)

[3] آثار السنن، ت ذوالفقار (ص: ٢٩٣)

الأضحية"[1]

یعنی اس نے دوسرے مقام پر دو واسطوں سے علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے اور زیرِ نظر روایت میں اس نے سماع کی صراحت نہیں کی، لہٰذا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس صراحت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سے اس کی ملاقات نہیں ہے۔

تنبیہ: امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ حَسَنِ بْنِ صَالِحٍ، عَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ، عَنِ ابْنِ أَبِي الْحَسْنَاءِ، أَنَّ عَلِيًّا أَمَرَ رَجُلًا يُصَلِّي بِهِمْ فِي رَمَضَانَ عِشْرِينَ رَكْعَةً"[2]

اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے تو "ابن ابی الحسناء" بھی نامعلوم ہے، لیکن راجح یہی لگتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے اور یہاں بھی "ابو الحسناء" ہی ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ کے کئی محققین نے یہاں "ابو الحسناء" ہی ضبط کیا ہے۔ مثلاً دیکھیں:

مصنف ابن أبي شيبة، ت أسامة (رقم: ٧٧٦٤)

بلکہ احناف کے پسندیدہ محقق عوامہ صاحب نے بھی "ابو الحسناء" ہی ضبط کیا ہے، دیکھیں: مصنف بن أبي شيبة، ت عوامة (رقم: ٧٧٦٣)

تنبیہ بلیغ: بعض لوگ علی رضی اللہ عنہ ہی کی طرف منسوب بیس رکعات والی ایک روایت شیعوں کی کتاب "مسند الامام زید بن علی" (ص: ۱۵۸) سے نقل کرتے ہیں۔

عرض ہے کہ اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ شیعوں کی کتاب ہے اہلِ سنت کی نہیں، مزید یہ کہ اس کتاب کا مرکزی راوی ابو خالد عمرو

---

[1] تهذيب التهذيب (٧٩/١٢)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٦٣/٢)

بن خالد الواسطی کذاب ہے۔[1]

3 عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر

امام مروزی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۴ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنَا يحيى بن يحيى، أخبرنَا حَفُص بن غياث عَن الأَعُمَش عَن زيد بن وهب، قَال: كَانَ عبد الله بن مَسُعُود يُصَلِّيُ لنا فِيُ شهر رَمَضَان فَيَنُصَرِف وَعَلَيُهِ لَيُلٌ، قَالَ الأَعُمَش: كَانَ يُصَلِّيُ عِشُرِيُنَ رَكُعَةً وَيُوُتِرُ بِثَلَاثٍ"[2]

''اعمش کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے اور تین رکعات سے وتر بناتے تھے۔''

یہ روایت منقطع، یعنی ضعیف ہے۔ سلیمان بن مہران الاعمش نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، بلکہ موصوف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی ہے۔

❁ امام ابونعیم رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں:

"تُوُفِّيَ سَنَةَ اثُنَتَيُنِ وَثَلَاثِينَ بِالُمَدِينَةِ "[3]

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مدینہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔''

جبکہ سلیمان بن مہران الاعمش کی تاریخ پیدایش ۶۰ھ ہے۔

❁ خطیب بغدادی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: "أنوار البدر في وضع اليدين على الصدر" (ص: ٦١٤۔٦١٩)

[2] قيام الليل للمروزي بحوالة عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١٢٧/١١)

[3] معرفة الصحابة لأبي نعيم (١٧٦٧/٤)

"أخبرني ابن الفضل، قال:أخبرنا دعلج بن أحمد، قال: أخبرنا أحمد بن علي الأبار، قال:حدثنا أبو عمار، قال: يعني: الحسين بن حريث، قال: سمعت أبا نعيم، يقول مات الأعمش وهو ابن ثمان وثمانين سنة وولد سنة ستين"[1]

''امام ابونعیم نے کہا کہ اعمش سن ساٹھ میں پیدا ہوئے۔''

یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات کے تقریباً ۳۰ سال بعد امام اعمش رحمہ اللہ پیدا ہوئے۔معلوم ہوا یہ روایت منقطع ہے۔

4 ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا اثر

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ حَسَنٍ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ رُفَيْعٍ قَالَ: كَانَ أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ يُصَلِّي بِالنَّاسِ فِي رَمَضَانَ بِالْمَدِينَةِ عِشْرِينَ رَكْعَةً، وَيُوتِرُ بِثَلَاثٍ"[2]

''عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ مدینہ میں ابی بن کعب لوگوں کو رمضان میں بیس رکعات پڑھاتے تھے اور تین رکعات پڑھاتے تھے۔''

یہ روایت منقطع ہے۔عبدالعزیز نے ابی بن کعب کو نہیں پایا۔عبدالعزیز بن رفیع کی وفات ۱۳۰ھ میں ہوئی ہے (تہذیب)۔ یا ۱۳۰ھ کے بعد ہوئی ہے۔

❁ امام ابن حبان رحمہ اللہ (المتوفی:۳۵۴ھ) فرماتے ہیں:

"مات بعد الثلاثين ومائة"[3]

---

1. تاريخ بغداد للخطيب البغدادي (١٠/٥) وإسناده صحيح
2. مصنف ابن أبي شيبة (١٦٣/٢)
3. الثقات لابن حبان (١٢٣/٥)

''ان کی وفات ۱۳۰ھ کے بعد ہوئی ہے۔''

اور موصوف نے ۹۰ سال سے زائد کی عمر پائی ہے۔

❁ امام بخاری رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۵٦ھ) فرماتے ہیں:

"قال مُحَمد بن حُميد، عن جَرِير: أتى عليه نيف وتسعون سَنَة" [1]

''جریر نے کہا: انھوں نے ۹۰ سال سے بھی زائد کی عمر پائی ہے۔''

اس حساب سے موصوف کی پیدایش ۳۰ھ کے بعد ہوئی ہے اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی وفات عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی، جب کہ بعض کہتے ہیں عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی اور یہی راجح ہے۔

❁ امام ابو نعیم رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں:

"اخْتُلِفَ فِيْ وَفَاتِهِ، فَقِيْلَ: سَنَةَ ثِنْتَيْنِ وَعِشْرِيْنَ فِيْ خِلَافَةِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ، وَقِيْلَ: سَنَةَ ثَلَاثِيْنَ فِيْ خِلَافَةِ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ، وَهُوَ الصَّحِيْحُ لِأَنَّ زِرَّ بْنَ حُبَيْشٍ لَقِيَهُ فِيْ خِلَافَةِ عُثْمَانَ" [2]

''ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۳۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور یہی صحیح ہے، کیوں کہ زر بن حبیش نے عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان سے ملاقات کی ہے۔''

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (٦/١١)

[2] معرفة الصحابة لأبي نعيم (١/٢١٤)

❁ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"صحح أبو نعيم أنه مات في خلافة عثمان بخبر ذكره عن زر بن حبيش أنه لقيه في خلافة عثمان"[1]

''ابو نعیم نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی وفات عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی ہے۔ اپنی ذکر کردہ اس دلیل کی بنیاد پر کہ زر بن حبیش نے عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان سے ملاقات کی ہے۔''

معلوم ہوا کہ عبدالعزیز بن رفیع نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا دور پایا ہی نہیں۔

❁ مشہور حنفی عالم نیموی کہتے ہیں:

"عبد العزيز بن رفيع لم يدرك أبي بن كعب"[2]

''عبدالعزیز بن رفیع نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔''

لہٰذا یہ روایت منقطع ہے، نیز یہ روایت منقطع ہونے کے ساتھ ساتھ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول صحیح روایت کے خلاف بھی ہے، کیوں کہ متعدد صحیح روایات میں منقول ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے گیارہ رکعات پڑھاتے تھے۔[3]

اسی طرح یہ روایت عہدِ نبوی میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے اس عمل کے بھی خلاف ہے، جس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رضا مندی ظاہر کی تھی۔[4]

معلوم ہوا کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بیس رکعات تراویح ثابت نہیں، بلکہ اس کے برعکس ان سے آٹھ رکعاتِ تراویح کا ثبوت ملتا ہے۔ والحمد للہ

---

[1] تهذيب التهذيب لابن حجر (۱۸۰/۳)

[2] آثار السنن (۳۹۷)

[3] اسی کتاب کا صفحہ (۱۶۰) دیکھیں۔

[4] اسی کتاب کا صفحہ (۱۵۵) دیکھیں۔

5 عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کا اثر

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۸۱ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا شجاع، ثنا هشيم، أنبأ يونس، قال : شهدت الناس قبل وقعة ابن الأشعث وهم في شهر رمضان، فكان يؤمهم عبد الرحمن بن أبي بكر صاحب رسول الله ﷺ، وسعيد بن أبي الحسن، ومروان العبدي، فكانوا يصلون بهم عشرين ركعة، ولا يقنتون إلا في النصف الثاني، وكانوا يختمون القرآن مرتين، وزاد المروزي: فإذا دخل العشر زادوا واحدة"[1]

"یونس بن عبید العبدی البصری کہتے ہیں کہ میں نے اشعث کے فتنے سے قبل ماہِ رمضان میں لوگوں کو دیکھا، انھیں صحابی رسول عبدالرحمان بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ، سعید بن ابی الحسن اور مروان العبدی امامت کرواتے اور یہ انھیں بیس رکعات پڑھاتے تھے اور آدھے رمضان کے بعد ہی قنوت کرتے تھے اور دو دفعہ قرآن ختم کرتے تھے۔ امام مروزی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آخری عشرہ آتا تھا تو چار رکعات مزید اضافہ کر لیتے۔"

أولاً: ہماری نظر میں یہ روایت ضعیف ہے اور اس کی سند کے ساتھ مذکورہ متن کا الحاق کسی راوی کا وہم ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ عین اسی طریق سے دیگر اوثق لوگوں نے روایت کیا تو اس میں دوسرے متن کا ذکر ہے، چنانچہ سب سے پہلے اس طریق پر غور کریں جو یوں ہے:

---

[1] فضائل رمضان لابن أبي الدنيا (ص: ٥٣) قيام رمضان لمحمد بن نصر المروزي (ص: ٢١)

”حدثنا شجاع، ثنا هشيم، أنبا يونس بن عبيد قال ...“

اور عین اسی طریق سے اس روایت کو امام ابو داؤد جیسے ثقہ وثبت نے روایت کیا تو اس میں اسی طریق سے حسن بصری کی روایت یوں منقول ہے۔

”حَدَّثَنَا شُجَاعُ بْنُ مَخْلَدٍ، حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ، أَخْبَرَنَا يُونُسُ بْنُ عُبَيْدٍ، عَنِ الْحَسَنِ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ جَمَعَ النَّاسَ عَلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، فَكَانَ يُصَلِّي لَهُمْ عِشْرِينَ لَيْلَةً، وَلَا يَقْنُتُ بِهِمْ إِلَّا فِي النِّصْفِ الْبَاقِي، فَإِذَا كَانَتِ الْعَشْرُ الْأَوَاخِرُ تَخَلَّفَ فَصَلَّى فِي بَيْتِهِ، فَكَانُوا يَقُولُونَ: أَبَقَ أُبَيٌّ“[1]

”سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع فرما دیا۔ وہ انھیں بیس رات نماز پڑھاتے تھے اور قنوت نہ کرتے تھے، مگر نصف اخیر میں قنوت کرتے تھے۔ جب آخری عشرہ آ جاتا تو جماعت کرانا چھوڑ دیتے اور اپنے گھر میں پڑھتے تھے تو لوگ کہتے کہ ابی بھاگ گئے۔“

ظنِ غالب یہی ہے کہ اس طریق کے ساتھ ابو داود رحمہ اللہ کی روایت ہی درست ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ عین اسی طریق سے امام ابن ابی الدنیا نے دوسرے مقام پر یوں نقل کیا ہے:

”حدثنا شجاع بن مخلد، قال: ثنا هشيم، قال منصور: أنبا الحسن، قال: كانوا يصلون عشرين ركعة، فإذا كانت العشر الأواخر زاد ترويحة شفعين“[2]

یہ روایت بھی شجاع ہی کے طریق سے ہے، صرف ہشیم کے استاذ کی جگہ

---

[1] سنن أبي داود (١/٤٥٤، رقم: ١٤٢٩)

[2] فضائلِ رمضان (ص:٥٦)

یونس کے بجائے منصور کا ذکر ہے۔غور کریں کہ مذکورہ طریق ہی سے یہ روایت بھی حسن بصری سے منقول ہے، نیز اس روایت کے اخیر میں یہ صراحت ہے:

"فإذا كانت العشر الأواخر زاد ترويحة شفعين" یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جو زیرِ بحث روایت میں بھی منقول ہیں جیسا کہ امام مروزی کے حوالے سے شروع میں ہی درج کیا گیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فی الحقیقت زیرِ بحث روایت حسن بصری والی ہی روایت ہے جس میں کسی راوی کے وہم سے دوسری غیر معلوم السند روایت بھی ضم ہوگئی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مذکورہ سند گرچہ بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس میں مخفی علت یہ ہے کہ اس کے متن میں راوی کے وہم کی وجہ سے دوسری روایت ضم ہوگئی ہے جس کی اصل سند نامعلوم ہے، اور اس روایت کے ساتھ جو سند ہے وہ حسن بصری کی روایت والی سند ہے جو منقطع ہے، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

شجاع بن مخلد کی متابعت کا جائزہ:

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سریج بن یونس نے شجاع بن مخلد کی متابعت کی ہے، جیسا ابن عساکر نے کہا کہ امام ابن عساکر رحمہ اللہ (المتوفی:۵۷۱ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنا أبو غالب بن البنا، أنا أبو محمد الجوهري، أنا أبو عبد الله الحسين بن عمر بن عمران بن حبيش الضراب، نا حامد بن محمد بن شعيب البلخي، نا سريج بن يونس، نا هشيم، أنا يونس بن عبيد قال: شهدت وقعة ابن الأشعث وهم يصلون فى شهر رمضان، وكان عبد الرحمن بن أبي بكرة صاحب رسول الله ﷺ وسعيد بن أبي الحسن وعمران

العبدي فكانوا يصلون بهم عشرين ركعة ولا يقنتون إلا في النصف الثاني وكانوا يختمون القرآن مرتين“[1]

”یونس بن عبید العبدی البصری کہتے ہیں کہ میں نے اشعث کے فتنے سے قبل (ماہِ رمضان میں) لوگوں کو دیکھا، انھیں صحابیِ رسول عبدالرحمان بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ، سعید بن ابی الحسن اور مروان العبدی امامت کرواتے اور یہ انھیں بیس رکعات پڑھاتے تھے اور آدھے رمضان کے بعد ہی قنوت کرتے تھے اور دو دفعہ قرآن ختم کرتے تھے۔ امام مروزی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آخری عشرہ آتا تھا تو چار رکعات مزید اضافہ کر لیتے۔“

عرض ہے کہ یہ متابعت بجائے خود مختلف المتن ہے، اس لیے کہ یہ جس طریق سے منقول ہے عین اسی طریق سے اسی روایت کو ابن الجوزی نے نقل کیا تو یہ متن بیان کر کے حسن بصری کی روایت والا متن بیان کیا، چنانچہ التحقیق لابن الجوزی میں عین اسی طریق کے ساتھ یہ روایت یوں ہے: امام ابن الجوزی رحمہ اللہ (المتوفی: ۵۹۷ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنا به أبو المعمر، أنبأنا محمد بن مرزوق، أنبأنا أبو بكر أحمد بن علي أنبأنا أبو محمد الجوهري: ... و أنبأنا محمد بن عبد الملك عن الجوهري: أنبأنا الحسين بن عمر الضراب، حدثنا حامد بن محمد بن شعيب، حدثنا سريج ابن يونس، حدثنا هشيم، أنبأنا يونس عن الحسن أن عمر ابن الخطاب جمع الناس على أبي بن كعب فكان يصلي

[1] تاريخ مدينة دمشق (١٣/٣٦) رجاله ثقات

بهم عشرين ليلة من الشهر ولا يقنت بهم إلا في النصف الثاني فإذا كان العشر الأواخر تخلف فصلى في بيته“[1]

’’سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع فرما دیا۔ وہ انھیں بیس رات نماز پڑھاتے تھے اور قنوت نہ کرتے تھے، مگر نصف اخیر میں قنوت کرتے تھے اور جب آخری عشرہ آجاتا تو جماعت کرانا چھوڑ دیتے اور اپنے گھر میں پڑھتے تھے۔‘‘

معلوم ہوا کہ اس طریق کے متن میں بھی وہی اختلاف ہے جو شجاع بن مخلد کے طریق میں ہے، یعنی اس طریق سے بھی دونوں روایات نقل کی گئی ہیں۔ ایسی صورت میں مشکل یہ ہے کہ اس متابعت کو شجاع کے بیان کردہ کس متن کا متابع قرار دیں گے؟

ہم تو کہتے ہیں کہ اس متابعت کا بھی مختلف المتن ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ زیرِ بحث روایت کا متن صحیح طور سے ضبط نہیں کیا جا سکا ہے، اور اس میں کسی دوسری روایت کے متن کی بھی آمیزش ہوگئی ہے۔

یاد رہے کہ یہ طریق صرف انھیں روایات میں معروف ہے اور اس سے دیگر روایات منقول نہیں ہیں، لہٰذا تعددِ متن اور تعددِ روایت کی کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ لازمی بات یہی ہے کہ اس طریق سے نقل ہونے والا متن ایک ہی ہے اور ہماری نظر میں راجح بات یہ ہے کہ یہ متن حسن بصری والی روایت ہی کا متن ہے اور وجہ ترجیح وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ شجاع بن مخلد کے طریق سے اصل روایت وہی ہے جو ابو داود میں ہے، یعنی حسن بصری کی روایت ہے اور یہ روایت ضعیف ہے،

---

[1] التحقيق في أحاديث الخلاف لابن الجوزي (٤٥٩/١) رجاله ثقات

نیز اس میں ”عشرين ركعة“ کے بجائے ”عشرين ليلة“ ہے۔

ثانیاً: یاد رہے کہ اگر اس روایت کو ثابت بھی مان لیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عبدالرحمان بن ابی بکر بیس رکعات سنت سمجھ کر پڑھ رہے تھے، کیوں کہ روایت میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے، بلکہ امام مروزی کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ سنت نہیں، بلکہ مطلق نفل ہی کی نیت سے بیس رکعات پڑھتے تھے، چنانچہ امام مروزی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۹۴ھ) فرماتے ہیں:

”يُونُسُ رَحِمَهُ اللّٰهُ: أَدْرَكْتُ مَسْجِدَ الْجَامِعَ قَبْلَ فِتْنَةِ ابْنِ الْأَشْعَثِ يُصَلِّي بِهِمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ وَسَعِيدُ بْنُ أَبِي الْحَسَنِ، وَعِمْرَانُ الْعَبْدِيُّ كَانُوا يُصَلُّونَ خَمْسَ تَرَاوِيحَ، فَإِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ زَادُوا وَاحِدَةً، وَيَقْنُتُونَ فِي النِّصْفِ الْآخِرِ، وَيَخْتِمُونَ الْقُرْآنَ مَرَّتَيْنِ“ [1]

اس روایت میں ہے کہ ”فَإِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ زَادُوا وَاحِدَةً“ یعنی آخری عشرے میں ایک تراویح کا اور اضافہ کر لیتے تھے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ نفل سمجھ کر ہی پڑھتے تھے، لہٰذا اگر اس روایت کو ثابت بھی مان لیا جائے تو اس سے بلا تعیین آٹھ رکعات سے زائد تراویح پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔



[1] قيام رمضان لمحمد بن نصر المروزي (ص: ۲۲۲)

باب 4

بیس رکعات تراویح اور غیر متعلق بحثیں

جن لوگوں کے پاس اصل دلائل نہیں ہوتے وہ غیر متعلق بحثیں چھیڑ کر اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ بیس رکعات تراویح والے جب نبی اکرم ﷺ اور صحابہ سے بیس رکعات ثابت نہیں کر پاتے تو غیر متعلق اور منطقی گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ ذیل میں اس پہلو سے متعلق کچھ وضاحتیں پیشِ خدمت ہیں۔

فصل اول: رکعات تراویح اور آثارِ تابعین

بعض حضرات جب یہ دیکھتے ہیں کہ بیس رکعات سے متعلق مرفوع روایات من گھڑت اور موقوف روایات ضعیف ہیں تو وہ تابعین کے آثار پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ تابعین سے یہ چیز ثابت بھی ہو جائے تو بھی بے سود ہے، کیوں کہ تابعین کا قول وعمل کسی کے یہاں بھی حجت و دلیل کی حیثیت نہیں رکھتا، نیز معلوم ہونا چاہیے کہ رکعاتِ تراویح سے متعلق تابعین سے تین طرح کا عمل ملتا ہے:

1. گیارہ رکعات۔ یہ ان تابعین کا عمل ہے جو عہدِ فاروقی میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعین کردہ امام کے ساتھ تراویح پڑھتے تھے۔[1]
2. بیس رکعات۔ یہ بھی بعض تابعین سے منقول ہے، لیکن ان سے یہ قطعاً ثابت

---

[1] اسی کتاب کا صفحہ (۱۵۵) دیکھیں۔

نہیں کہ انھوں نے اس تعداد کو سنت سمجھ کر اپنایا ہو۔

3 بیس سے زائد رکعات۔ یہ بھی بعض تابعین سے ثابت ہے۔ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا حفص، عن الحسن بن عبيد الله، قال: كان عبد الرحمن بن الأسود يصلي بنا في رمضان أربعين ركعة ويوتر بسبع"[1]

"حسن بن عبیداللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمان بن اسود ہمیں رمضان میں چالیس رکعات پڑھاتے تھے اور سات رکعات وتر پڑھاتے تھے۔"

یاد رہے کہ عبدالرحمٰن بن الاسود کبار تابعین میں سے ہیں۔ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا ابن مهدي، عن داود بن قيس، قال: أدركت الناس بالمدينة في زمن عمر بن عبد العزيز وأبان بن عثمان يصلون ستة وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث"[2]

"داود بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز اور ابان بن عثمان کے زمانے میں لوگوں کو پایا وہ چھتیس رکعات پڑھتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے۔"

ان میں سب سے افضل و مستحب عمل پہلی قسم کا ہے، کیوں کہ یہ عمل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کے موافق ہے۔

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة، ت الشثري (١٥٦/٥)، قم: ٧٨٩٧) وإسناده صحيح.

[2] مصنف ابن أبي شيبة، ت الشثري (١٥٦/٥، رقم: ٧٨٩٩) وإسناده صحيح

فصل دوم: رکعاتِ تراویح اور ائمہ اربعہ

بعض لوگ یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سب بیس رکعات سنت تراویح کے قائل تھے، حالانکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام نے بیس رکعات کو سنت نہیں کہا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

- **امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۵۰ھ)۔** امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے رکعات تراویح کی بابت کوئی بھی ثابت قول موجود نہیں ہے۔ البتہ ان کے شاگرد امام محمد نے گیارہ رکعات تراویح ذکر کر کے اسی کو اپنایا ہے۔[1]

ممکن ہے کہ ان کے استاذ ابوحنیفہ کا بھی یہی قول وعمل رہا ہو، کیوں کہ یہاں انھوں نے اپنے امام سے کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا ہے۔ واللہ أعلم

- **امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۷۹ھ)۔** امام مالک رحمہ اللہ سے صراحتاً ثابت ہے کہ انھوں نے گیارہ رکعات تراویح کو سنت کہا ہے اور اسی کو اپنایا ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔[2]

- **امام شافعی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۰۴ھ)۔** امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"رأيت الناس يقومون بالمدينة تسعا وثلاثين ركعة قال: وأحب إلي عشرون، قال: وكذلك يقومون بمكة، قال: وليس في شيء من هذا ضيق ولا حد ينتهي إليه، لأنه نافلة، فإن أطالوا القيام وأقلوا السجود فحسن، وهو أحب إلي وإن أكثروا الركوع والسجود فحسن"[3]

---

[1] اسی کتاب کا صفحہ (۲۹۲) دیکھیں۔

[2] اسی کتاب کا صفحہ (۲۸۸) دیکھیں۔

[3] مختصر قيام الليل للمروزي (ص: ۲۲۲)

”میں نے مدینہ میں ۳۹ رکعات (تراویح) پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے بیس رکعات پسند ہیں۔ مکہ والے اسی تعداد میں پڑھتے ہیں، اس سلسلے میں کوئی تنگی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی متعین حد ہے، کیوں کہ یہ نفلی نماز ہے، لہٰذا اگر قیام لمبا کر لیں اور رکعتیں کم کر دیں تو یہ اچھا ہے اور مجھے یہی پسند ہے، اور اگر رکعتیں زیادہ کر دیں تو یہ بھی اچھا ہے۔“

ملاحظہ فرمائیں! امام شافعی رحمہ اللہ نے خود بیس کی تعداد کو پسند فرمایا لیکن اس تعداد کو سنتِ رسول قرار نہیں دیا، بلکہ پوری صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ اس میں کوئی تنگی نہیں ہے اور اس کی کوئی متعین حد نہیں ہے، لہٰذا بعض لوگوں کا بیس رکعات کو سنت بتا کر امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف بھی یہی بات منسوب کرنا سراسر غلط ہے۔

واضح رہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بیس کی تعداد کو گیارہ کے مقابلے میں پسندیدہ نہیں قرار دیا، بلکہ اہلِ مدینہ کے عمل انتالیس کے مقابلے میں اسے پسندیدہ قرار دیا ہے اور آگے اصولی بات کہتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر قیام لمبا ہو اور رکعات کم ہوں تو یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے اس اصولی بیان کی روشنی میں انتالیس کے مقابلے میں بیس کی تعداد زیاد پسندیدہ ہوگی، کیوں کہ اس کی رکعات کم ہیں، لیکن اگر امام شافعی رحمہ اللہ کے اس اصول ہی کی روشنی میں بیس اور گیارہ کا تقابل کیا جائے تو گیارہ کی تعداد ہی زیادہ پسندیدہ قرار پائے گی، کیوں کہ بیس کے مقابلے میں اس میں رکعات کی تعداد کم ہے۔

❀ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱)۔ امام احمد رحمہ اللہ نے رکعاتِ تراویح کے سلسلے میں فرمایا:

”قد قيل فيه ألوان، يروى نحو من أربعين، إنما هو تطوع“ [1]

”اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، تقریباً چالیس تک کی بات بیان کی جاتی ہے اور درحقیقت یہ نفل نماز ہے۔“

امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام احمد سے یہ بھی نقل کیا ہے:

”ولم يقض فيه بشيء“ [2] ”اور امام احمد نے خود کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

امام احمد رحمہ اللہ نے سرے سے بیس رکعات کی بات ہی نہیں کی ہے چہ جائیکہ اسے سنت قرار دیں، لہٰذا امام احمد رحمہ اللہ کی طرف بیس رکعات کی سنیت کو منسوب کرنا محض ایک افترا ہے اور کچھ نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ کے یہاں اگر کسی خاص تعداد کو سنت کہا گیا ہے تو وہ صرف گیارہ رکعات ہی کی تعداد ہے اور ائمہ اربعہ میں سے اس کے قائل امام مالک رحمہ اللہ ہیں۔ گیارہ کے علاوہ کسی بھی دوسری تعداد کو ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی سنت نہیں کہا ہے۔

فصل سوم: رکعاتِ تراویح اور اجماعِ امت

بعض لوگوں نے اپنا یہ معمول بنا رکھا ہے کہ اپنی ہر بات کو اجماعی بتاتے پھرتے ہیں، حتی کہ جس مسئلے میں وہ اجماعِ امت کے خلاف شاذ اور منفرد راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں، اس میں بھی نام نہاد اجماع کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ دراصل کتاب وسنت کے دلائل کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی اور آئے دن لوگ ان کے مسلک سے تائب ہو کر کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے جا رہے ہیں۔

---

[1] مسائل أحمد وابن راهويه، ن دار الهجرة (١/١٩٣)

[2] سنن الترمذي، ت شاكر (٣/١٦١)

اس لیے ان حضرات نے ''اجماع'' کے نام پر عوام کو مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ حد ہو گئی کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگوں نے اپنے مسلک کے تحفظ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا اور اس کا نام ہی ''اجماع فاؤنڈیشن'' رکھ دیا۔

رکعاتِ تراویح سے متعلق بھی ان حضرات نے یہی پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ بیس رکعات تراویح کے سنت ہونے پر امت کا اجماع ہے، حالانکہ اجماع تو دور کی بات پوری تاریخِ اسلام میں کسی ایک بھی ثقہ امام نے بیس رکعاتِ تراویح کو سنتِ رسول نہیں کہا ہے، اس کے برعکس متعدد ائمہ بلکہ خود علمائے احناف میں سے بھی ایک اچھی خاصی تعداد نے آٹھ رکعات یعنی مع وتر گیارہ رکعاتِ تراویح ہی کو نبی ﷺ کی سنت تسلیم کیا ہے اور سچائی تو یہ ہے کہ گیارہ رکعاتِ تراویح کی مسنونیت ہی پر اجماع ثابت ہے، جیسا کہ موطا وغیرہ کی صحیح روایت پیش کی جا چکی ہے، ایک بار پھر ملاحظہ ہو:

❁ **امام مالک رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں:**

''عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوسُفَ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، أَنَّهُ قَالَ: أَمَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَتَمِيمًا الدَّارِيَّ أَنْ يَقُومَا لِلنَّاسِ بِإِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً قَالَ: وَقَدْ كَانَ الْقَارِئُ يَقْرَأُ بِالْمِئِينَ، حَتَّى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُولِ الْقِيَامِ، وَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ إِلَّا فِي فُرُوعِ الْفَجْرِ'' [1]

''سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اُبی بن کعب

---

[1] موطأ مالك (١١٥/١) وإسناده صحيح على شرط الشيخين، ومن طريق مالك رواه النسائي في السنن الكبرىٰ (١١٣/٣، رقم: ٤٦٨٧) والطحاوي في شرح معاني الآثار (٢٩٣/١، رقم: ١٧٤١) وأبوبكر النيسابوري في الفوائد (ق ١٣٦/أ) ، والبيهقي في السنن الكبرىٰ (٤٩٦/٢، رقم: ٤٣٩٢) كلهم من طريق مالك به.

اور تمیم داری رضی اللہ عنہ کو گیارہ رکعاتِ تراویح پڑھانے کا حکم دیا، سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ امام سو سو آیتیں ایک رکعت میں پڑھتا تھا، یہاں تک کہ ہم طویل قیام کی وجہ سے لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے اور فجر کے قریب ہی نماز سے فارغ ہوتے تھے۔“

یہ روایت بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح ہے، اس کی سند میں کسی علت کا نام ونشان تک نہیں، اس روایت سے معلوم ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعات تراویح اور تین رکعات وتر ہی کا حکم دیا اور ان کے دور میں آٹھ رکعات تراویح ہی ہوتی تھی۔

اس روایت کے برخلاف کسی ایک بھی روایت میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ عہدِ فاروقی میں یا اس سے قبل یا اس کے بعد کسی ایک بھی صحابی نے آٹھ رکعات سے زائد تراویح پڑھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ تراویح کی آٹھ رکعات ہونے پر تمام صحابہ کا اجماع تھا، اب جب آٹھ رکعات پر صحابہ کا اجماع ہو گیا تو پھر اس کے برخلاف اجماع ممکن ہی نہیں ہے۔

اس اجماع کے بعد بعض اہلِ علم نے بعد کے ادوار میں نفل کے طور پر کچھ اضافی رکعتیں پڑھی ہیں، لیکن کسی نے بھی ان اضافی رکعتوں کو سنتِ رسول کی حیثیت نہیں دی، نیز ان اضافی رکعتوں کی بھی کسی تعداد پر کوئی اتفاق نہیں ہوا، بلکہ اس میں زبردست اختلاف ہے، چنانچہ کسی نے مسنون تعداد گیارہ ہی کو اختیار کیا تو کسی نے ۱۹، ۲۰، ۲۴، ۲۸، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۷ میں سے کسی تعداد کو اختیار کیا ہے۔[1]

❁ امام احمد رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۴۱ھ) نے رکعاتِ تراویح کے سلسلے میں فرمایا:

”قد قيل فيه ألوان، يروى نحو من أربعين، إنما هو

---

[1] فتح الباري (٤/٢٥٣) عمدة القاري (١١/ ١٢٧)

تطوع"[1]

''اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، تقریباً چالیس تک کی بات بیان کی جاتی ہے اور درحقیقت یہ نفل نماز ہے۔''

❁ امام ترمذی رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

"واختلف أهل العلم في قيام رمضان"[2]

''اہلِ علم نے قیامِ رمضان کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔''

❁ امام ابوبکر بن العربی (المتوفی: ۵۴۳ھ) فرماتے ہیں:

"والصحيح أن يصلى إحدى عشرة ركعة صلاة النبي عليه السلام وقيامة، فأما غير ذلك من الأعداد فلا أصل له"[3]

''صحیح یہ ہے کہ گیارہ رکعات پڑھی جائیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے اور قیام کرتے تھے، اس کے علاوہ جو دوسری تعداد ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔''

❁ امام ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی رحمہ اللہ (المتوفی: ۶۵۶ھ) فرماتے ہیں:

"ثم اختلف في المختار من عدد القيام ..... وقال كثير من أهل العلم: إحدى عشرة ركعة، أخذا بحديث عائشة رضي الله عنها المتقدم"[4]

''تراویح کی کتنی رکعات اختیار کی جائیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے،

---

[1] مسائل أحمد وابن راهويه، ن دار الهجرة (١٩٣/١)

[2] سنن الترمذي، ت شاكر (١٦١/٣)

[3] عارضة الأحوذي (١٩/٤)

[4] المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم (٣٩٠/٢)

بہت سے اہلِ علم نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کی بنا پر کہا ہے کہ (تراویح کی) گیارہ رکعات ہیں۔‘‘

❀ علامہ عینی (المتوفی: ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

”وقد اختلف العلماء في العدد المستحب في قيام رمضان على أقوال كثيرة ..... وقيل: إحدى عشرة ركعة، وهو اختيار مالك لنفسه، واختاره أبو بكر العربي“[1]

’’قیامِ رمضان (تراویح) کی مستحب تعدادِ رکعات کے بارے میں علما نے اختلاف کرتے ہوئے بہت ساری باتیں کہی ہیں، (پھر آگے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد بعد کہتے ہیں) اور ایک قول گیارہ رکعات کا ہے، امام مالک نے اپنے لیے اسی کو اختیار کیا ہے اور ابوبکر ابن العربی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔‘‘

❀ امام سیوطی (المتوفی: ۹۱۱) فرماتے ہیں:

”إن العلماء اختلفوا في عددها“[2]

’’علما نے اس (تراویح) کے عدد کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔‘‘

اختلاف کی اس قدر تصریحات کے باوجود اجماع کا دعویٰ خلافِ حقیقت ہے۔ مزید یہ کہ متاخرین میں جن لوگوں نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، انھوں نے عہدِ فاروقی کی طرف منسوب بیس رکعات والی روایت کی بنا پر ایسا کہا ہے اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عہدِ فاروقی میں بیس نہیں، بلکہ گیارہ رکعات پر اتفاق ہوا تھا، لہٰذا انھیں حضرات

---

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١١/١٢٦-١٢٧)

[2] الحاوي للفتاوى، ط دار الكتب العلمية (١/٣٣٦)

کے اصول سے عہدِ فاروقی میں گیارہ رکعات ہی پر اجماع ثابت ہوتا ہے اور بعد میں نفل کی حیثیت سے مزید رکعات پڑھنے کے سلسلے میں اختلاف ہوتا ہے۔

فصل چہارم: رکعاتِ تراویح اور پنج وقتہ نمازوں کی رکعات

بعض لوگوں نے اپنا یہ معمول بنا رکھا ہے کہ اپنی ہر بات کو اجماعی بتاتے پھرتے ہیں، حتی کہ مفتی احمد یار خان نعیمی صاحب نے بیس رکعات کے اثبات کے لیے ایک عجیب وغریب دلیل یہ بھی پیش کی ہے:

''دن رات میں کل بیس رکعات ضروری ہیں، سترہ فرض اور تین وتر، اس لیے تراویح کی رکعات بھی بیس ہونی چاہیے۔''[1]

عرض ہے:

أولاً: مفتی صاحب نے دن رات کی ضروری نماز کی رکعات بیس بتلائی ہے، حالانکہ فرض نماز کی رکعات کل سترہ ہی ہیں اور وتر کی نماز فرض نہیں، بلکہ سنت ہے۔

ثانیاً: تراویح کی نماز فرض نہیں بلکہ سنت ہے، اسی لیے اگر مفتی صاحب کو رکعاتِ تراویح کو ملانا ہی تھا تو سنت نماز سے ملانا تھا اور دن رات میں کم سے کم سنت رکعات کی تعداد گیارہ ہی ہے۔

"عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال : حفظت من النبي صلی اللہ علیہ وسلم عشر ركعات ركعتين قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب في بيته، وركعتين بعد العشاء في بيته، وركعتين قبل صلاة الصبح"[2]

---

[1] ماحاصل از جاء الحق، حصہ اول (ص: ۴۴۰)

[2] صحيح البخاري (۲/۵۸، رقم: ۱۱۸۰)

''ہم سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم سے حماد بن زید نے بیان کیا، ان سے ایوب سختیانی نے بیان کیا، ان سے نافع نے، ان سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعت سنتیں یاد ہیں۔ دو رکعت سنت ظہر سے پہلے، دو رکعت سنت ظہر کے بعد، دو رکعت سنت مغرب کے بعد اپنے گھر میں، دو رکعت سنت عشا کے بعد اپنے گھر میں اور دو رکعت سنت صبح کی نماز سے پہلے۔''[1]

ان دس رکعات کے ساتھ وتر کی کم سے کم تعداد ایک رکعت ہے۔

معلوم ہوا کہ دن رات کی سنت رکعات کی کم سے کم تعداد گیارہ ہی ہے، لہٰذا اس بنا پر مفتی صاحب کی منطق کے مطابق تراویح کی رکعات گیارہ ہی ہونی چاہییے۔

ثالثاً: اگر ہم فرض رکعات کی بھی بات کریں تو ظہر، عصر اور عشا کی جو چار چار رکعات ہیں، مسافر انھیں قصر کر کے دو دو رکعات پڑھتا ہے، اس اعتبار سے مسافر کی دن رات کی فرض نماز گیارہ رکعات ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ غیر مسافر دن رات میں سترہ رکعات پڑھتا ہے، جب کہ مسافر گیارہ رکعات پڑھتا ہے، یعنی دن رات میں کم سے کم جتنی فرض رکعات ہر شخص کو پڑھنی ہوتی ہیں وہ گیارہ رکعات ہیں۔ لہٰذا مفتی صاحب کے اصول کے مطابق فرض رکعات کی سفری تعداد کا بھی یہی تقاضا ہے کہ تراویح کی رکعات گیارہ ہی ہونی چاہییے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۱۵۷ھ) فرماتے ہیں:

''أقول: هذا إشارة إلى أن الله تعالى لم يفرض عليهم إلا مقدارا يتأتى منهم، ففرض عليهم أولا إحدى عشرة

[1] سنن أبي داود، رقم (١٤٢٢) والحديث صحيح، نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم (٣٧٦٥)

ركعة، ثم أكملها بباقى الركعات في الحضر، ثم أمدها بالوتر للمحسنين لعلمه ﷺ أن المستعدين للإحسان يحتاجون إلى مقدار زائد، فجعل الزيادة بقدر الأصل إحدى عشرة ركعة‘‘[1]

’’میں کہتا ہوں کہ یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالی نے لوگوں پر نماز کی وہ مقدار ہی فرض کی ہے جس کو وہ ادا کریں، چنانچہ پہلے ان پر گیارہ رکعتیں فرض ہوئیں، پھر حضر میں مزید باقی رکعتوں کے ساتھ اسے مکمل کر دیا گیا، پھر احسان و نیکی کرنے والوں کو وتر کے ساتھ مدد دی، کیوں کہ حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ نیکی و احسان کی استطاعت رکھنے والے زائد مقدار کے ضرورت مند ہیں، چنانچہ اصل یعنی گیارہ رکعات کے بقدر اضافہ کیا گیا۔‘‘

ملاحظہ فرمائیں کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ رات کی گیارہ رکعات نماز کی توضیح میں یہ فرما رہے ہیں کہ اصل فرض گیارہ رکعات ہی کے بقدر رات کی نماز کی رکعات بھی گیارہ ہیں۔ اب یہ دلیل مفتی صاحب ہی پر الٹ گئی، موصوف فرض نمازوں کی رکعات سے تراویح کی رکعات ثابت کرنے چلے تھے لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرض نماز کی رکعات ہی کے پیشِ نظر رات اور تراویح کی نماز کی تعداد گیارہ بتلا رہے ہیں۔

فصل پنجم: رکعاتِ تراویح اور لفظ تراویح

بعض لوگ لفظ ’’تراویح‘‘ سے رکعاتِ تراویح کی تعداد بیس ثابت کرتے

---

[1] حجة الله البالغة (٢/٢٨) ترجمہ اردو نسخے سے منقول ہے۔

ہوئے کہتے ہیں کہ تراویح یہ "ترویحة" کی جمع ہے اور ترویحہ چار رکعت کے بعد آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ تراویح جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے، لہٰذا اگر صرف گیارہ رکعات تراویح مانی جائے تو اس میں صرف دو ہی ترویحہ کا موقع ہوتا ہے، ایسی صورت میں اس پر جمع کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔

عرض ہے:

أولاً: تراویح کا نام قرآن یا صحیح حدیث میں وارد نہیں ہے، بلکہ یہ بعد میں اہلِ علم کی طرف سے دیا ہوا نام ہے۔ اس لیے اس نام سے رکعاتِ تراویح ثابت کرنا انتہائی غیر معقول بات ہے، بالفرض مان بھی لیں کہ آٹھ رکعات سے یہ نام مناسبت نہیں رکھتا تو غلطی اس نام میں ہو گی نہ کہ ان دلائل میں جن میں آٹھ رکعات اور مع وتر گیارہ رکعات کا ثبوت ہے۔

ثانیاً: جمع کا اطلاق صرف تین پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ عربی زبان میں دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اس کی متعدد مثالیں قرآن و احادیث میں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی آیت ہے:

﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ [التحريم: ٤]

"(اے نبی کی دونوں بیویو!) اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کر لو (تو بہت بہتر ہے) یقیناً تمھارے دل جھک پڑے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالی صرف دو انسانوں کے لیے "قلوب" (دلوں) کا استعمال کیا ہے، جو قلب (دل) کی جمع ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیت ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ

اِخْوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ﴾ [النساء: ١١]

''اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے ایک تہائی حصہ ہے، ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالی نے بیان فرمایا ہے کہ اگر میت کی اولاد نہ ہو، لیکن اس کے ﴿اِخْوَۃٌ﴾ (کئی بھائی) موجود ہوں تو ایسی صورت میں میت کی ماں کو سدس (چھٹا حصہ) ملے گا۔

یہاں ﴿اِخْوَۃٌ﴾ کا لفظ جمع ہے، لیکن چونکہ دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے اگر بے اولاد میت کے صرف دو بھائی ہوں گے تو بھی اس کی ماں کو سدس (چھٹا) حصہ ہی ملے گا، جیسا کہ اہلِ فرائض کے یہاں یہ بات مسلّم ہے۔

لیکن لفظ تراویح والی مذکورہ فلسفہ سنجی بروئے کار لائی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بے اولاد میت کے دو بھائیوں کی موجودگی میں میت کی ماں کو سدس (چھٹا) نہیں، بلکہ ثلث (ایک تہائی) حصہ ملنا چاہیے۔

قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی دو پر جمع کا اطلاق ہوا ہے، مثلاً ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے دو صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

((إني خشيت أن يقذف في قلوبكما شيئا))[1]

''مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمھارے دلوں میں کچھ ڈال نہ دے۔''

یہاں اللہ کے نبی ﷺ نے صرف دو صحابہ کے لیے ''قلوب'' (دلوں) کا استعمال کیا ہے، جو قلب (دل) کی جمع ہے۔ ظاہر ہے دو کے پاس صرف دو ہی دل

[1] صحيح البخاري (٤٩/٤، رقم: ٢٠٣٥)

ہو سکتے ہیں، لہٰذا یہاں جمع کا اطلاق دو پر ہی ہے۔

نیز نماز باجماعت فرض ہے، لیکن اگر کسی موقع پر صرف دو ہی لوگ ہوں تو وہ دونوں جماعت کے ساتھ ہی فرض نماز ادا کریں گے، صرف دو کی وجہ سے کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں کی جماعت نہیں ہوسکتی، کیوں کہ جماعت میں کم سے کم تین افراد ہونے چاہئیں۔ بلکہ صرف دولوگ ہی جماعت بنا لیں گے، کیوں کہ دو پر بھی جماعت کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور چونکہ گیارہ رکعات تراویح میں بھی دو ترویحہ ہوتا ہے، لہٰذا اس دو پر بھی جمع ''تراویح'' کے اطلاق میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

فصل ششم: رکعاتِ تراویح اورحرمین (مکہ و مدینہ)

بعض حضرات حرمین مکہ و مدینہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ وہاں تراویح بیس رکعات ہوتی ہے۔عرض ہے:

أولاً: افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض حضرات رمضان میں حرمین کے ائمہ اور وہاں کے عمل کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ اسے مسلمہ دلیل کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، لیکن یہ حضرات غیر رمضان میں حرمین کے ائمہ کے عمل کو دلیل جاننا تو درکنار انھیں مسلمان بھی ماننا گوارا نہیں کرتے، بلکہ سرعام فتویٰ دیتے ہیں کہ ان کے پیچھے سرے سے نماز ہی جائز نہیں۔

آخر یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ رمضان میں ایک سنت نماز میں ان ائمہ کا عمل دلیل و حجت قرار پائے اور غیر رمضان میں سنت تو درکنار ان کی طرف سے فرض نماز

کی بھی کوئی حیثیت نہ رہے اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا بھی ناجائز ٹھہرے۔

ثانیاً: تمام احناف اپنی کتب میں دلائل کی صرف چار قسمیں بیان کرتے ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔

اب سوال یہ ہے کہ رمضان میں ایک پانچویں دلیل کا اضافہ کیسے ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ جب ان کے یہاں بھی یہ مسلم ہے کہ حرمین کا عمل کوئی دلیل نہیں ہے تو خواہ مخواہ محض رمضان میں اسے دلیل کی حیثیت سے پیش کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

ثالثاً: کتاب وسنت میں کہیں بھی اس بات کی ضمانت نہیں دی گئی ہے کہ حرمین میں جو عمل بھی ہو گا وہ حجت و دلیل قرار پائے گا، بلکہ ایک وقت تھا کہ خود خانہ کعبہ میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، لیکن یہ قطعاً اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ بتوں کی پوجا بھی جائز ہے۔ نیز بعد میں ایک دور گزرا ہے کہ حرم میں چار مصلوں کی بدعت رائج تھی، اسے بھی حرم کی وجہ سے سند نہ مل سکی، بلکہ ایک وقت آیا کہ اس بدعت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ والحمد للہ

رابعاً: حرمین میں ابتدا میں جو عمل تھا وہ گیارہ رکعات ہی کا تھا، اللہ کے نبی ﷺ نے تین دن تراویح پڑھائی جس میں گیارہ رکعات ہی پڑھائیں۔ عہدِ فاروقی میں جب باضابطہ مسجد میں ایک جماعت سے تراویح ادا کی گئی تو اس میں بھی گیارہ رکعات ہی پڑھی جاتی تھیں۔ لیکن بعد میں دوسری اعداد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

خامساً: حرمین میں بعد میں جو گیارہ سے زائد رکعات پڑھی گئیں وہ عام نفل سمجھ کر پڑھی گئیں ان کے بارے میں کسی بھی ثقہ امام نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ یہی تعداد سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔

سادساً: حرمین میں پورے ماہ صرف بیس رکعات ہی نہیں پڑھی جاتیں، بلکہ آخری

عشرے میں مزید دس رکعات کا اضافہ ہوتا ہے، جب کہ احناف اسے دلیل نہیں بناتے۔

سابعاً: حرمین میں اور بہت سے اعمال ہوتے ہیں، لیکن احناف انھیں دلیل نہیں جانتے، بلکہ حرمین کی عین تراویح ہی سے متعلق احناف صرف اس کی رکعات کے لیے حرمین کا حوالہ دیتے ہیں لیکن حرمین کی تراویح میں جو رکعات کے علاوہ دیگر اوصاف ہیں ان کے لیے یہ حضرات حرمین کے عمل کو دلیل نہیں بناتے، مثلاً: حرمین کی تراویح میں رفع الیدین، آمین بالجہر وغیرہ کا عمل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر رکعات، حرمین کی تراویح کا حصہ ہیں تو کیا یہ اوصاف حرمین کی تراویح کا حصہ نہیں ہیں؟

ثامناً: حرمین میں اور بھی بہت سے اعمال ہیں جو احناف کے خلاف ہیں، لیکن احناف کبھی اپنے خلاف حرمین کے ان اعمال کو دلیل نہیں شمار کرتے، ذیل میں حرمین میں ہونے والے بیس اعمال پیشِ خدمت ہیں جنھیں احناف درست نہیں سمجھتے۔ سب سے پہلے ہم ان اعمال کو گناتے ہیں جو حرمین کی تراویح ہی میں انجام دیے جاتے ہیں:

1. یہاں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے بعد بھی رفع الیدین کیا جاتا ہے۔
2. یہاں نماز میں آمین اونچی آواز سے کہی جاتی ہے۔
3. یہاں قنوت میں رفع الیدین نہیں ہوتا ہے۔
4. یہاں شبینہ یعنی ایک رکعت میں ختم قرآن کا عمل نہیں ہوتا۔

یہ وہ اعمال ہیں جو خاص حرمین کی تراویح کے ہیں، اب اگر حرمین کی تراویح

کی تعداد حجت ہے تو حرمین ہی میں تراویح میں ہونے والے یہ اعمال حجت کیوں نہیں؟

مزید یہاں کے اور اعمال بھی دیکھیں:

5 یہاں زبان سے روزے کی نیت نہیں کی جاتی۔

6 یہاں وقت کے حساب سے سحری میں تاخیر اور افطار میں جلدی کی جاتی ہے جیسا کہ حدیث ہے، لیکن احناف اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

7 یہاں نمازیں اوّل وقت میں ادا کی جاتی ہیں، لیکن احناف اس کے خلاف کرتے ہیں۔

8 یہاں نمازِ فجر سے قبل بھی ایک اذان کہی جاتی ہے، احناف کا اس پر عمل نہیں۔

9 یہاں اذان سے قبل و بعد مروجّہ درود نہیں پڑھا جاتا۔

10 یہاں تکبیر، اکہری کہی جاتی ہے، احناف کا عمل اس کے خلاف ہے۔

11 یہاں نمازِ فجر اندھیرے میں ادا کی جاتی ہے، جب کہ احناف اجالے میں فجر پڑھتے ہیں۔

12 یہاں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے، جب کہ احناف اپنی عورتوں کو مسجد آنے سے روکتے ہیں۔

13 یہاں عصر کی نماز کسی چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جائے تو اس وقت ادا کی جاتی ہے۔

14 یہاں نماز کی نیت زبان سے نہیں کی جاتی، جب کہ احناف کے یہاں یہ بدعت پائی جاتی ہے۔

15 یہاں نمازِ مغرب سے قبل دو رکعت سنت پڑھتے ہیں، جب کہ احناف اس کے منکر ہیں۔

16 یہاں فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا نہیں کی جاتی، جب کہ احناف اس پر شدت سے عمل کرتے ہیں۔

17 یہاں نمازِ عید کے خطبے سے پہلے کوئی وعظ ونصیحت نہیں کی جاتی، لیکن احناف اس کے خلاف نمازِ عید سے قبل وعظ ونصیحت کرتے ہیں۔

18 یہاں نمازِ عیدین میں کل بارہ تکبیرات کہی جاتی ہیں، لیکن احناف نمازِ عیدین میں صرف چھے تکبیرات پڑھتے ہیں۔

19 یہاں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، جب کہ احناف اسے غیر درست قرار دیتے ہیں۔

20 یہاں جنازے میں سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے جب کہ احناف اس کے منکر ہیں۔



استدراک

(تہجد اور تراویح میں فرق سے متعلق چند مزید شبہات کا ازالہ)

"سننت لکم قیامه" والی ضعیف حدیث سے استدلال:

امام نسائی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنا محمد بن عبد الله بن المبارك، قال:حدثنا أبو هشام، قال: حدثنا القاسم بن الفضل، قال:حدثنا النضر بن شيبان، قال:قلت لأبى سلمة بن عبد الرحمن: حدثني بشيء سمعته من أبيك، سمعه أبوك من رسول الله ﷺ، ليس بين أبيك وبين رسول الله ﷺ أحد في شهر رمضان. قال: نعم! حدثني أبي، قال: قال رسول الله ﷺ: إن الله تبارك وتعالى فرض صيام رمضان عليكم وسننت لكم قيامه، فمن صامه وقامه إيمانا واحتسابا خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه"[1]

"نضر بن شیبان کہتے ہیں: میں نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے کہا کہ آپ مجھ سے ماہِ رمضان کے متعلق کوئی ایسی بات بیان کریں جو آپ نے

[1] سنن النسائي (١٥٨/٤، رقم: ٢٢١٠)

اپنے والد (عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ) سے سنی ہو اور اسے آپ کے والد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنا ہو، آپ کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچ کوئی اور حائل نہ ہو۔ انھوں نے کہا: اچھا سنو! مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے ہیں اور میں نے تمھارے لیے اس میں قیام کرنے کو سنت قرار دیا ہے، اس (ماہ) میں جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے روزہ رکھے گا اور (عبادت پر) کمربستہ ہوگا تو وہ اپنے گناہوں سے ایسے نکل جائے گا جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو۔“

أولا: یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی سند میں موجود النضر بن شیبان ضعیف ہے۔

- امام ابن معین رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

”ليس حديثه بشيء“[1]

”اس کی حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

- حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

”لين الحديث“[1] ”یہ لین الحدیث ہے۔“

- انھیں صرف ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقہ کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے:

”كان ممن يخطىء“[3]

”یہ غلطی کرنے والوں میں سے تھے۔“

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن حبان کی توثیق کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب

---

(1) الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ت المعلمي (٤٧٦/٨) وإسناده صحيح

(2) تقريب التهذيب لابن حجر ، رقم (٧١٣٦)]

(3) الثقات لابن حبان، ط العثمانية (٥٣٤/٧)

اس کی صرف ایک ہی حدیث ہے اور اس میں بھی اس نے غلطی کی ہے تو اسے ثقات میں شمار کرنا غلط ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"فتضعيف النضر على هذا متعين"[1]

''اس بنا پر نضر کی تضعیف متعین ہے۔''

واضح رہے کہ اس راوی نے صرف یہی ایک حدیث بیان کی ہے اور اس میں بھی غلطی کر دی ہے، اس لیے اس کی توثیق کی ذرہ برابر بھی گنجایش نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ دراصل نضر بن شیبان نے ابوسلمہ کی حدیث کو رد و بدل کر کے بیان کر دیا ہے۔

رمضان کے روزے اور قیام کی فضیلت سے متعلق ابوسلمہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بیان کی ہے جو صحیح بخاری (رقم: ۲۰۱۴) اور صحیح مسلم (رقم: ۷۵۹) وغیرہ میں موجود ہے، اس میں وہ الفاظ نہیں ہیں جو نضر بن شیبان نے بیان کیے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ نضر بن شیبان نے ابوسلمہ کی حدیث کو بیان کرنے میں غلطی کی ہے، اس لیے محدثین نے اس پر جرح کی ہے اور اس کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ (المتوفی: ۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

"ورواه الزهري عن أبي سلمة بن عبد الرحمن، عن أبي هريرة، ولم يذكر فيه: وسننت للمسلمين قيامه. وإنما ذكر فيه فضل صيامه، وحديث الزهري أشبه بالصواب"[2]

''اس حدیث کو امام زہری نے ابوسلمہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

---

[1] تهذيب التهذيب لابن حجر، ط الهند (۴۳۹/۱۰)

[2] العلل للدارقطني، ت محفوظ السلفي (۲۸۳/٤)

ہے اور اس میں ”وسننت للمسلمين قيامه“ (اور میں نے مسلمانوں کے لیے اس کے قیام کو مسنون قرار دیا) کے الفاظ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ روزے کی فضیلت کو بیان کیا ہے اور زہری کی روایت ہی قرین صواب ہے۔“

طاہر گیاوی صاحب کی ایک فحش غلطی :

ائمہ حدیث کے یہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ نضر بن شیبان نے صرف یہی حدیث بیان کی ہے اور ان الفاظ کی روایت میں یہ منفرد ہے، لیکن طاہر گیاوی صاحب نے نا جانے کس عالم میں یہ لکھ دیا کہ ایک اور راوی نے نضر بن شیبان کی متابعت کی ہے۔ طاہر گیاوی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہوئے اور امام ذہبی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بزار نے جو یہ دعوی کیا ہے کہ نضر بن شیبان اس روایت میں متفرد ہے صحیح نہیں ہے:

”قلت: وقع لي حديثه عاليا من رواية القاسم بن الفضل الحداني عنه“[1]

”میں کہتا ہوں کہ نضر بن شیبان والی حدیث، قاسم بن الفضل الحدانی عن النضر سے بھی ایک عالی سند سے ہاتھ لگی ہے۔“

”حاصل یہ ہوا کہ نضر بن شیبان اس روایت میں متفرد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرا راوی بھی اسی روایت کو نقل کرتا ہے جس کی سند عالی ہے۔“

آگے فرماتے ہیں:

[1] ميزان الاعتدال للذهبيم ت البجاوي (٢٥٨/٨)

”اگر ہم نضر بن شیبان کے اندر ضعف تسلیم کر بھی لیں تو بھی تعددِ طرق سے اس کا انجبار ہو جاتا ہے۔“[1]

ملاحظہ فرمائیں! امام ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی جو عالی سند ذکر کی ہے وہ بھی اوپر پہنچ کر نضر بن شیبان سے ہی ملتی ہے، یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ کی سند میں بھی یہ ضعیف راوی موجود ہے، لہٰذا اس سند کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ نضر بن شیبان اس روایت میں متفرد نہیں ہے، بہت ہی عجیب وغریب ہونے کے ساتھ اصولِ حدیث سے ناواقفیت کا بھی غماز ہے۔

ثانیاً: اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیں تو قرآن میں جس نماز تہجد کا ذکر ہے وہ عام کیفیت والی نماز تہجد ہے، جبکہ رمضان میں یہی تہجد الگ کیفیات میں ادا کی جاتی ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور اس کی ترغیب دی ہے، اس لیے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے ۔اس سے صرف دونوں کی کیفیت الگ الگ ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ اصلاً دونوں نمازوں کا الگ الگ ہونا جیسا کہ ماقبل میں وضاحت کی جاچکی ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے غلط استدلال:

امام مسلم رحمہ اللہ (المتوفی: ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں:

”حدثني زهير بن حرب، حدثنا أبو النضر هاشم بن القاسم، حدثنا سليمان، عن ثابت، عن أنس رضی اللہ عنہ قال: كان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، يصلي في رمضان، فجئت فقمت إلى جنبه، وجاء رجل آخر، فقام أيضا حتى كنا رهطا فلما حس النبي صلی اللہ علیہ وسلم أنا خلفه جعل يتجوز في الصلاة، ثم

---

[1] أحسن التنقيح (ص: ۳۸۰)

دخل رحله، فصلى صلاة لا يصليها عندنا، قال: قلنا له حين أصبحنا: أفطنت لنا الليلة؟ قال: فقال: نعم، ذاك الذي حملني على الذي صنعت ....''[1]

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں نماز پڑھتے تھے، سو میں آیا اور آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا اور دوسرا شخص آیا وہ بھی کھڑا ہو گیا، یہاں تک کہ ایک جماعت جمع ہو گئی، پھر جب آپ ﷺ نے ہماری سن گن پائی تو نماز ہلکی پڑھنے لگے، پھر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور ایسی نماز پڑھی (یعنی بہت لمبی) کہ ہمارے ساتھ نہ پڑھتے تھے، پھر ہم نے صبح کو ذکر کیا کہ آپ ﷺ کو کیا خبر ہو گئی تھی رات کو ہماری اقتدا کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اسی سبب سے تو میں نے کیا جو کچھ کیا۔ (یعنی نماز ہلکی کی) ....''

اس حدیث سے یہ مفہوم کشید کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے مسجد میں صحابہ کے ساتھ جو نماز پڑھی تھی وہ تراویح تھی اور خیمہ میں جا کر جو نماز پڑھی تھی وہ تہجد تھی۔

عرض ہے کہ اس حدیث کا سیاق صاف طور سے دلالت کرتا ہے کہ نبی ﷺ مسجد میں جو نماز پڑھ رہے تھے، اسی نماز کا بقیہ حصہ جا کر خیمہ میں پڑھا تھا اور مسجد میں اس کا پڑھنا اس لیے بند کر دیا تھا کیونکہ آپ کے ساتھ صحابہ بھی شریک نماز ہو گئے تھے اور چونکہ آپ ﷺ طویل نماز پڑھنا چاہتے تھے اس لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ صحابہ کے ساتھ نماز کو لمبا کریں، لہٰذا آپ ﷺ نے جب صحابہ کی شمولیت محسوس کی تو نماز مختصر کر دی اور پھر مسجد سے نکل خیمہ میں چلے گئے اور وہاں جا کر طوالت کے ساتھ

---

[1] صحيح مسلم (٧٧٥/٣، رقم: ١١٠٤)

اسی نماز کو مکمل کیا۔

حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ خیمہ میں آپ ﷺ نے ایسی نماز پڑھی جو ہمارے ساتھ نہیں پڑھتے تھے، اس سے مراد نماز کی طوالت ہے، یعنی آپ ﷺ نے خیمہ میں جتنی طویل نماز پڑھی اتنی طویل نماز ہمارے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ علامہ محمد بن علی بن آدم بن موسی الاثیوبی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"والمراد أنه ﷺ صلى في رحله صلاة طويلة لم يصلها معهم"[1]

''اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے خیمہ میں اتنی طویل نماز پڑھی تھی کہ اتنی طویل نماز آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ نہ پڑھتے تھے۔''

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس رات دو الگ الگ نمازیں نہیں پڑھیں، بلکہ ایک ہی نماز تھی جسے صحابہ کے ساتھ مختصر ادا کیا اور پھر اسی نماز کو خیمہ میں جا کر طوالت کے ساتھ ادا کیا۔

نوٹ: اس حدیث میں "رحل" (خیمہ) سے مراد مسجد کی وہ جگہ ہے جو آپ ﷺ کے اعتکاف کے لیے مختص تھی۔[2]

کیا امام بخاری رحمہ اللہ نے تراویح کے بعد تہجد بھی پڑھی؟

امام بیہقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں:

"أخبرنا أبو عبد الله الحافظ، أخبرني محمد بن خالد الصوفي، حدثنا مسبح بن سعيد، قال كان محمد بن

---

[1] البحر المحيط الثجاج في شرح صحيح مسلم بن الحجاج (٦١٧/٢٠)

[2] دیکھیں: البحر المحيط الثجاج (٦١٧/٢٠)

إسماعيل البخاري، إذا كان أول ليلة من شهر رمضان يجتمع إليه أصحابه فيصلي بهم، فيقرأ في كل ركعة عشرين آية، وكذلك إلى أن يختم القرآن، وكذلك يقرأ في السحر ما بين النصف إلى الثلث من القرآن، فيختم عند السحر في كل ثلاث ليال، وكان يختم بالنهار كل يوم ختمة، ويكون ختمه عند الإفطار كل ليلة، ويقول: عند كل ختمة دعوة مستجابة"[1]

"مسبح بن سعید کہتے ہیں کہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کا معمول یہ تھا کہ جب رمضان کی پہلی رات ہوتی تو آپ کے شاگرد آپ کے ساتھ جمع ہوتے، امام بخاری رحمہ اللہ انھیں نماز پڑھاتے اور ہر رکعت میں بیس آیات پڑھتے، یہاں تک کہ قرآن ختم کرتے، اسی طرح سحر کے وقت بھی قرآن کے آدھے اور تہائی حصے کے درمیان پڑھتے، اس طرح ہر تین رات میں سحر کے وقت ایک قرآن ختم کرتے، اور دن میں بھی روزانہ ایک قرآن ختم کرتے۔ یہ ختم افطار کے وقت ہر رات ہوتا اور فرماتے کہ ہر قرآن کے ختم کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔"

اس روایت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ تراویح کے ساتھ سحر کے وقت نمازِ تہجد بھی پڑھتے تھے۔

عرض ہے:

أولا: اس روایت میں سحر کے وقت نمازِ تہجد پڑھنے کی صراحت نہیں، بلکہ صرف قرآن

---

[1] شعب الإيمان (٥٢٤/٣)، مقدمة فتح الباري لابن حجر (ص: ٤٨١)

پڑھنے کی صراحت ہے، نیز اسی روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ دن میں بھی قرآن ختم کرتے تھے تو کیا اس سے یہ مراد ہو گا کہ دن میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ کسی طرح کی نماز پڑھتے تھے اور اسی میں قرآن ختم کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا سحر کے وقت بھی جب صرف قرآن پڑھنے کا ذکر ہے تو بغیر کسی صریح دلیل کے یہاں نماز کے اندر قرآن پڑھنا مراد نہیں لیا جا سکتا۔

ثانیاً: یہ روایت ثابت بھی نہیں ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کرنے والے مسبح بن سعید ہیں۔ بعض سندوں میں یہ نام کاتبوں نے غلط لکھا ہے، لیکن صحیح نام مسبح بن سعید ہی جیسا کہ اکثر کتابوں میں ہے۔[1]

نیز دوسری روایات کی کئی سندوں میں بھی یہی نام ہے۔ یہ ابو جعفر مسبح بن سعید الوراق، البخاری ہیں، ان کے حالات اور ان کی توثیق ہمیں نہیں مل سکی، لہٰذا یہ روایت ثابت نہیں ہے۔



---

[1] دیکھیں: شعب الإیمان (٣/٥٢٤) ، تاریخ دمشق لابن عساکر (٥٢/٧٩)، تغلیق التعلیق لابن حجر (٥/٣٩٩)

عکس: مخطوطہ فوائد ابی بکر النیسابوری (ق ۱۳۵/ب)

ابي حمزة عن البراء [illegible] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما [illegible] على الناس
زمان [illegible] الا [illegible] كل احد [illegible] عمارة حدثنا
[illegible] شعبة عن ابن عون عن محمد عن انس قال نهينا ان نبيع حاضر
لباد حدثنا ابو الازهر [illegible] ثنا [illegible] عن الحكم عن مقسم عن
ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر
حدثنا اسمعيل بن اسحق ثنا علي ثنا سفيان عن اسمعيل بن امية عن رجل قال [illegible]
[illegible] يزيد قال كان ابي بن كعب يؤمنا [illegible] يقرأ بالمائتين وكنا
لا ننصرف او كان لا ينصرف حتى يرى فروع الفجر قال سفيان مرة اخرى
[illegible] رمضان قال علي وهذا احسبه يروى عن محمد بن يوسف الاعرج بن
اخ السائب بن يزيد عن السائب بن يزيد ولا ارى اسمعيل بن امية اخذه الا عنه
[illegible] حدثنا يوسف بن سعيد ثنا حجاج عن ابن جريج حدثني اسمعيل
بن يوسف [illegible] السائب بن يزيد اخبره قال جمع عمر بن الخطاب الناس
[illegible] على ابي بن كعب وتميم الداري فكانا يقومان بمائة في ركعة فما ينصرف
[illegible] فروع الفجر قال فكنا نقوم باحد عشر قلنا او واحد
[illegible] نرى [illegible] قال ابو بكر هذا حديث [illegible] وكان
[illegible] قال [illegible] حدثنا الربيع
[illegible] انه قال ابن [illegible] السائب
[illegible] علي [illegible] محمد بن يوسف عن السائب بن يزيد قال جمع
[illegible] ابن وهب حدثني اسامة بن زيد عن محمد بن يوسف [illegible] تميم الداري كانا يقومان
[illegible] الناس في قيام رمضان على ابي بن كعب [illegible] الناس يعتمدون
[illegible] عشرة ركعة يقرآن في الركعة بالمائتين حتى ان [illegible] بالسقف من طول
على العصي من طول القيام ويتنوط بعضهم بالحبل المربوط [illegible]
القيام قال السائب كنا نخرج اذا فرغنا ونحن ننظر الى فروع الفجر